besturdubooks.wordpress.com
تحریکِ
ختمِ
نبوّت
شورش کاشمیری

(۱۸۹۱ سے ۱۹۷۴ تک)

مطبوعات چٹان — میکلوڈ روڈ لاہور

واحد تقسیم کنندگان: الفیصل ناشران و تاجران کتب

انتساب

شہیدانِ تحریکِ ختمِ نبوتؐ کے نام

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا عبده ورسوله
١٤٠٤

ہندوستان میں برطانوی حکومت

۱۸۵۷ء ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کا سال وفات تھا لیکن یہ سانحہ اچانک نہیں تھا۔ اورنگ زیب نے مارچ ۱۷۰۷ء میں انتقال کیا تو اس کے جانشینوں ہی سے سلطنت کو گھن لگنا شروع ہوگیا۔ فی الجملہ ڈیڑھ سو سال میں کئی حادثوں اور سانحوں نے سلطنت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ اُن کے جانشینوں کا یہ حال تھا کہ ان کی بدولت سلطنت کا مرکزی وجود متزلزل ہوگیا۔ کئی ایک صوبیداروں نے خود مختاری اختیار کی، مرہٹوں اور روہیلوں نے سر اُٹھایا، پٹھان روگرداں ہوگئے، سکھوں نے پنجاب پر قبضہ کیا۔ اِدھر رنجیت سنگھ نے آنکھیں بند کیں اُدھر مارچ ۱۸۴۹ء میں پنجاب انگریزوں کی حکمرانی میں آگیا۔ ہندوستان کے ساحلی علاقے اور ان سے ملحق صوبے کہیں سالہا سال پہلے ہی انگریزوں کے ہاتھ میں تھے۔ بنگال، بہار، اڑیسہ کے علاوہ بنارس کا ایک علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستبرد میں تھا۔ مختصر یہ کہ بہادر شاہ کا مصلوب اقتدار ۱۸۵۷ء میں قلعہ معلی کی چار دیواری کے اندر تھا، یا پھر کسی حد تک مرحوم دہلی ان کے زیر نگیں تھی۔ اگر ۱۸۵۷ء کے وسیع ہنگامے پیدا نہ ہوتے اور قلعہ معلی جو مغلیہ اقتدار کی آخری ہچکی تھا ان ہنگاموں کی علامت نہ ہوتا یا پھر علمار جہاد کا صور نہ پھونکتے، فوج جگہ جگہ باغی نہ ہوتی اور کئی ایک راجواڑے یا نواب علم رستخیز بلند نہ کرتے تو ایک سلطنت جو ختم ہوچکی تھی، اس کے متعلق یہ کہنا مشکل تھا کہ اُس کا زوال ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ فی الجملہ ۱۸۵۷ء اس جاں بلب مریض کی جانکنی کا آخری سال تھا۔

اس سال سلطنت کا عالم نزع ختم ہو گیا۔

اورنگ زیب کا بیٹا معظم شاہ بہادر شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا لیکن اس کی تخت نشینی سلطنت کے زوال کا آغاز تھا۔ اس نے اپنے ہی بھائیوں سے جنگیں کیں اور پانچ سال میں رحلت کر گیا۔ اس کا جانشین جہاندار شاہ آپس کی خونریز لڑائیوں کے بعد تخت پر متمکن ہوا۔ لیکن اس کا ایک ہی کارنامہ تھا کہ اس نے خاندان کے تقریباً تمام شہزادوں کو قتل کرا دیا۔ خود اوّل درجہ کا نالائق اور پرلے درجے کا عیاش تھا۔ اس کو سزا دینے کے لیے بہادر شاہ کا پوتا فرخ سیر اٹھا۔ اس نے جہاندار شاہ کو شکست دی۔ جہاندار شاہ اپنی داشتہ لال کنور کے لباس میں قلعہ معلی سے بھاگ نکلا لیکن بآسانی پکڑا گیا اور قتل کیا گیا۔ فرخ سیر نے پہلے مغل شہزادوں کو اندھا کیا، پھر قتل کیا لیکن سادات بارہہ نے آخر کار اس کی آنکھیں نکلوا دیں اور قتل کروا ڈالا۔ سادات بارہہ نے قلعہ معلی کا اقتدار ہاتھ میں لے کر مغل شہزادوں کو نچانا شروع کیا۔ وہ (سادات بارہہ) بادشاہ گر تھے۔ انہوں نے ایک مدقوق شہزادے رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھایا، لیکن وہ چند ہی ماہ میں فوت ہو گیا۔ ایک دوسرے شہزادے رفیع الدولہ کو جو مشکل پندرہ برس کا تھا اور سات آٹھ بیگمات کا شوہر تھا بادشاہ بنایا۔ وہ اپنی ماں کے پاس روتا رہا کہ میں نہیں بچوں گا۔ وہ غفرلہ ہو گیا، تو سادات نے شہزادہ روشن اختر کو تخت بخشا۔ وہ محمد شاہ رنگیلا تھا۔ اس کے عہد میں سادات بارہہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی دوران نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں حملہ کیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سلطنت کیا تھی ایک عجیب مذاق تھا۔ رنگیلا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس کے باورچی خانہ کا ماہانہ خرچ سو کروڑ تھا۔ وہ ہر روز تین تین سو کسبیاں اپنے سامنے ننگی نچایا کرتا۔ اس کے دور ہی میں مرہٹوں، سکھوں، روہیلوں اور افغانوں کی بغاوتیں اپنے عروج کو پہنچیں۔ وہ لہو و لعب کی معراج پر رہا۔ رنگیلا کے بعد احمد شاہ حکمران ہوا، لیکن اس کے کمانڈر انچیف غازی الدین نے اس کی اور ملکہ کی آنکھیں نکلوا کر دونوں کو اندھا کر دیا۔ اس کی جگہ بہادر شاہ کا پوتا عالمگیر ثانی تخت پر بیٹھا۔ اس نے ڈوموں اور ڈھاریوں کو درباری عہدوں پر فائز کیا۔ ایک کنجڑن پر دل آ گیا، تو اس کو ملکہ بنا کر قلعہ میں ڈال لیا۔ غازی الدین نے اس کو بھی ۱۷۵۹ء میں ذبح کرا دیا۔ اس کا جانشین شاہ عالم کنجڑن کے بطن سے تھا۔ اس نے انگریزوں کی پناہ لی اور بنگال، بہار، اڑیسہ کی دیوانی انہیں ۲۶ لاکھ سالانہ مالگذاری میں عطا کی۔ گویا پناہ لینے کے عوض چھ کروڑ روپے کی دیوانی ۲۶ لاکھ روپے میں بیچ دی۔ اس کے

عہد (سن ۱۷۶۱ء) میں احمد شاہ ابدالی نے حملہ کیا۔ اور پانی پت میں کامیابی کے بعد لوٹ گیا۔ غلام قادر روہیلہ نے اسی کے زمانہ میں شاہی خاندان کی عورتوں کو بُری طرح ذلیل کیا اور انہیں قلعہ کے اندر نچوایا۔ پھر شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا دیں لیکن اس کا بدلہ مرہٹہ سرداروں نے لیا کہ غلام قادر روہیلہ کو بکرے کی طرح ذبح کیا اور اس کا سر کاٹ کر شاہ عالم کے پاس بھیجا۔ اُدھر شاہ عالم کی عیاشی کا یہ حال تھا کہ اندھا ہو کر بھی خواجہ سراؤں کو خوبصورت لڑکیوں کی فراہمی کا حکم دے رکھا تھا۔ شاہ عالم سن ۱۸۰۶ء میں مر گیا۔ اِدھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے تمام اقتدار غصب کر رکھا لیکن اپنی مصلحتوں کے باعث وہ بادشاہ کو لباس رکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ شاہ عالم کا جانشین اکبر شاہ بنایا گیا۔ پھر سن ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوا لیکن بیس سال بعد معزول ہو کر رنگون (برما) جلاوطن کر دیا گیا یہ گویا ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کا حرف آخر تھا ——!

ہندوستان، کالی کٹ (مالابار) میں پہلے پہل ۲۰ مئی سن ۱۴۹۸ء کو واسکوڈی گاما کی زیر رہبری یورپی اقوام میں سے پرتگیزی، ایک عرب ماہر بحریات احمد بن ماجد نجدی کی راہنمائی میں وارد ہوئے۔ پھر دوسری یورپی قوموں نے آنا شروع کیا۔ ولندیزیوں نے فضا کو اپنے لیے غیر مفید پایا، تو جزائر شرق الہند کی طرف چلے گئے۔ ان کے بعد فرانسیسی اور انگریز آئے لیکن ہندوستان کے اقتدار کا پلڑا انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ اور وہ آہستہ آہستہ برعظیم پر حکمران ہو گئے۔ انہوں نے دوستی اور دشمنی کے طویل المیعاد منصوبے باندھ کر ہندوستان کو فتح کر لیا۔

سب سے پہلے بنگال، بہار، اڑیسہ میں قدم جماتے۔ سراج الدولہ ان علاقوں کا اصل ناظم تھا۔ اس سے جھگڑا پیدا کیا، پھر صلح کر لی۔ امیروں اور درباریوں خصوصاً میر جعفر سے ساز باز کر کے راستہ ہموار کیا۔ آخر سراج الدولہ سن ۱۷۵۷ء میں قتل کروا دیا۔ اُس کی لاش کو ہاتھی پر رکھ کر پھرایا اور میرن نے قید کیا۔

سلطان ٹیپو بعمر ۳۰ سال سن ۱۷۸۲ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ اس سے پہلے سن ۱۷۸۰ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف کئی ایک لڑائیوں میں حصہ لے چکا تھا۔ سن ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے سرنگاپٹم کا محاصرہ کیا۔ سلطان ٹیپو اور ان کے جانثاروں کی عدیم المثال شجاعت کے سامنے غنیم کے چھکے چھوٹ گئے۔ لیکن غداروں نے قلعہ کی فصیل میں شگاف کر دیا اور وہ دادِ شجاعت دیتا ہوا شہید ہو گیا۔ ویلزلی نے شکر کا سانس لیا —— شہادت کی دو تاریخیں کہی گئی ہیں۔ اوّل "شمشیر گم شد" دوم "ذھب عن الروم"

والہند مظلمۃ۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک سلطان ٹیپو کی شہادت ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت کا حرفِ آخر اور اُن کے
زوال کا وسط تھا۔ ہیسٹنگز، کلایو کا جانشین تھا۔ اس کے ہاتھوں ۱۷۷۴ء میں روہیلوں کی خوفناک تباہی
ہوئی اور دہ لاکھ انسان بے گھر ہوئے۔ ۱۷۷۹ء میں نانا فرنویس، حیدر علی، نظام دکن اور مرہٹہ ریاستوں
میں اتحاد ہو گیا۔ حیدر علی نے مدراس پر چڑھائی کی اور انگریزوں کو شکست دی۔ نانا فرنویس نے بمبئی پر حملہ
کیا اور جنرل گوڈارڈ کو بھگا دیا۔ اس سے گھبرا کر وارن ہیسٹنگز نے اس اتحاد کو رشوت و ترغیب کی چالوں
سے پارہ پارہ کیا۔ آخر ۱۸۰۲ء میں انگریز تاجر ہندوستان کی سب سے بڑی حکمران طاقت بن گئے۔ میسور ختم ہو گیا،
مرہٹے معدوم ہو گئے، حیدرآباد مفلوج ہو گیا اور اودھ کا نصف علاقہ اُن کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۸۳۲ء میں
ولیم بینٹنگ نے تاج محل کو گرا کر سنگِ مرمر فروخت کرنا چاہا لیکن قلعہ آگرہ کی نیلامی تسلی بخش نہ ہوئی تو باز آ گیا۔
میانی سے سندھ کو مغلوب کیا، ان کی بیگمات کا سونا لوٹا، ہندوستان کے باہر افغانستان پر چڑھائیاں کیں۔
۱۸۴۲ء میں جنرل پالک کابل کے پُررونق بازار کو آگ لگا کر واپس آ گیا۔ سرحد میں حضرت سید احمدؒ
اور شاہ اسمٰعیلؒ کی شہادت (۶ مئی ۱۸۳۱ء) کے بعد اپریل ۱۸۴۹ء میں انگریزوں کی عملداری شروع ہو گئی۔
وہاں معرکہ بالاکوٹ کی فتحیابی کے بعد سکھ حکمران تھے اور یہ سب ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قصرِ
رفیع الشان کے تدریجی انہدام و انحطاط کا نقشہ تھا۔ بالآخر ۱۸۵۷ء میں سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گُل ہو گیا۔
اور انگریز برِعظیم کے فرمانروا ہو گئے۔ بلاشبہ انگریز مستقبل کی ایک رنگا رنگ طاقت تھے۔ انہوں نے
مسلمانوں کو جسمانی طور پر مغلوب کیا۔ پھر مختلف معرکوں اور عیاریوں کے بعد اُن کی حکومت کا نام و نشان
مٹا ڈالا۔ مگر ہر نوع استبداد کے باوجود مسلمانوں کو من حیث القوم دماغی طور پر مغلوب یا مفتوح نہ کر سکے۔

ادھر زمانہ اس حال میں تھا کہ اسلامی شخصیتیں رزمگاہِ شہادت میں قربان ہو رہی تھیں ادھر اس
زمانہ ہی میں نادرۂ روزگار وجود دین کے افق پر طلوع ہو رہے تھے۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان اس
عہدِ انحطاط ہی کا اُجالا تھا۔ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل اس دور ہی میں ولولۂ جہاد پیدا کرتے ہوئے
بنگال سے سرحد تک گئے تھے۔ الغرض مسلمانوں کا دینی اور تہذیبی سرمایہ اس دور ہی میں اپنی رفعت
کو پہنچ رہا تھا، لیکن مسلمانوں میں جسمانی عجز وارد ہو چکا تھا۔ اُن کا ذہنی علو معراج پر تھا۔ تمام یگانہ و
بیگانہ رکاوٹوں کے باوجود مسلمانوں کے ذہن جہاد سے معمور تھے۔ انگریزوں کو ایک سو برس کی لگاتار

میں بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کے لیے جہاد جیاتین (وٹامن) کا درجہ رکھتا ہے اور وہ اس سے سرشار ہیں ان میں علماء نے قسمت اُن کی اساس پر ایک ایسی روح پھونک دی ہے کہ جہاد کا جذبہ ان کے شریانوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ جس طرح بعض نظریے انسانی فطرت میں دخیل ہو کر ان کی فطرت بن جاتے ہیں اور انہیں موت کی آخری ہچکی تک علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح جہاد کو مسلمانوں کے جسد سے خارج کرنا ممکن نہیں۔ وہ بہمہ وجوہ اس کے شیدائی ہیں۔ انگریزوں کی دور اندیشی کے نزدیک مسلمانوں کی فطرت کا یہی حصہ خطرناک تھا۔ وہ کئی واسطوں سے محسوس کرتے تھے کہ اپنے بہیمانہ تشدد سے انہوں نے مسلمانوں کو مضروب کیا ہے اور وہ لاچار ہو کر سپر انداز ہو گئے ہیں لیکن ان میں دو چار فیصد غدار پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ کچھ نئی صدی لاچار بھی بن جائیں گے۔ لیکن قلبی وفادار پیدا کرنا ناممکن ہے۔ اُن کے دل بہر حال باغی ہیں اور اس بغاوت کو حکومت کی معرفت فرو کرنا ممکن نہیں۔

انگریزوں نے سلطنت کی فتحیابی کے بعد مسلمانوں کی ملی وحدت کے حصار میں شگاف پیدا کرنے شروع کیے اپنے ہمنوا علماء کی ایک جماعت اُٹھائی۔ سید احمد شہیدؒ، شاہ اسمٰعیلؒ اور مجاہدین کا زور توڑنے کے لیے انہیں وہابی قرار دیا تاکہ اَن پڑھ مسلمانوں کے ذہنی تنفر سے فائدہ اٹھا سکیں۔ انہی دنوں حجاز میں ترک اپنے مخالفوں کو اس الزام سے مارتے اور کچلتے تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اس سے کما حقہٗ فائدہ اُٹھانا چاہا۔ لیکن جماعتِ مجاہدین کو زیر کرنا یا اس کے ہمہ گیر اثرات کو توڑنا سخت دشوار تھا۔ جہاد ایک ناقابلِ تسخیر جذبہ تھا۔ انگریزوں کو شمال مغربی سرحد سے جو خدشہ تھا، وہ جماعتِ مجاہدین کی بدولت اِن کی سلطنت کے لیے کئی حادثوں کا سبب ہو سکتا تھا اور اب وہ اسی غرض سے جہاد کا قلع قمع چاہتے تھے۔ غرض ان کے سامنے ہندوستان میں برطانوی عملداری کو استحکام دینے کے لیے چار سوال تھے:

۱۔ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی درازیٔ عمر اور سیاسی استحکام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک مسلمانوں میں روحِ جہاد کارفرما ہے۔

۲۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مغائرت و منافرت کیونکر پیدا کی جا سکتی ہے۔ اب تک عقیدوں کی ضد کے باوجود اُن کے ذہنوں میں تصادم نہیں تھا۔ دونوں مذہبی بُعد کے باوجود انگریزوں سے متحد ہو کر لڑے تھے اور تب سوال صرف مسلمانوں کی بادشاہت کا تھا۔

۳۔ اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر رکیک حملوں کا محاذ کھولا جائے۔ اس طرح مسلمان جہاد سے روگرداں ہو کر

مدافعت کے محاذ پر آجائیں گے۔ مجادلہ کی جگہ مناظرہ لے گا۔ جہاد کا خدشہ مٹے گا۔ مسلمانوں کی کایا کلپ ہوگی۔ نتیجۃً برطانوی سلطنت کے استحکام کی راہیں ہموار ہوں گی۔

۴۔ مسلمانوں میں نئے اور پرانے فرقوں کی معرفت متحارب و متصادم عقائد پیدا کئے جائیں جن سے ان کی ملی وحدت پراگندہ ہو جائے اور وہ باہمی نفاق کی مخلوق ہوں۔

انگریز ہر چہار سوالوں کا جواب پیدا کرنے میں کامیاب رہا۔ اس نے بعض مراحل گذر جانے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک اس قدر لاغر کر دیا کہ مسلمان بظاہر مسلمان ہی تھے لیکن ان کی اکثریت دینی معیار کے تذبذب کا شکار ہو کر غلامی پر قانع ہو گئی۔ ہندوؤں نے آزادی کا سفر شروع کیا، تو مسلمان اس سے بدظن تھے جس قوم کے نصب العین کا تسلسل جہاد پر تھا، اس نے انگریزوں کی خاطر خلافتِ عثمانیہ کو فساد فی الارض کا مرتکب قرار دے کر عربوں اور ترکوں کے خلاف جہاد کیا۔

انگریزوں کی پریشانی کا اندازہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" OUR INDIAN MUSSALMANS سے ہو سکتا ہے۔ اس نے واضح طور پر لکھا ہے کہ مسلمانوں میں جہاد کا تصور ان کی سلطنت کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ انگریزوں نے ایک طویل استبداد کے بعد یہ محسوس کیا کہ بہیمانہ تشدد اجتماعی ہو یا انفرادی مسلمانوں سے اس جذبہ کو محو نہیں کر سکتا، تو انھوں نے جہاد کے خلاف مباحث پیدا کر کے علماء سے فتوے حاصل کرنا شروع کیے اور کلام اللہ کی تفسیروں کا مزاج بدلوانا چاہا۔ ڈاکٹر ہنٹر کی محولہ کتاب سے ان علماء و فضلاء کا پتہ چلتا ہے جو اس وقت تنسیخ جہاد کا فتویٰ دے رہے تھے۔ کتاب کے آخر میں کہ معظمہ کے حنفی، شافعی اور مالکی مفتیوں کا فتویٰ درج ہے جو ان سے حاصل کیا گیا اور ہندوستان کے مسلمانوں میں شدومد سے تقسیم کیا گیا۔ استفتاء تھا کہ ہندوستان کے عیسائی حکمران اسلام کے تمام احکام مثلاً صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ وغیرہ میں مداخلت نہیں کرتے تو کیا ہندوستان دارالاسلام ہے کہ نہیں؟

ہر سہ مفتیوں نے ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کا فتویٰ دیا اور لکھا کہ ہندوستان دارالحرب نہیں اور جہاد دارالحرب ہی میں جائز ہے۔ ہنٹر نے اس فتوے کو عیاری قرار دیا۔ اور اس سے بھی جہاد کے معنے پیدا کیے۔ ایک دوسرا استفتاء جو بنگال اور بہار میں کمشنر کے پرسنل اسسٹنٹ سید امیر حسین کی طرف سے تھا اس کا جواب ۱۷ جولائی ۱۸۷۰ء کو شمالی ہند کے تین علماء کی طرف سے تھا۔ ان علماء میں سے سات لکھنؤ،

اور دو رامپوری تھے۔ اُنھوں نے لکھا کہ اس ملک میں جہاد واجب نہیں۔ ایک شرط یہ بھی لگائی ہے کہ جہاد کیا جائے، تو اس میں مسلمانوں کی فتح اور اسلام کی برتری کا قیاس غالب ہو۔ اگر اس قسم کے قیاس کا امکان نہ ہو تو جہاد ناجائز ہے۔ جن علماء کے نزدیک ہندوستان دارالاسلام تھا اور جہاد واجب نہیں تھا، ان کی مخالفت کرتے ہوئے محمڈن سوسائٹی کلکتہ کی جانب سے مولوی کرامت علی نے لکھا کہ اگر کوئی شخص دارالاسلام کے مفروضہ پر انگریز حکمرانوں سے جنگ کرتا ہے، تو مسلمان عوام اپنے حکمرانوں کا ساتھ دینے کے شرعاً پابند ہیں۔
انہی دنوں سرکاری مسلمانوں نے کلکتہ میں ایک جلسہ کیا۔ مولوی کرامت علی جونپوری، شیخ احمد آفندی انصاری، مولوی عبدالحکیم اور خان بہادر، مولوی عبداللطیف نے جہاد کے خلاف تقاریر کیں۔ شیخ آفندی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا کہ آپ مدینہ منورہ کے معزز شہری اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد میں سے ہیں۔ آفندی نے اسی شرف کے تحت انگریزوں کی وفاداری پر زور دیا اور جہاد سے پرہیز کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر ہنٹر نے شیخ احمد آفندی کی مذکورہ تقریر اپنی کتاب کے حاشیہ میں من و عن درج کی اور اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک کے سب سے بڑے مخالف مولانا فضل حق خیرآبادی (۱۸۶۱ء) ایجنٹ دہلی کے محکمہ میں سررشتہ دار اور دوسرے مخالف مولوی فضل رسول بدایونی (۱۸۷۲ء) بدایوں میں کلکٹر کے سررشتہ دار تھے۔ انگریزوں نے ان کے علاوہ اس وقت کے بعض نامور علماء اور کئی ایک جید فضلاء کو سرکاری خدمات کے لیے حاصل کر لیا۔ ان میں مفتی صدرالدین آزردہ (۱۸۶۸ء)، مولوی فضل امام خیرآبادی (۱۸۲۹ء) اور خیرآباد کے علماء کا پورا قبیلہ تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی نامور لوگ تھے۔ انھوں نے منصب افتاء و قضاۃ سے انگریزوں کی منشاء کے مطابق تنسیخ جہاد کے فتوے جاری کیے اور اس طرح انگریزی اقتدار کو بحال و مضبوط کیا۔ انگریزوں نے تحریک مجاہدین کو وہابی کہہ کر اپنے ہمنوا علماء کے ہاتھ میں ایک ہتھیار دے دیا۔ پھر جو شخص انگریزوں کا باغی تھا، اُسے وہابی کہہ کر پٹوایا۔ ان دنوں 'وہابی' اور 'باغی' مترادف الفاظ تھے۔
نوبت بہ ایں جا رسید کہ علماء سوء نے عوام کو بھڑکا کر مسجدوں میں ان کا داخلہ روک دیا۔ سر عبدالرحیم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس ۱۹۲۵ء کے صدارتی خطبہ میں بیان کیا تھا کہ بنگال میں وہابی تحریک کی آڑ لے کر مسلمان زمینداروں کی تمام املاک، جو وسعت میں بنگال کا ایک چوتھائی تھا، انگریزوں نے ضبط کر لی اور اُنہیں افلاس و نامرادی کے حوالے کر دیا اور وہ دربدر ہو گئے۔

مولوی محمد حسین بٹالوی ان علماء میں سے تھے جنہوں نے مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کی پھٹکار کا آغاز کیا اور اس کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ مستقل معنوں میں وہابی تھے اور انہیں وہابی ہونے کی سزا کا اندازہ تھا۔ انہوں نے انگریزوں کی حمایت کو واجب قرار دیا اور اس کے عوض گورنر جنرل سے وہابی جماعت کے لیے اہلحدیث کا نام حاصل کیا۔

مولوی محمد حسین بٹالوی (۱۳۳۸ھ) نے جہاد کی منسوخی پر ایک رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" فارسی میں تصنیف کیا۔ اس کے مختلف زبانوں میں ترجمے کیے گئے۔ پنجاب کے دو گورنروں نے اس پر خوشنودی کا اظہار کیا۔ اس کے انگریزی، عربی اور اردو متن کی ہزارہا کاپیاں ملک سے باہر بھیجی گئیں۔ مولانا مسعود عالم ندوی نے ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک میں لکھا ہے کہ اس کے عوض مولوی صاحب کو جاگیر عطا کی گئی۔ ان کے نزدیک پوری کتاب تحریف و تلبیس کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔

ہندوستان میں دیوبند کا وجود انگریزوں کے لیے سوہانِ روح تھا۔ اس کا توڑ پیدا کیا گیا لیکن وہ توڑ نہیں خلفشار تھا۔ سرسید نے علیگڑھ کی بنا ڈالی، تو مسلمانوں کی نئی پود میں حکومت انگلشیہ سے تعاون کی نیو اٹھائی۔ سرسید صاحب دل انسان تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں کا ٹوٹا ہوا ڈھانچہ اب اسی طرح بن سکتا ہے کہ وہ مغربی تعلیم حاصل کریں۔ انگریزوں کی نگاہوں میں اپنے کسی تصور کے تحت کھٹکیں نہیں اور سیاست سے بالاتر ہو کر تعلیم کے ہو جائیں۔ دیوبند اور علیگڑھ دو مختلف دھارے تھے۔ دیوبند جہاد کا ذہن تھا اور علیگڑھ تعاون کا ذہن تھا لیکن اس کے باوجود آپس میں دست و گریباں نہ تھے۔ انگریز دیوبند کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ اسی لیے بعض شرعی وجوہ اور دینی سلسلے پیدا کیے گئے جنہوں نے تنسیخ جہاد کی مہم کار گزاری کے تحت فروعی مسائل کو حقیقی مسائل بنا دیا۔

بعض چیزیں پیش آمدہ حالات میں ناگزیر تھیں لیکن اپنے مقاصد کی پیوندکاری کے بغیر انگریز کوئی سا اصلاحی قدم نہ اٹھاتا۔ مثلاً فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۴ء) کا قیام اردو ادب کا رخ پھیرنے کی ایک تحریک تھا۔ اس تحریک کے مافی الضمیر میں مسلمانوں کے ذہن کو خلاف استعمار رجحانات سے پلٹا دینا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں اہل قلم کی پوری کھیپ (الا ماشاء اللہ) ادب برائے ادب کی ہو کے رہ گئی۔ انگریز مطمئن ہو گیا، شاعری کا مزاج ہی پلٹ گیا۔ اس میں نعرۂ رستخیز نہیں تھا اور نہ ہونا چاہیے تھا۔ ان لوگوں نے نثر کا مزاج بدلا اور اسی نثر سے مسلمانوں کی نئی پود کا ذہنی احاطہ کر لیا۔ اس کے بانی سرسید احمد تھے۔

نثر کا چھٹا دور جو سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا، اس کے عناصر اربعہ محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ دہلوی، ڈپٹی نذیر احمد اور خواجہ الطاف حسین حالی تھے۔ ان کے نثری کارناموں پر تبصرہ کرنا اس مضمون سے خارج ہے ــــ لیکن ڈپٹی نذیر احمد اور ذکاء اللہ دہلوی برطانوی اقتدار سے نہایت درجہ مخلص تھے۔ محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کو دہلی کالج کے ایک استاد مسٹر ٹیلر کے قتل کی پاداش میں جنرل ہڈسن نے گولی سے اڑا دیا۔ اور یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، لیکن انگریزوں نے اپنے دام تزویر کو جس طرح پھیلا رکھا تھا، اس کے تحت انگریزوں نے بیٹے محمد حسین آزاد کو حاصل کیا اور چار آدمیوں پر مشتمل ایک جاسوسی مشن سنہ ۱۸۶۵ء میں وسطی ایشیا روانہ کیا۔ اس مشن میں پنڈت من پھول، محمد حسین آزاد، منشی فیض بخش پشاوری اور لالہ کرم چند تھے۔ آزاد نے روسی ترکستان کے مختلف علاقوں میں اپنے سیاسی فرائض کی بجا آوری میں سخت سے سخت مصائب برداشت کیے، مختلف روپ دھارے۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں کہ "میں دو مہینے وسطی ایشیا کے دوران سفر ریگستان میں مارا مارا پھرتا رہا۔ بعض اوقات میری جان خطرے میں پڑ گئی۔" لیکن ان خدمات کے صلہ میں ملا کیا۔ تین سو روپیہ کا انعام اور ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔

ڈپٹی نذیر احمد ۶ر دسمبر سنہ ۱۸۳۶ء کو پیدا ہوئے، ۳ر مئی سنہ ۱۹۱۲ء کو فالج کے حملہ سے رحلت کر گئے۔ جس زمانہ میں مسئلہ جہاد انگریزوں کے لیے ایک مستقل خطرہ تھا۔ اس زمانہ میں آپ نے شاہ عبدالقادرؒ کے بعد پہلا ترجمہ کیا۔ تب شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو ۱۰۰ برس گذر چکے تھے۔ آپ کا ترجمہ ۱۹۰۰ء میں طبع ہوا تھا اور ڈپٹی صاحب کا ترجمہ سنہ ۱۸۹۶ء میں ــ انگریز مسئلہ جہاد کی بیخ کنی اپنی وفاداری بشرط استواری کے لیے علماء کی ایک کھیپ سے کام لے رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے اس ترجمہ کے بعد سنہ ۱۹۰۰ء میں الحقوق والفرائض لکھی۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۰۸ء میں الاجتہاد ـــ!

سر ولیم میور سنہ ۱۸۶۸ء میں یو۔ پی کا لیفٹیننٹ گورنر تھا۔ اس بدبخت نے رسول اکرمؐ کے خلاف ہندوستان میں سب سے پہلے تحریری بدزبانی کی نیو رکھی اور ایک کتاب حیاتِ محمدؐ (LIFE OF MUHMMUD) تصنیف کی۔ اس نے لکھا کہ انسانیت کے دو سب سے بڑے دشمن ہیں محمدؐ کی تلوار اور محمدؐ کا قرآن۔ (نعوذ باللہ) اسی بدبخت نے علیگڑھ کی پہلی عمارت ایم۔ اے۔ او سکول کا سنگ بنیاد رکھا ـــ وہ قرآن، محمدؐ سے عناد کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد پر انتہائی مہربان تھا۔ اس نے اپنی گورنری کے زمانہ میں نذیر احمد کو

ان کی بعض تصانیف پر گراں قدر انعامات عطا کیے گئے، تعریفی ریویو لکھے، شمس العلماء کا خطاب دلوایا۔ پھر جب سبکدوش ہو کر انگلستان واپس گیا، تو ادنبرا یونیورسٹی کا چانسلر ہو گیا اور ڈپٹی صاحب کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے انگریزی اقتدار کی اطاعت میں ڈپٹی صاحب کی تفسیر اور حمایت میں بعض دوسری تحریریں تھیں۔ انہوں نے اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم میں اولی الامر کا مصداق انگریزوں کو ٹھہرایا تھا۔

نذیر احمد نے لکھا کہ ـــــ خدا نے حکامِ وقت کی اطاعت فرض کر کے احکامِ شریعت کو ہمارے حق میں خود معطل کر دیا ہے۔ مزید فرمایا کہ احکامِ شریعت کا مقصود قیامِ امن ہے اور یہ مقصد انگریزی قانون سے بھی حاصل ہے۔ فرق صرف تدابیر یعنی طریقِ کار کا ہے۔ "الحقوق والفرائض" حصہ دوم کے صفحہ ۸۰ پر لکھا ہے کہ "ہمارے لیے انگریزی قانون بھی اسلامی شریعت ہے۔" اس کتاب میں جہاد کا باب قائم نہ کرنے پر جو معذرت کی ہے اس میں لکھا ہے کہ :

> "جس طرح احکامِ زکوٰۃ مفلس سے جو مالکِ نصاب نہ ہو اور احکامِ حج نا مستطیع سے متعلق نہیں، اسی طرح احکامِ جہاد مسلمانانِ ہند سے متعلق نہیں . . . ہم نے جہاد کا باب اس لیے قائم نہیں کیا کہ کہیں عوام کالانعام کے لیے زمرد و بستان یا دو ایندن نہ ہو جائے۔"

مشہور فاضل ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے ڈپٹی نذیر احمد سے متعلق یہ کہا ہے کہ ان کا اسلام انگریزوں کے ہاں گروی ہو چکا تھا۔ اور یہ ایک المیہ تھا کہ ایک طرف تو ملک کے طول و عرض میں علماء کے حق پر جہاد کی پاداش میں مقدمہ چلا کر انہیں موت یا کالا پانی کی سزائیں دی جا رہی تھیں، دوسری طرف اہلِ قلم کا ایک نامور گروہ مسلمانوں میں انگریزی حکومت کی وفاداری کی ذہنی آبیاری کر رہا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہب کا اختلاف شروع سے تھا لیکن ان میں وہ تصادم نہیں تھا جو انگریز چاہتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے اس تصادم کی فصل کاشت کرنا شروع کی اور اس میں بہت جلد کامیاب ہو گئے۔ انہیں ملال تھا کہ ہندو مصنفین اپنی کتابوں کا آغاز بسم اللہ سے کرتے اور فارسی و اردو میں رنگے ہوئے ہیں۔ اس چیز کو انہوں نے بہت جلد ختم کیا۔ حتیٰ کہ تعلیم کو یُو۔پی سانچے میں ڈھال کر ہندو مسلم بنا ڈالا۔ پھر وہ اردو جو کبھی مشترکہ تھی مسلمانوں کی ہو گئی۔ یہ ایک طویل رُوداد ہے، لیکن اس کتاب کا حصہ نہیں؛ ورنہ ہم بیان کرتے کہ ہندو مسلم اختلاف کیونکر تصادم بنا اور انگریزی استعمار نے اپنی اس خواہش کو کیونکر پروان چڑھایا۔ جن لوگوں کے پیشِ نگاہ

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈھائی سو سال (۱۶۰۰ء تا ۱۸۵۷ء) کے لیل و نہار ہیں اور اس کے ۵۲ سالہ دورِ حکومت
(۱۸۵۸ء تا ۱۹۱۰ء) کے واقعات ہیں پھر اس کے بعد ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء کی سیاست کے ۹۰ سال
ہیں۔ مزید برآں مسٹر بیک پرنسپل علیگڑھ کالج (۱۸۸۳ء تا ۱۸۹۹ء) ان کے جانشین مسٹر ماریسن ۱۸۹۹ء تا
۱۹۰۵ء اور ان کے جانشین آرچیبالڈ (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۹ء) کے اعمال و افکار کی سرگزشت ہے۔ انہیں
معلوم ہے کہ ہندو مسلم کیونکر متحارب قومیں بن گئیں اور انگریزوں نے کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو دست و
گریبان کر کے رکھ دیا اور یہی ان کی سیاست کا مقصود تھا۔ اگر ہندو اور مسلمان متحد رہتے تو انگریزی حکومت
کے لیے سکون نہ تھا۔ "تفریق ڈالو اور حکمرانی کرو" ان کا اصولِ حکومت تھا اور وہ اس کی آبیاری ہی سے
ہندوستان میں اپنی حکومت کو طول دے کر مستحکم کر سکتے تھے۔ جب ان کے پاؤں اچھی طرح جم گئے تو مسلمانوں
کو مجادلے کی طرف سے پنپنے نہ دینے کے لیے انگلستان سے پادریوں کی ایک کھیپ درآمد کی گئی۔ انہوں نے بیان
القرآن اور اسلام پر رکیک حملوں کا آغاز کیا۔ حضور سرورِ کائنات کی ذات پر کیچڑ اچھالا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ
علماء جو اب تک جہاد کے محاذ پر تھے وہ اس سے ہٹ کر مناظرے کے میدان میں آ گئے اور صورتحال یکسر
تبدیل ہو گئی۔ اب مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ تھا کہ وہ اپنے ذہن کی سچائی کیونکر قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس سے بڑی
خطرناک بات کیا ہو سکتی ہے جیسا کہ اوپر لکھا کہ سر ولیم میور نے یو پی کا گورنر ہو کر حضور سرورِ کائنات کی ذات
مبارک کے خلاف دریدہ دہنی کی۔ اور حیاتِ محمد لکھ کر زہر اگلا۔ سر سید احمد جو انگریزی حکومت کے تعاون میں پیش پیش
تھے انہوں نے بھی اس کتاب کے زہر کو محسوس کیا اور "خطباتِ احمدیہ" کے نام سے جواب لکھا لیکن انگریز
اپنی چال میں کامیاب رہا کہ عامۃ المسلمین کے لیے اصل مسئلہ اب اسلام کا دفاع اور سیرت النبی کی نگہداشت
ہو گیا۔ ایک دوسرا مسئلہ انگریزوں کے سامنے یہ تھا کہ مسلمانوں کی ملی وحدت پارہ پارہ ہو۔ اس کی شکل یہ نکالی کہ بعض
نئے فرقوں کو جنم دیا انہیں پروان چڑھایا یا ان کا اتحاد بنایا ہم ان فرقوں کا نام لکھ کر اپنے اس مضمون کو پیچ کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن ان فرقوں کو پیچھے
تمام علماء کے خلاف بڑھا دیا جو انگریزی حکومت کا شکار ہونے سے انکار کر چکے اور برطانوی اقتدار
کے خلاف تھے ان نوزائیدہ فرقوں نے نہ صرف مسلمانوں کی وحدت توڑ ڈالی بلکہ کفر کا ایک نیا دفتر کھولا۔
وہ تمام لوگ کافر قرار پائے جو استقلال و حریت میں ڈھلے ہوئے آزادی کی جدوجہد میں شریک تھے۔
ان نوساختہ فرقوں کے پیشواؤں نے انگریزی حکومت کی رضاجوئی لازمۂ دین سمجھا اور ہمیشہ اس کی خوشنودی
کو ملحوظ رکھا جن علماء نے اختلاف کیا ان پر سب و شتم کیا۔ بسا اوقات کفر کے فتوے جاری کیے۔ مشائخ کے

خانقاہی سلسلوں کو اس طرح منظم کیا کہ وہ اعتکاف کے ہو گئے۔ ان کے لیے جہاد ساقط ہو گیا۔ وہ اس تصور ہی سے خالی الذہن ہو گئے کہ پرائی حکومت پر کیسے چوٹ ہو سکتی ہے یا سیاست میں حصہ لیا جا سکتا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں پنجاب کے اکثر مشائخ نے برطانوی فوج کے لیے مریدوں کو بھرتی کروایا اور انہیں اس مطلب کے لیے تعویذ دیے کہ ترک فوج کی گولی اُن پر اثر نہیں کرے گی۔ پھر جب انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی، تو ان مشائخ نے سر مائیکل اڈوائر گورنر پنجاب کو سپاسنامہ پیش کیا۔ یہ اُس شخص کو خراج تھا جس نے جلیانوالہ باغ میں عوام کو جنرل ڈائر کی بے روک گولیوں سے بھنوایا تھا۔ الغرض انگریز مسلمانوں کی ملی وحدت کے توڑنے میں کامیاب رہا اور ایک ایسی فضا پیدا کی جس سے نامسلمانوں کے مسلمان ہونے کا سلسلہ ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن مسلمانوں نے مسلمانوں کو کافر بنانا شروع کیا۔ اس خوفناک دراڑ کے باوجود، انگریز اپنی سیاسی ضرورتوں کے تابع مسلمانوں سے مطمئن نہ تھا۔ چونکہ اس کے ذہن میں خلافت عثمانیہ کی بندر بانٹ کا منصوبہ تھا، اسلئے وہ محسوس کرتا تھا کہ برطانوی عملداری کے خلاف جہاد کی رُوح مسلمانوں میں انگڑائی لے کر ہر لحظہ جاگ سکتی ہے

میرزا غلام احمد ___ ایک استعماری ضرورت

اُن تمام تحریکوں کے باوجود جو ہندوستانی مسلمانوں میں برطانوی وفاداری کی فصل اُگا چکیں اور پھل دے رہی تھیں۔ انگریز جہاد کی روح سے بدستور ہراساں تھا۔ اس کے لیے ۱۸۵۷ء کے بعد بنگال میں کوئی خطرہ نہ رہا تھا۔ اس نے ہندو اکثریت کے تمام صوبے اپنی مٹھی میں اس طرح بھینچ رکھے تھے کہ ان میں جہاد خارج از بحث ہو چکا تھا۔ صوبہ جات متحدہ میں مسلمان ایک ثقافتی طاقت رہ گئے تھے۔ ادھر دہلی کا مسلمان ایک تہذیبی طاقت ہو چکا تھا۔ سندھ اور بلوچستان کے مسلمان اپنے اپنے سرداروں کی ملکیت تھے۔ ان سرداروں پر انگریزوں نے کچھ اس طرح قبضہ پا لیا تھا کہ ان سے جہاد کا پیدا ہونا ناممکن ہو چکا تھا لیکن انگریز کے استعماری منصوبوں کی نگاہیں ہندوستان سے ملحق مسلمان ریاستوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد انگریزوں نے جہاد کی پاداش میں پانچ مقدمے ہائے سازش قائم کیے۔ پہلا مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء میں اس میں گیارہ ملزم تھے۔ دوسرا مقدمہ سازش پٹنہ ۱۸۶۵ء میں تیسرا مقدمہ سازش راج محل ۱۸۷۰ء میں چوتھا مقدمہ سازش مالدہ ۱۸۷۰ء میں اور پانچواں مقدمہ سازش ۱۸۷۱ء پٹنہ ہی میں اس کے سات ملزم تھے۔ ان مشہور مقدمات کے علاوہ اور کئی مقدمے قائم کیے گئے۔ ان کے ماخوذین کی استقامت نے انگریزی حکومت کو سخت پریشان کیا۔ کئی ایک ملزم جنہیں موت کی سزا دی گئی۔ ان کی

سزا اس بنا پر عمر قید میں بدل گئی کہ وہ موت کو پیار کرتے تھے اور شہادت کی لگن میں ان کا وزن بڑھ گیا تھا۔ انگریز محسوس کرتا تھا کہ جہاد کا شعلہ کسی وقت بھڑک سکتا ہے۔ گو انگریزوں نے پنجاب کے بل پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ختم کیا اور تجربہ سے معلوم ہو چکا تھا کہ اس صوبہ کا سپاہی اس کے لیے بہت بڑی متاع ہے۔ لیکن برطانوی استعمار کے آئندہ ارادے مسلمان رعایا کو جس سانچہ میں ڈھالنا چاہتے تھے، ان کا خاکہ عجیب و غریب تھا۔ خلافت عثمانیہ، برطانیہ اور روس کے نصرانی اتحادیوں کی نگاہ میں تھی اور وہ اس کی بندر بانٹ کا منصوبہ تیار کر چکے تھے۔ ان کے پیش نظر ترکوں اور عربوں کو ایک دوسرے سے بھڑانا ہی نہیں تھا بلکہ عربوں کو مختلف ریاستوں میں بانٹ دینے کا منصوبہ ان کے ذہن میں تھا۔ اس منصوبہ کے لیے پنجابی سپاہی منتخب کیا گیا۔ پنجاب کی سرحدوں سے ملحق سرحدی صوبوں میں روح جہاد کا ولولہ باقی تھا۔ اس سے آگے افغانستان اور ایران واقع تھے۔ ان سے پیوست اسلامی ریاستوں کا سلسلہ تھا۔ ان مملکتوں کے شانہ پر روس تھا اور وہ اس کو برطانوی عملداری اپنے لیے خطرہ محسوس کرتی تھی۔ انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کرتے ہی قبائلی علاقے کو مطیع و منقاد کرنے کے لیے مربوط کوشش کی۔ پیش منظر سے نتیجہ حتمی تو لارڈ کرزن نے اس پالیسی کو بدل ڈالا۔ قبائلی خوانین کے وظیفے مقرر کیے، افغان ایشیا کی خیر اتھائی اور ۱۹۰۱ء میں سرحد کے موجودہ اضلاع کو پنجاب سے الگ کر کے علیحدہ صوبہ بنا دیا۔ ڈاکٹر ہنٹر نے "مسلمانانِ ہند" میں لکھا ہے کہ "وہ ان علاقوں میں مذہب کے دیوانوں کو سرنگوں کر سکتے اور نہ انہیں گھروں میں واپس لا سکتے ہیں۔ ان میں جہاد کا شعلہ سرد نہیں ہوا۔ ان پر مذہبی دیوانوں اور جہادی ملاؤں کا اثر نہایت قوی ہے اور وہ کسی لحظہ بھی ان کے جذبات کا آتشکدہ بھڑکا سکتے ہیں۔"

انگلستان کی حکومت نے ہندوستان سے برطانوی عمال کی ان یادداشتوں کا جائزہ لینے اور صورتحال کا بلاواسطہ مطالعہ کرنے کے لیے ۱۸۶۹ء کے شروع میں برٹش پارلیمنٹ کے ممبروں، بعض انگلستانی اخبارات کے ایڈیٹروں اور چرچ آف انگلینڈ کے نمائندوں پر مشتمل ایک وفد ہندوستان بھیجا۔ وفد کا مقصد یہ تھا کہ وہ پتہ چلائے کہ ہندوستانی عوام میں وفاداری کیونکر پیدا کی جا سکتی ہے اور مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو سلب کر کے انہیں کس طرح رام کیا جا سکتا ہے۔ اس وفد نے واپس جا کر دو رپورٹیں مرتب کیں۔ جن ارکان نے THE ARRIVAL OF BRITISH EMPIRE IN INDIA "ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی آمد" کے عنوان سے رپورٹ لکھی، انہوں نے لکھا کہ:

"ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اپنے رُوحانی رہنماؤں کی اندھا دُھند پیروی کر رہی ہے۔ اگر اس وقت ہمیں کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اپاسٹالک پرافٹ (حواری نبی) ہونے کا دعویٰ کرے۔ تو اس شخص کی نبوت کو حکومت کی سرپرستی میں پروان چڑھا کر برطانوی مفادات کیلئے مفید کام لیا جا سکتا ہے۔" (تخیلات)

میرزا غلام احمد ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ (پنجاب) کی کچہری میں ایک معمولی تنخواہ پر (۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۸ء) ملازم تھے۔ آپ نے ملازمت کے دوران سیالکوٹ کے پادری مسٹر بٹلر ایم۔ اے سے رابطہ پیدا کیا۔ وہ آپ کے پاس عموماً آتا اور دونوں اندرخانہ بات چیت کرتے۔ بٹلر نے وطن واپس جانے سے پہلے آپ سے تخلیہ میں کئی ایک طویل ملاقاتیں کیں۔ پھر اپنے ہم وطن ڈپٹی کمشنر سے ملا۔ اس سے کچھ کہا اور انگلستان چلا گیا۔ ادھر میرزا صاحب استعفیٰ دیکر قادیان آ گئے۔ اس کے تھوڑا عرصہ بعد مذکورہ وفد ہندوستان پہنچا اور لوٹ کر محولہ رپورٹیں مرتب کیں۔ ان رپورٹوں کے فوراً بعد ہی مرزا صاحب نے اپنا سلسلہ شروع کر دیا۔

برطانوی ہند کے سنٹرل انٹیلی جنس کی روایت کے مطابق ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ نے چار اشخاص کو انٹرویو کے لیے طلب کیا۔ ان میں سے میرزا صاحب نبوت کے لیے نامزد کیے گئے۔

میرزا صاحب کی پہلی تصنیف براہین احمدیہ (صفحات ۵۶۲) چار حصوں میں شائع ہوئی۔ ۱۸۸۰ء میں پہلے دو حصے شائع ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں تیسرا اور ۱۸۸۴ء میں چوتھا۔ آپ کے دوسرے بیٹے میرزا بشیر احمد ایم اے کی تالیف سلسلہ احمدیہ کے مطابق آپ کو ماموریت کا پہلا الہام مارچ ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ اس سے پہلے آپ نے ۱۸۸۰ء میں ملہم من اللہ ہونے کا اعلان کیا اور اپنے مجدد ہونے کا نقارہ پھونکا۔ دسمبر ۱۸۸۸ء میں اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیعت لینے کا حکم فرمایا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں اپنے مسیح موعود ہونے کی خبر دی اور ظلی نبی ہونے کی اصطلاح ایجاد فرمائی۔ پھر ۱۹۰۱ء میں نبوت کا دعویٰ کیا اور نومبر ۱۹۰۴ء میں کرشن ہونے کا اعلان فرمایا۔ یہی وہ سال تھے جب انگریزی سیاست اپنے استعماری عزائم کو پروان چڑھانے کے لیے پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں کا شکار کر رہی تھی۔ اور اس کے سامنے بیرون ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کو اپنے دام میں لانے کا منصوبہ بھی تھا۔ میرزا غلام احمد ان چاروں نکات کے جامع ہو کر سامنے آئے، جو انگریزوں کے ذہن میں تھے۔ انہوں نے انگریزی سلطنت کے استحکام اور اطاعت

کی بنیاد ہی اپنے الہام پر رکھی۔ اور ایک نبی کا روپ دھار کر انگریزی سلطنت کی وفاداری سے انحراف کو جہنم کی سزا کا مستحق قرار دیا۔ اپنی ربانی سند کے مفروضہ پر جہاد کو منسوخ کر ڈالا۔ اور ان لوگوں کو حرامی قرار دیا جو اس کے بعد جہاد کا نام لیتے یا اس کی تلقین کرتے تھے۔

ہندوؤں میں آریہ سماج ایک پروگریسو فرقہ اُبھر رہا تھا، سوامی دیانند اس کے بانی تھے، میرزا صاحب نے اس فرقہ کو ہدف بنا کر ہندو دھرم پر رکیک حملے کیے نتیجۃً آریہ سماج نے رسول اکرمؐ اور قرآن و اسلام کے خلاف دریدہ دہنی کا آغاز کیا۔ اسی طرح میرزا صاحب نے عیسائی مشنریوں کے خلاف بڑھ چڑھ کر حضرت مسیح سے متعلق نازیبا زبان استعمال کر کے محمد عربیؐ (فداہ امی و ابی) کے خلاف مشنریوں کی زبان کھلوائی؛ نتیجۃً پنجاب کے مسلمان جہاد سے روگرداں ہو کر ہندو دھرم اور عیسائی مذہب سے نبرد آزما ہو گئے۔ محاذ کا رُخ پلٹ گیا۔ مرزا صاحب کے دعوئ نبوت سے خود مسلمانوں میں ایک ایسا محاذ کھل گیا کہ علماء کے لیے ختم نبوت کا مسئلہ حفظ ایمان کے لیے ضروری ہو گیا۔ میرزا صاحب نے مسلمانوں کے حصارِ وحدت کو منہدم کرنے کے لیے ایک ایسی کدال اُٹھائی کہ وہ انگریزوں کے خنجر کو بھول کر اس کدال کے پیچھے پڑ گئے۔ گو مسلمانوں کے ہر دائرہ میں انگریزوں کی ہر خواہش پورا کرنے کے لیے مختلف افراد پیدا ہو چکے تھے، لیکن مرزا صاحب اس رعایت سے ان سب کے جامع تھے کہ جہاں انگریز اپنا قلعہ مضبوط رکھنا چاہتا تھا، وہاں مرزا صاحب نے "حواری نبی" ہونے کا دعویٰ کر کے اس ضرورت کا سفر شروع کیا۔ اُدھر علماء کے محاسبہ سے مرزا صاحب کی شہرت کا آغاز ہو گیا۔ اور یہی وہ چاہ رہے تھے؛ ورنہ مرزا صاحب خود حقیقۃ الوحی کے صفحہ ۲۱۱ پر تسلیم کرتے ہیں کہ:

"ہماری معاش کا اور مدار والد کی ایک مختصر آمدنی پر تھا۔ اور بیرونی لوگوں میں ہمیں ایک شخص بھی نہیں جانتا تھا۔ میں ایک گمنام انسان تھا، جو قادیان جیسے ویران گاؤں کے زاویہ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔"

مرزا صاحب نے عیسائیوں اور آریوں سے مناظرے کی آڑ میں مسلمانوں سے چندہ مانگنا شروع کیا، تو تین لاکھ سے زائد روپیہ جمع ہو گیا۔ (حقیقۃ الوحی) اپنے الہامات کو مدار بنا کر انگریزی حکومت کی تائید حمایت میں اس قدر کتابیں لکھیں کہ تریاق القلوب (مصنفہ میرزا غلام احمد) صفحہ ۱۵ کے مطابق وہ تمام کتابیں اکٹھی کی جائیں تو ان سے ۵۰ الماریاں بھر سکتی ہیں۔ انگریز اسلامی ملکوں میں اپنے آئندہ منصوبوں

کے لیے نقب لگا رہا تھا۔ مرزا صاحب کی اطاعت و حمایت کے مذکورہ پندے اس منصوبہ کا راشن تھا۔ ان انسانی کتابوں کے عربی، فارسی اور انگریزی میں تراجم کرائے گئے۔ پھر ان کتابوں اور مرزا صاحب کے سینکڑوں اشتہاروں کو عرب، مصر، شام، کابل اور روم بھیجا گیا۔ (ملاحظہ ہو تریاق القلوب مصنفہ میرزا صاحب) مرزا صاحب نے اس مہم کے سلسلہ میں بہتیری کتابیں، کئی ایک کتابیں اور بے شمار خطوط اور اشتہار شائع کیے۔ ان سب کا لب لباب یہ تھا کہ مسلمان سلطنت برطانیہ کے سچے خیرخواہ ہو جائیں۔ خونی مہدی اور خونی مسیح کی بے اصل روایتوں کو ترک کر دیں اور جہاد کا جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں، ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔" (تریاق القلوب ص۱۵)

مرزا صاحب نے اپنی کتاب شہادت القرآن میں اپنے ایک اشتہار (صفحہ ۳) کو نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

"میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرے۔ دوسرے اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا اور ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سایہ میں پناہ دی ہے اور وہ سلطنت برطانیہ ہے۔"

ایک دوسری کتاب تبلیغ رسالت جلد ہفتم کے صفحہ ۱۰ پر فرماتے ہیں کہ میں اس وقت ساٹھ برس کا ہوں اس عمر تک اسی ایک اہم کام میں مشغول ہوں کہ مسلمانوں کے دلوں کو حکومت انگلشیہ کی سچی محبت خیرخواہی اور ہمدردی کی طرف پھیر دوں اور کم فہموں کے دلوں سے جہاد کا غلط خیال دور کر دوں ــــــ میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کے دلوں پر میری تحریروں کا بہت ہی اثر ہوا۔ اور لاکھوں انسانوں میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔"

تبلیغ رسالت جلد ششم کے صفحہ ۶۵ پر گورنمنٹ کے نام ایک عریضہ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:

"میں نے بیسیوں کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں اس غرض سے لکھی ہیں کہ اس گورنمنٹ محسنہ سے جہاد ہرگز درست نہیں، بلکہ سچے دل سے اطاعت کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ میں نے یہ کتابیں بصرف زر کثیر چھاپ کر بلاد اسلامیہ میں پہنچائیں۔ ان کتابوں کا بہت سا اثر اس ملک پر بھی پڑا ہے۔

اسی عریضہ میں درج ہے کہ "میرے مریدوں کی ایک جماعت تیار ہوتی ہے جو اس گورنمنٹ کے دلی جاں نثار ہیں۔" ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

"میں نے اس مضمون کی ۵۰ ہزار کے قریب کتابیں، رسائل اور اشتہارات چھپوا کر ملک اور دوسرے بلاد اسلام میں بھجوائے ہیں کہ انگریزی حکومت ہم مسلمانوں کی محسن ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی سچی

اطاعت کرے اور دل سے اس کا شکر گزار ہو، دعا گو رہے۔ میں نے یہ کتابیں اسلام کے دو مقدس شہروں مکہ اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ، بلاد شام، مصر اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا، ان کی اشاعت کی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلیظ خیالات چھوڑ دیے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ مجھے اس خدمت پر فخر ہے۔ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی کوئی نظیر کوئی مسلمان نہیں دکھلا سکتا۔ (ستارہ قیصرہ ص ۳)

غرض مرزا صاحب خود ساختہ نبوت کے بل پر جہاد کی تنسیخ اور اطاعت کے لیے لگاتار الہام پر الہام شائع کرتے رہے اور وہ الہامات و نگارشات عربی، فارسی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر برطانوی عملداری کی معرفت ان تمام ممالک میں تقسیم ہوتی رہیں جو اس وقت تک برطانوی اقتدار میں آ چکے اور باقی جس کی استعماری نگاہ میں تھے۔

مینارۃ المسیح کی تعمیر کے لیے فراہمی چندہ کے اشتہار میں مرزا صاحب نے لکھا کہ (بہ تلخیص) اس منارہ کو کسی جھنڈے یا دیوار میں نصب کرایا جائے گا کہ آسمان کے دروازوں کے کھلنے کا وقت آ گیا۔ اب سے زمینی جہاد بند کیے گئے اور لڑائیوں کا خاتمہ ہو گیا۔۔۔ آج سے دین کے لیے لڑنا حرام کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو دین کے لیے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی کہلا کر قتل کرتا ہے وہ خدا اور اس کے رسول کا نافرمان ہے۔

تبلیغ رسالت جلد ہفتم صفحہ ۱۰ پر لکھا ہے کہ:

"جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے، ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح و مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔"

مرزا صاحب نے ایک رسالہ نور الحق تصنیف کیا، اس میں لکھا کہ:

"اس حکومت کے پاس میرا نور ہے اور نصرت و تائید میں میرا مثیل نہیں۔ میرا وجود انگریزی حکومت کے لیے ایک قلعہ و ایک حصار اور تعویذ کی حیثیت رکھتا ہے۔"

مرزا صاحب نے اطاعت برطانیہ اور حرمت جہاد کے سلسلہ میں بلاشبہ ایک ضخیم دفتر مرتب کیا۔ تبلیغ رسالت میں واضح طور پر اقرار کیا کہ:

"میرے پانچ اصول ہیں جن میں دو حرمت جہاد اور اطاعت برطانیہ ہیں۔"

مرزا صاحب کے فرزند مرزا محمود احمد نے تنسیخ جہاد کے موروثی سوال پر کہا: — "بعض احمق سوال کرتے ہیں کہ اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ یہ گورنمنٹ ہماری محسن ہے۔ اس کا شکریہ ادا

کرنا فرض اور واجب ہے محسن کی بدخواہی ایک بدکار اور حرامی کا کام ہے۔"

(الفضل جلد ۲۶ — ۱۳ دسمبر ۱۹۳۹ء)

میرزا غلام احمد نے ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء کو لکھا تھا:

"ہم نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنا خون دینے سے بھی دریغ نہیں کیا" (تبلیغ رسالت جلد ہفتم)

لیکن آپ کے فرزند میرزا محمود احمد (خلیفہ ثانی) نے فرمایا کہ:

"مسیح موعود فرماتے ہیں۔ میں مہدی ہوں۔ برطانوی حکومت میری تلوار ہے۔ ہمیں بغداد کی فتح سے کیوں خوشی نہ ہو۔ عراق، عرب، شام ہم ہر جگہ اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں۔" (الفضل ۷ دسمبر ۱۹۱۸ء)

میرزا غلام احمد نے برطانیہ کی اطاعت اور جہاد کی مخالفت میں مسلمان ملکوں میں اپنا لٹریچر بھیجا۔ لیکن میرزا محمود نے برطانوی مقاصد کی برآری کے لیے جنگ عظیم اول سے پہلے افریقہ میں مشن قائم کیے اور عرب ممالک میں سکاٹ لینڈ یارڈ کے تحت اپنے مخبر بھجوائے۔ جو اس کے حسب ہدایت کام کرتے رہے چنانچہ اسلامی ملکوں میں کام کرنے کے لیے برطانیہ کے محکمہ جاسوسی کی تجویز پر میرزائی امت کا دفتر لندن میں قائم کیا گیا تاکہ یہ بیرونی ملکوں میں کام کر سکے۔ اس غرض سے خواجہ کمال الدین دسمبر ۱۹۱۲ء کو انگلستان روانہ ہو گئے۔ انہوں نے وہاں پہنچنے کے بعد خلیفہ اول حکیم نورالدین کو لکھا تو حکیم صاحب نے چوہدری فتح محمد سیال ایم۔ اے کو پہلا احمدی مبلغ مقرر کیا اور وہ ۲۸ جون ۱۹۱۳ء کو لندن روانہ ہو گیا۔ دوسرا مشن سکاٹ لینڈ یارڈ کے حسب ہدایت افریقہ کے جزیرہ ماریشس میں قائم کیا گیا۔ اس کا انچارج صوفی غلام محمد بی۔ اے کو بنایا گیا جو فروری ۱۹۱۵ء میں روانہ ہو گیا اور پہلی جنگ عظیم کے دوران سکاٹ لینڈ یارڈ کے حسب ہدایت خدمات انجام دیتا رہا۔

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء۔۱۸ء میں عرب ریاستوں کے احوال و آثار اور دوسرے وقائع چوری کرنے کے لیے مرزا محمود نے اپنے مریدوں کی ایک کھیپ تیار کی۔ ہندوستانی فوج کی بھرتی کے ساتھ جاسوسی کے فرائض انجام دینے کے لیے ایک یا دو قادیانی منسلک کئے گئے کئی ایک معتقد ترکی بھیجے گئے جنہوں نے مقامی ملازمت کے پردے میں سکاٹ لینڈ یارڈ کی حسب ہدایت کام کیا۔ دمشق میں مرزا محمود کا سالا ولی اللہ زین العابدین ترکوں

سے ۔ راقم اس موضوع پر ایک مفصل کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے جس میں مرزائیت کے ایک ایک سند سے بتایا جائے گا کہ برطانوی سلطنت کی بقا کے لیے مرزائیت نے فرائض کس طرح انجام دیئے۔

کی یا پچریں وویژن کے انچارج جمال پاشا کی معرفت قدس یونیورسٹی میں دینیات کا لیکچرار لگ گیا لیکن جس وقت انگریزی فوج دمشق میں داخل ہوئی وہ انگریزی کمانڈر کے ماتحت ہو گیا۔ اور کئی ایک معتمد ترکوں کے قتل کرانے میں حصہ لیا۔ اس کا چھوٹا بھائی میجر حبیب اللہ شاہ فوج میں ڈاکٹر تھا۔ اس کو بغداد فتح ہونے پر جیل خانہ کا گورنر مقرر کیا گیا جب ۱۹۲۴ء میں عراق حکومت کو مرزائیوں کے خط وخال کا پتہ چلا تو اُن کی غدارانہ سرگرمیوں کے باعث ان سب کو وہاں سے نکال دیا۔ میرزا محمود نے جمعہ کے خطبہ (مطبوعہ الفضل ۱۳ اگست ۱۹۲۳ء) میں اعتراف کیا کہ:

"عراق فتح کرنے میں احمدیوں نے خون بہایا اور میری تحریک پر سینکڑوں لوگ بھرتی ہو کر گئے۔"

میرزا محمود نے مصطفیٰ کمال کو قتل کرنے کے لیے اپنے ایک معتمد نوجوان مصطفیٰ صغیر کا انتخاب کیا۔ اس کو انگریزی حکومت نے میرزا معراج دین سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کے ہمراہ ترکی روانہ کیا لیکن وہ اقدام قتل سے پہلے پکڑا گیا اور پھانسی پا گیا۔ میر محمد سعید حیدرآبادی کہ کہ مکرمہ میں قادیانی کا مشن کا انچارج تھا اور وہاں برطانوی محکمہ جاسوسی کے ایک اہم عہدیدار کرنل ٹی۔ ای۔ لارنس کی ہدایت پر کام کرتا تھا لیکن جب عربوں کو اس کا پتہ چلا تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت فرار ہو گیا۔ شام میں جلال الدین شمس کو مقرر کیا گیا۔ لیکن جب اہل شام کو معلوم ہوا کہ برطانوی جاسوس ہے تو ۔۔۔ ۵ دسمبر ۱۹۲۷ء کو اس پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن وہ بچ گیا۔ آخر عراق میں برطانوی گرفت ڈھیلی پڑنے پر ۱۱ مارچ ۱۹۲۸ء کو حیفہ آ گیا۔ اس کے بعد برطانوی سرکار کی ہدایت پر فلسطین کو قادیانی کارندوں کا ہیڈ کوارٹر بنایا گیا۔ وہاں برطانیہ کی جاسوسی کے محکمہ کا افسر اعلیٰ ایک یہودی تھا۔ قادیانی مشن کو اس کے ماتحت کیا گیا اور یہی احمدیت و یہودیت کے درمیان گٹھ جوڑ کا آغاز تھا۔ لائیڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے فلسطین میں قادیانی خدمات کا کھلم کھلا اعتراف کیا۔ ۱۹۲۴ء میں میرزا محمود خود فلسطین گیا اور اعلان کیا کہ یہودی اس خطہ کے مالک ہو جائیں گے۔ میرزا محمود نے برطانوی ہائی کمشنر سے ملاقات کی اور آئندہ خدمات کا نقشہ تیار کیا۔ جلال الدین شمس کے ساتھ دو یہودی زادہ محمد المغربی الطرابلسی اور عبد القادر علاوہ صالح منسلک کیے گئے۔

روس سے برطانیہ کو ہندوستان میں ابتدا ہی سے خطرہ تھا۔ یہ ذکر آ چکا ہے کہ ایک چار رکنی وفد جس میں مولانا محمد حسین آزاد بھی شامل تھے، اس غرض سے وسط ایشیا بھیجا گیا تھا کہ وہاں کے حالات کا جائزہ لیا جائے۔ لیکن پھر یہ کام قادیانیوں کو سونپا گیا۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں ایک قادیانی محمد امین خاں ایران کے راستہ روس میں داخل ہوا اور روسی حکومت نے پکڑ کے جیل میں ڈال دیا۔ وہ برطانوی حکومت کی مداخلت سے رہا ہوا۔ واپس آیا تو میرزا محمود سے ہدایات لے کر دوبارہ ایک دوسرے شخص ظہور حسین کے ہمراہ لوٹ گیا۔ ظہور حسین بھی

روسی حکومت کے ہاتھ آ گیا اور دو سال ماسکو کے جیل میں رہا۔ بالآخر برطانوی سفیر متعینہ ماسکو کی تگ و دو سے رہا ہوا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں افغانستان اور انگریزوں میں جنگ چھڑی تو قادیانی ایک کمپنی کی شکل میں برطانوی خدمات انجام دینے میں لگ گئے۔ میرزا محمود کا چھوٹا بھائی ٹرانسپورٹ کور میں کام کر رہا۔ اس کے سپرد قبائلی علاقے کے حالات کی فراہمی کا مشن تھا ——— ایک شخص نعمت اللہ قادیانی کو افغانستان میں جاسوسی کے لیے مقرر کیا گیا۔ لیکن جولائی ۱۹۲۴ء میں وہ گرفتار ہو گیا اور افغان گورنمنٹ نے سنگسار کر ڈالا۔ پھر فروری ۱۹۲۵ء میں دو اور قادیانی ملّاں عبد الحلیم اور ملّاں نور علی اسی پاداش میں قتل کیے گئے۔ پہلا قادیانی جو افغانستان میں ہلاک کیا گیا، وہ صاحبزادہ عبد اللطیف تھا جو میرزا محمود کے بیان کے مطابق (الفضل ۶ اگست ۱۹۳۵ء) جہاد کی مخالفت کے جرم میں قتل کرایا گیا۔

پہلی جنگِ عظیم کے نتائج سامنے آ گئے تو افریقہ کے بعض حصوں میں قادیانی مشن قائم کیے گئے۔ کوئی ۴ سال پہلے چرچ آف انگلینڈ کے ایک نمائندہ نے افریقہ میں قادیانی مشن کی سرگرمیوں پر ۱۹۶۶ء میں ایک کتاب لکھی جس میں اس فرقے کا تجزیہ کیا۔ اس نے لکھا کہ میں نے انگلینڈ واپس آ کر وزارتِ خارجہ سے تذکرہ کیا کہ جہاں جہاں برطانوی اقتدار رہا یا اب جن علاقوں میں نامسلمان حکومت قائم ہے وہاں قادیانی مشن عیسائیت کے خلاف شدومد سے پروپیگنڈہ کرتے اور حضرت مسیح کی توہین کرتے ہیں۔ آخر انہیں برطانوی سرپرستی کیوں حاصل ہے؟ وزارت نے کوئی جواب نہ دیا۔ کہا تو یہ کہ آپ ان کا چرچ کی سطح پر مقابلہ کیجئے۔ ہماری سیاسی ضرورتیں مختلف ہیں۔ پہلے ہندوستان غلام تھا، تو قادیانی مسلمان ملکوں میں ہندوستانی مسلمان کی حیثیت سے تبلیغی ڈھونگ رچاتے تھے۔ پاکستان بنا تو ربوہ کی معرفت پھیلاؤ پیدا کیا۔ لیکن تمام مشن برطانیہ کے جاسوسی مشن تھے۔ تمام کارکن پختہ قادیانی ہوتے جو غیر قادیانی مسلمانوں کو عقیدۃً کافر سمجھتے۔ جب تک انگریز رہا، برطانیہ کے لیے جاسوسی کرتے رہے۔ پاکستان بنا تو آزادی کے بعد استعماری گماشتہ ہو گئے۔

مرزا صاحب نے آریوں اور عیسائیوں کے خلاف محاذ قائم کیا تو اس کا مقصد مسلمانوں اور ہندوؤں میں انگریزوں کی سیاست کے مطابق تنفر و تصادم پیدا کرنا تھا۔ میرزا صاحب گل کھلانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہندو مسلم فساد کی نیو رکھی۔ دوسرا عیسائیوں سے مناظرہ محض مناظرہ ہوتا تو گوارا تھا لیکن مرزا صاحب نے حضرت مسیح کے خلاف دریدہ دہنی کا انبار لگایا۔ حضرت مریم کی اہانت کی۔ اس سے پادریوں کو رسول کریم کے خلاف یاوہ گوئی کا حوصلہ ہوا اور قرآن و سیرت کے خلاف رکیک سے رکیک زبان استعمال کی لیکن برطانوی

ڈپلومیسی سے مرزا صاحب کو اس یاوہ گوئی کی اجازت اس لیے دی، جیسا کہ مرزا صاحب نے ملکہ وکٹوریہ کے نام خط میں لکھا کہ وہ مسلمانوں میں اپنا اعتبار قائم رکھنا چاہتے تھے اور عیسائیوں کو اس لیے رگیدتے رہے کہ مسلمان ان پر اعتماد کریں اور یہ سمجھیں کہ حرمتِ جہاد کے پس پردہ انگریز نہیں ہیں۔ گویا عیسائیوں کو گالی دے کر وہ مسلمانوں میں اپنا اعتبار جماتے۔ اور برطانیہ کے لیے جہاد منسوخ کرتے تھے۔ چونکہ ان کے دعویٰ نبوت اور حرمتِ جہاد کا تعاقب علماء کی جانب سے مسلسل ہو رہا تھا اور مرزا صاحب میں ان سے مقابلہ کا حوصلہ نہ تھا اس لیے انہوں نے آریوں اور عیسائیوں سے مناظرے اور مجادلے کی نیو رکھی تاکہ مسلمان عوام سے محفوظ ہو گئے اور ان کا احتساب علماء تک محدود رہا ورنہ ممکن تھا کہ مرزا صاحب مسلمان عوام کے ہاتھوں اپنے دعاوی کے ساتھ شروع ہی میں دفن ہو جاتے۔ مرزا صاحب کی تصنیف تریاق القلوب کے صفحہ ۱۰۴ پر بہ عنوان "حضور گورنمنٹ عالیہ میں ایک عاجزانہ درخواست" کے ضمیمہ نمبر ۳ میں درج ہے کہ:

"عیسائیوں کے عیسائی اخبار نور افشاں" میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت نعوذ باللہ نہایت گندے الفاظ استعمال کیے گئے۔ مجھے عیسائی مشنریوں کی ایسی کتابیں اور اخبار پڑھنے سے اندیشہ ہوا کہ مبادا مسلمانوں کے دلوں میں کوئی اشتعال دینے والا سخت اثر پیدا ہو تب میں نے ان کے جوشوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے صحیح اور پاک نیت سے یہی مناسب سمجھا کہ ان تحریروں کو سختی سے جواب دیا جائے تاکہ سریع الغضب انسانوں کے جوش فرو ہو جائیں اور ملک میں کوئی بے امنی پیدا نہ ہو۔" (تلخیص)

گویا میرزا صاحب نے تسلیم کیا کہ وہ عیسائیوں کے خلاف جو کچھ لکھتے رہے ان کی بدزبانی سے مسلمانوں میں پیدا ہونے والے اشتعال کو ٹھنڈا کرنے کے لیے لکھتے اور حکومت اس لیے گوارا کرتی کہ مرزا صاحب حرمتِ جہاد کے مشن پر مامور تھے۔ حضرت پیر مہر علیشاہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف میرزا صاحب نے تحفہ گولڑویہ لکھا، تو اس میں بیان کیا کہ "میرے مقابل کوئی پادری نہیں ٹھہر سکتا۔ میرا رعب عیسائی علماء پر خدا نے ایسا ڈال دیا ہے کہ ان میں طاقت ہی نہیں رہی کہ میرا مقابلہ کر سکیں۔ خدا نے مجھے روح القدس سے تائید بخشی ہے اور اپنا فرشتہ میرے ساتھ کیا ہے۔" میرزا صاحب نے ۱۸۹۳ء میں ڈپٹی عبداللہ آتھم نامی ایک عیسائی سے مناظرہ کرنے کے لیے ڈاکٹر مارٹن کلارک مقیم امرتسر کو خط لکھا۔ اس میں شرط لگائی کہ مغلوب غالب کا مذہب اختیار کرے گا ورنہ اپنی نصف جائیداد فریق غالب کے حوالے کر دے گا۔ اس خط و کتابت میں مرزا صاحب نے سٹہ بازی کرنا چاہی۔ اور اس قسم کی اشتہار بازی کی کثرت سے مسلمان بھی عیسائیوں کے بعد و فساد کے باعث مرزا کے طرفدار ہو گئے۔

پادری کلارک نے ۴ مئی ۱۸۹۳ء کو اشتہار شائع کرایا کہ کوئی مرتد شخص اسلام کا نمائندہ نہیں ہو سکتا۔ جب کسی طرح بات نہ بنی تو ۲۲ مئی سے ۵ جون ۱۸۹۳ء تک پندرہ روز ڈاکٹر مارٹن کی کوٹھی میں مناظرہ ہوتا رہا۔ مرزا صاحب کو شکست ہوئی۔ اس مناظرہ کی رُوداد جنگِ مقدس کے نام سے شائع کی گئی۔ اُس وقت کے بعض علما نے اعلان و اعتراف کیا کہ مرزا صاحب نے اس مباحثہ میں اسلام کے دامن طاقت پر بدنما دھبہ لگایا اور مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ مرزا صاحب نے عبداللہ آتھم کے ہلاک ہونے کی پیشین گوئی کی۔ پادریوں نے امرتسر میں کئی دفعہ حملے کرائے۔ آتھم فیروز پور چلا گیا۔ وہاں چار حملے ہوئے۔ دو مرتبہ گولی چلائی گئی۔ ایک دفعہ کوبرا سانپ بند کرکے آتھم کے مکان میں ڈال دیا گیا لیکن آتھم بچتا ہی رہا۔ مرزا صاحب نے ایک پیشگوئی میں اس کی موت کی آخری تاریخ ۵ ستمبر ۱۸۹۴ء مقرر کی لیکن آتھم نہ مرا۔ قادیان میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ۵ ستمبر کو عیسائی آتھم کو فیروز پور سے امرتسر لائے۔ اس کا شاندار جلوس نکالا۔ ملک کے ہر حصہ میں عیسائیوں نے جشن منایا۔ کئی ایک مرزائی بپتسمہ لے کر عیسائی ہو گئے۔ بعض پادریوں نے مرزا صاحب پر قاتلانہ سازشوں کی منصوبہ بندی کے الزام میں مقدمے دائر کیے لیکن مرزا صاحب انگریز ڈپٹی کمشنروں کی عدالت سے چھوٹ جاتے رہے۔ کبھی معافی مانگ کر خلاصی پاتے کبھی اپنی خدمات جلیلہ کے عوض جان بخشی کراتے۔ بعض دفعہ انگلی جنس بیورو اشارہ کرتی تو مقدمہ ختم ہو جاتا۔ ڈاکٹر مارٹن کلارک نے گورداسپور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کیپٹن ڈگلس کی عدالت میں استغاثہ دائر کیا کہ مرزا صاحب نے ان کے قتل پر ایک نوجوان کو مامور کیا ہے اور وہ نوجوان پولیس کے پاس اعتراف کر چکا ہے لیکن حکومت نے پولیس کی معرفت اس نوجوان کو بیان سے منحرف کرا دیا۔ کیپٹن ڈگلس نے اپنے ایک ہم وطن اور ہم عقیدہ کے استغاثہ کو مسترد کرتے ہوئے مرزا صاحب کو باعزت بری کر دیا۔

مرزا صاحب کا حال یہ تھا کہ ہندو دھرم اور عیسائی مذہب کو غلیظ سے غلیظ گالی دیتے ـــــ لیکن حکومت ٹس سے مس نہ ہوتی! البتہ مسلمانوں نے جواب آں غزل میں سرورِ کائنات کے خلاف بدزبانی کا راستہ کھول دیا اور حضور پر سب و شتم روزمرہ ہو گیا۔

انگریز ہندوستان میں اپنی حکومت کا استحکام اسی میں پاتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تصادم و اختلاف بڑھتا جائے اور دونوں قومیں اپنے ہی ملک میں ایک دوسرے کی حریف ہوں۔ مرزا صاحب نے یہی کیا۔ انہوں نے مذہب کی بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ آریہ سماج ہندو دھرم کی ایک پروگریسو تحریک تھی۔ اس کا مزاج اصلاحی تھا۔ لب لباب یہ تھا کہ ہندو خود ساختہ خرافات چھوڑ کر ویدوں

کی طرف لوٹ جائیں۔ اس کے بانی سوامی دیانند سرسوتی گجرات کاٹھیاواڑ کے باشندہ تھے۔ انہیں سنسکرت اور اپنی زبان کے سوا دوسری کوئی زبان نہ آتی تھی۔ وہ اردو، پنجابی، ہندی وغیرہ سے نابلد تھے — ان کی تحریک کو اپنے گھر مہاراشٹر، گجرات اور کاٹھیاواڑ کے مقابلہ میں پنجاب کے ہندوؤں میں حد درجہ کامیابی ہوئی۔ جن لوگوں نے اس صوبہ میں قومی تحریک کا علم اٹھایا اور برطانوی استعمار کے خلاف نبرد آزما ہوئے مثلاً لالہ لاجپت رائے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو، ڈاکٹر ستیہ پال وغیرہ وہ سب آریہ سماجی تھے۔ ہندوؤں کے نامور روزنامے بھی آریہ سماج کے پیروؤں کی ملکیت تھے۔ المختصر پنجاب کا تعلیم یافتہ ہندو زیادہ تر آریہ سماج کا رکن تھا۔ میرزا صاحب نے سوامی دیانند کو اپنی ژاژ خائی کا ہدف بناتے ہوئے ویدوں سے متعلق لکھا کہ:

”اس قدر لغو بیانی تو بچائیں اور مسلوب الحواس کے کلام میں بھی نہیں ہوتی۔“ مزید لکھا کہ ہندوؤں کا پرمیشر آپ ہی لوگوں کو بدفعلی اور پلیدی میں ڈالنا چاہتا ہے۔“

تکذیب براہین کے صفحہ ۲۴۴ پر تحریر کیا — ”دہریوں کے بعد تمام دنیا میں آریوں سے بدتر اور کوئی مذہب نہیں۔“

سوامی دیانند، میرزا صاحب کی دعوت مباہلہ پر گورداسپور آگئے اور بہت دن تک ٹھہرے لیکن میرزا صاحب مقابلہ میں نہ آئے۔ پھر سوامی صاحب امرتسر آگئے۔ میرزا صاحب کو ان کے دعوتی خطوط کا جواب لکھا کر خدا کے واسطے آئیے اور گفتگو فرمائیے لیکن میرزا صاحب کو سامنے آنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔ سوامی دیانند ۳۰ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو انتقال کر گئے تو مرزا صاحب نے براہین احمدیہ میں ان کی تاریخ وفات فخر و مباہات سے پیشگوئی کے طور پر درج کی جس سے آریہ سماج کے رہنما چڑ گئے اور انہیں میرزا صاحب کی تعلّیوں پر غصہ آگیا۔

سوامی صاحب کی واحد تصنیف ستیارتھ پرکاش پہلی دفعہ ۱۸۷۵ء میں براہین احمدیہ سے پانچ چھ سال پہلے چھپی۔ اس کے ناشر راجہ جے کشن داس سی۔ ایس۔ آئی (بنارس) تھے۔ تب اس میں صرف بارہ باب تھے۔ لیکن تیرھواں اور چودھواں باب نہ تھا۔ جب مرزا صاحب نے آریہ سماج کے خلاف گندی زبان استعمال کی اور سوامی دیانند کی موت کو اپنی پیش گوئی کا ماحصل قرار دیا تو ستیارتھ پرکاش میں تیرھواں اور چودھواں باب کا اضافہ کیا گیا۔ ان کا مصنف کوئی اور تھا۔ اس نے قرآن، اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دشنام و اتہام اور خرافات و ہفوات کا انتہائی دل آزار مواد تحریر کیا۔ ممکن تھا آریہ سماجی یاوہ گوئی سے احتراز کرتے۔ لیکن مرزا صاحب اس سارے کیے دھرے کے مسئول تھے انھوں

نے آریوں کو اس طرز کلام کا چسکا ڈالا اور وہ گالی دینے میں کھل گئے جب مرزا صاحب کو علماء نے ٹوکا تو انہوں نے ازالہ اوہام میں لکھا کہ:

"سارا قرآن شریف گالیوں سے پُر ہے۔ قرآن پاک میں کفار کو شرالبریہ قرار دیا اور تمام رذیل و پلید مخلوقات سے انہیں بدتر ظاہر کرنا دشنام دہی میں داخل نہیں؟"

یہ ایک طویل اقتباس کی تلخیص ہے۔ مزید لکھا ہے کہ قرآن شریف جس آواز بلند سے سخت زبانی کے طریق کو استعمال کر رہا ہے۔ ایک غایت درجہ کا غبی اور سخت درجہ کا نادان بھی اس سے بے خبر نہیں رہ سکتا مثلاً زمانہ حال کے نزدیک کسی پر لعنت بھیجنا ایک سخت گالی ہے لیکن قرآن شریف کفار کو سنا سنا کر ان پر لعنت بھیجتا ہے۔"

سوامی دیانند سرسوتی کی موت کو جب میرزا صاحب نے اپنے الہام کا نتیجہ قرار دیا۔ تو ان کے ایک پیرو پنڈت لیکھرام نے میرزا صاحب کے مصرعہ طرح پر گرہ لگائی اور ان کے الہامات کو چیلنج کیا۔ میرزا صاحب حسب معمول پیچ پر پیچ آ گئے اور اول فول بکنا شروع کیا۔ لیکن لیکھرام سخت جان واقع ہوا۔ میرزا صاحب تبلیغ میں قادیانی کے عادی تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ "کوئی غیر مذہب والا ان کے پاس ایک سال رہ کر کوئی آسمانی نشان نہ دیکھے اور قتل پا کر مسلمان نہ ہو تو اس کو دو سو روپیہ ماہوار کے حساب سے ہرجانہ یا جرمانہ دیں گے" لیکھرام نے اعلان کیا کہ مرزا صاحب سال کا یکمشت سرکاری خزانہ میں جمع کرا دیں تو وہ سال بھر ان کے پاس رہنے کو تیار ہے۔

میرزا صاحب نے گریز کیا اور کہا کہ یہ ان کے لیے ہے جو اپنی قوم میں معزز علماء اور مشہور مقتدا ہیں۔ آپ اس حیثیت اور مرتبہ کے آدمی نہیں ہیں۔ غرض یہ ایک طویل کہانی ہے۔ المختصر میرزا قادیانی نے پنڈت لیکھرام کو قادیان آنے کی دعوت دی لیکھرام پہنچ گیا۔ اس زمانہ میں مراد آباد کے ایک آریہ سماجی منشی اندرمن نے میرزا صاحب کو ایک سال قیام کی پیشکش کی۔ لیکن مرزا صاحب اس سے بھی فرار کر گئے۔ قادیان کے سربرآوردہ ہندوؤں نے تعاقب کیا تو میرزا صاحب ان سے بھی کنی کترا گئے۔ اگر کوئی نتیجہ مرتب ہوا تھا تو وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تنفر کے مستقل ذہن کا تشکل ہونا تھا یہی مرزا صاحب کا مقصد تھا اور وہ اس میں کامیاب ہو رہے تھے۔ لالہ مرلی دھر نے ہوشیارپور میں مرزا صاحب کے مکان پر جا کر مناظرہ کیا۔ اس کا دوسرا جلسہ ۱۴ مارچ ۱۸۸۶ء کو شیخ مہر علی رئیس اعظم ہوشیارپوری کے مکان پر ہوا۔ لیکن مرزا صاحب کے مناظرے تحریری ہوتے اور حاصل کچھ نہ ہوتا میرزا صاحب نے اس مناظرہ کی روداد سرمہ چشم آریہ کے نام سے شائع کی۔ لیکھرام نے اس کے جواب میں "نسخہ خبط احمدیہ" لکھا۔ میرزا صاحب کے ان مناظروں سے اسلام کے خلاف بیہودہ گوئی کا دروازہ کھل گیا۔

لیکھرام نے مرزا صاحب کو زچ کیا تو مرزا صاحب نے ۱۸۹۳ء میں پیشگوئی کی کہ لیکھرام قتل کیا جائے گا۔ چنانچہ ۶ مارچ ۱۸۹۷ء کو لیکھرام لاہور میں قتل ہو گیا۔ اس سے ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مرزا صاحب کے خلاف ہندوؤں میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مرزا صاحب نے قسمیں کھا کھا کر برأت کا اعلان کیا کہ اس میں اس کا ہاتھ نہیں لیکن مرزا صاحب کی نبوت نے پنجاب میں ہندو مسلم فساد کی نیو اٹھا دی۔ اس سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں میں آمنے سامنے کے اجتماعی فساد کبھی نہ ہوتے تھے۔ مرزا صاحب ان فسادات کے داعی و بانی ٹھہرے۔ ہندو مسلمانوں سے اور مسلمان ہندوؤں سے اس طرح کھنچ گئے کہ ان میں وطنی اتحاد خواب و خیال ہو گیا۔ کبھی اتحاد ہوا تو عارضی۔ اس کا سفینہ جلد ڈوب گیا۔ فی الجملہ مرزا صاحب ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے میں کامیاب ہو گئے اور اس لڑائی کا شعار ہمیشہ کے لیے مستقل ہو گیا۔ مرزا صاحب نے دوسرا کارنامہ یہ انجام دیا کہ آریوں میں حضورؐ کے خلاف دریدہ دہنی کا حوصلہ پیدا کیا۔

مرزا صاحب نے استعارہ پرستی کی ترنگ میں سب سے شرمناک کام یہ کیا کہ مسلمانوں کی ملی وحدت میں ناقابلِ عبور خلیج پیدا کی۔ اس وقت جن علمائے حق سے مسلمانوں کی دینی غیرت کا چرچا تھا، مرزا صاحب نے للکار للکار کے انہیں بے نقط گالیاں دیں۔ ان کے تارک سے کوئی دینی وجود محفوظ نہ رہا۔ ایک صاحب منشی الٰہی بخش نے مرزا صاحب کی تحریروں سے ان گالیوں کو ردیف وار جمع کیا۔ مرزا صاحب کی محبوب گالیاں تو بہت سی تھیں لیکن بڑی گالی یہ تھی کہ جو انہیں نبی نہیں مانتا وہ زانیہ عورتوں کی اولاد ہے (آئینہ کمالات صفحہ ۵۴۷) پھر اس کے ہم معنی الفاظ کا اعادہ کرتے رہے۔ دوسری گالی جس سے مرزا صاحب کا نطق لذت پاتا، وہ حرامزادہ کا لفظ تھا۔ مرزا صاحب نے عیسائیوں اور آریوں کو تسلسل سے حرامزادہ کہا، اسی طرح مسلمان علماء کو اپنی بعض کتابوں اور کئی ایک اشتہاروں میں اسی لفظ سے مخاطب کیا۔ اس کے مترادفات جتنے عریاں الفاظ تھے اکثر و بیشتر لکھتے رہے حتیٰ کہ بعض پمفلٹ صرف گالی تھے۔

مرزا صاحب نبی ہو کے ترکی کی زبان استعمال کرتے۔ چونکہ متنبی تھے اور انگریزی حکومت نے انہیں ایک مشن سونپ رکھا تھا، اس لیے حکومت مرزا صاحب کی اس زبان کا حوصلہ بڑھاتی۔ نتیجۃً عیسائیوں اور آریوں کو پروپیگنڈا کرنے کا موقع ملا کہ اسلام میں پیغمبروں کی زبان یہ رہی ہے۔ اور جو شخص خود کو محمد عربی کا ظل و بروز کہتا ہے اس کی اپنی زبان اتنی غلیظ ہے، تو جس کا بروز و ظل ہے، اس کی زبان (خاکم بدہن) کیا ہو گی؟ یہ گویا مرزا صاحب کی بدولت سیرتِ رسولؐ پر حملہ آوری کا ایک حربہ تھا۔ دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ

میرزا صاحب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تنافر کو اُبھار کر پختہ کیا، جو انگریزی عملداری کے لیے ضروری تھا۔ میرزا صاحب برطانیہ کی استعماری خواہشوں کا مظہر تھے۔ اُنہوں نے پنجاب کی حد تک انگریزی حکومت کی بے نظیر خدمت کی کہ پورا صوبہ کئی واسطوں سے وفاداری بشرط استواری کا مُرقع ہو گیا اور یہی مرزا صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔

❖ ❖ ❖ ❖

دینی احتساب کے عالمانہ معرکے

مرزا غلام احمد اس حد تک ضرور کامیاب ہو گئے کہ انھوں نے پنجاب کے مسلمانوں کا رُخِ جہاد پلٹ دیا۔ انگریز جہاد ہی سے پریشان تھے۔ مرزا صاحب نے پہلے اپنے لیے ایک فضا پیدا کی۔ پھر نبوت کا دعویٰ کیا۔ آخر میں جہاد منسوخ کیا اور برطانوی حکومت کی اطاعت فرض کر دی؛ حتیٰ کہ ان لوگوں کی مخبری کی اور گالیاں بکیں جو برطانیہ سے ظاہر و باطن یا جلی و خفی ناخوش تھے۔ مرزا صاحب نے جیسا کہ ان کی بعض کتابوں سے ظاہر ہے، انگریزی حکام کو ان تمام مسلمانوں کی ایک فہرست مہیا کی، جو اندرخانہ برطانوی حکومت کے خلاف تھے اور مرزا صاحب انھیں اپنے راستہ کی دیوار سمجھتے تھے۔ اس روک کو دور کرنے کے لیے مرزا صاحب نے برطانوی حکومت سے ان کی مخالفت کا فسانہ تصنیف کیا اور تحریری طور پر انگریز حکام کو مطلع کیا۔ مرزا صاحب کا دعویٰ نبوت بلاشبہ اسلام کے خلاف ایک استعماری حربہ تھا۔ ان کے دعاوی سے نہ صرف ختم نبوت کا تصور مجروح ہوتا بلکہ ملت اسلامیہ کی اساس محکم میں دراڑ پیدا ہوتی۔ ہر امت اپنے نبی کی بدولت وجود میں آتی اور اُمت کہلاتی ہے۔ مرزا صاحب نے اسلام کو اپنی ذات سے مشروط کرنا چاہا، تو علماء اس نقب زنی سے چونک گئے۔ ان کے سامنے برطانوی عملداری کا سوال نہ تھا کہ مسلمان اس کے ہاتھوں کچلے گئے اور ان کا ملی وجود اقتدار سے محروم ہو چکا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ جس ذات سے ان کا وجود ہے، اس کی طاقت تقسیم کی جا رہی ہے اور استعماری مقاصد کے لیے ایک دوسرا نبی تصنیف

کیا گیا ہے۔ ملک بھر کے علماء نے مرزا صاحب کا تعاقب شروع کیا۔ اس سے میدان جہاد جو انگریزوں کے لیے
شوہان روح تھا، سرد پڑ گیا۔ اس کی جگہ میدان مجادلہ نے لی۔ فریقین مسلمان تھے۔ انگریزوں کو اطمینان ہو گیا کہ
ان کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ اب مسلمان آپس میں گتھم گتھا تھے۔ مرزا صاحب کا انتخاب سیالکوٹ کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے
کیا تھا اور وہ استعماری مقصد کے لیے نامزد ہوتے تھے، لیکن اس کے بعد وہ جہاں شمال افسروں کے ہاتھ میں
نہ رہے۔ ان کی ہدایت کار بالواسطہ و بلاواسطہ برطانوی انٹیلی جنس بیورو کے مرکزی افسر ہو گئے جو گورنر جنرل
کے سامنے جوابدہ تھے یا پھر ان افسروں کا تعلق سوائی گورنروں سے تھا۔ اصلاً ان کا رابطہ برطانیہ کے بین الاقوامی
ادارۂ سراغرسانی سے تھا۔ مرزا صاحب کی نشوونما انہی کی معرفت ہوئی۔

مرزا صاحب مسیح موعود اور مہدی معہود کی حیثیت سے نمودار ہونے لگے، تو علماء نے شد و مد سے دینی احتساب
شروع کیا۔ اس سے پہلے عیسائیت سے مناظروں کی مہم میں بعض علماء ان کی اعانت کرتے رہے تھے۔ اسی طرح
آریہ سماج اور سناتن دھرم سے مبازرت نے بھی مسلمانوں کی ذہنی فضا کو اپنی طرف راجع کر لیا تھا۔ انگریز
برعظیم کے حکمران کی حیثیت سے ان مناظرانہ سرگرمیوں کی ہمت افزائی کرتے، کیونکہ ان کا منشا اسی میں تھا کہ برعظیم
کی مختلف قوموں میں اتحاد نہ رہے اور خود مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو۔ مرزا صاحب نے عیسائیت، سناتن دھرم
آریہ سماج اور برہمو سماج کی تردید میں براہین احمدیہ کی تصنیف کا اعلان و آغاز ۱۸۸۰ء میں کیا۔ فرمایا کہ وہ
صداقتِ اسلام کے سلسلہ میں تین سو دلیلیں پیش کریں گے۔ تمام جدید علماء اور نامور فضلاء سے مرزا صاحب
نے عملی امداد کی درخواست کی۔ اکثر علماء و فضلاء نے اس خواہش کو پورا کیا۔ سرسید کے علمی رفیق مولوی
چراغ علی نے بھی براہین احمدیہ کا ایک بڑا حصہ تصنیف کیا، لیکن مرزا صاحب نے کتاب میں اپنے نام سے
شامل کیا اور ان کا نام تک نہ لکھا اور نہ کسی طرح ان کا ذکر کیا۔ (ملاحظہ ہو بابائے اردو کی تصنیف چند ہم عصر)
علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اپنے ایک مضمون میں اس کا ذکر کیا ہے۔

براہین احمدیہ بڑے سائز کے ۵۰۰ صفحات میں چھپ کر نکلی۔ مرزا صاحب مسلمانوں سے اس کتاب کے
لیے مسلمانوں سے اس کتاب کے لیے پے بہ پے مالی امداد کی اپیل کرتے رہے۔ ایک بڑی رقم جمع ہو گئی اور یہی
مرزا صاحب کی خوشحالی کا آغاز تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی خیانت کو چھپانے کے لیے مسلمانوں سے گلہ کیا کہ
انہوں نے مالی امداد میں بخل کیا ہے۔

مرزا صاحب نے کتاب کے چوتھے حصے کے شروع میں انگریزی گورنمنٹ کے زیر عنوان برطانوی عملداری

کی کھل کر مدح کی، مسلمانوں پر اس کے احسانات گنوائے اور جہاد کی مخالفت پر دلائل قائم کیے۔ کتاب کے چار حصے ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک شائع کیے۔ پانچواں حصہ آخری تھا، وہ رک گیا لیکن جلد اول کے ۲۳ سال بعد ۱۹۰۵ء میں شائع کیا۔ میرزا صاحب نے لکھا کہ وہ حسب الاعلان پچاس حصے لکھنا چاہتے تھے، لیکن پانچ پر اکتفا کرتے ہیں، فرق صرف ایک نقطہ کا ہے۔ جن تین سو دلیلوں کا وعدہ کیا تھا ان سے کتاب خالی رہی۔ میرزا صاحب کے بیٹے میرزا بشیر احمد نے سیرۃ المہدی میں لکھا ہے کہ پانچوں حصوں میں صرف ایک دلیل بیان ہوئی ہے اور وہ بھی نامکمل ہے۔ جہاں تک کتاب کا تعلق ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں، اس ضخیم دفتر میں کوئی نادر علمی تحقیق نہیں۔ کچھ ہے تو بسیار نویسی اور دراز نفسی کا مجموعہ ہے۔ ایک قاری کے لیے اس کثرت سے الہامات، خوارق، کشف، احکام خداوندی، پیشین گوئیاں اور طویل و عریض دعوے ہیں کہ طبیعت بدمزہ و منغض ہو جاتی ہے۔ ساری کتاب مصنف کی اپنی شخصیت کا اشتہار ہے۔ پہلے چار حصوں میں میرزا صاحب نے اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ الہام کا سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔

مولانا محمد حسین بٹالوی نے اس کتاب پر اپنے رسالہ اشاعۃ السنہ میں چھ قسطوں میں طویل تبصرہ کیا جس میں **براہین احمدیہ** کو علمی کارنامہ اور تصنیفی شاہکار قرار دیا۔ بٹالوی حضرت شیخ الکل محمد نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ آپ کو علم حدیث میں ایک خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ آپ کے متعلق رئیس قادیان کے مرتب ابوالقاسم رفیق دلاوری نے لکھا ہے کہ آپ مرزا صاحب کے بچپن کے دوست اور ہم سبق تھے۔

مرزا صاحب کے دعاوی و الہامات اور روپے پیسے میں بدمعاملگی سے آپ کا جی کھٹا ہو گیا۔ آپ نے میرزا صاحب کو ٹوکا لیکن وہ برطانوی استعمار کے گھوڑے پر سوار تھے، کیونکر مانتے؟ نتیجۃً جانبین میں ٹکراؤ ہو گیا۔ مولانا بٹالوی نے میرزا صاحب کو آڑے ہاتھوں لیا۔ میرزا صاحب نے انہیں وہابی ہونے کے برطانوی الزام سے مطعون کر کے انگریزوں کو بدظن کرنا چاہا اور حکام کو لکھا کہ وہابی سرشت کے مطابق وہ مسلمانوں کو برطانوی حکومت کے خلاف جہاد پر اکساتے ہیں۔ مولانا نے تنسیخ جہاد کا موقف اختیار کیا۔ انگریز ایک اہل حدیث عالم سے یہ فتویٰ پا کر نہ صرف مسرور و مطمئن ہوئے بلکہ شمس العلماء کا خطاب دیا اور انعام میں اراضی عطا کی؛ حتیٰ کہ گورنر جنرل ہندوستان سے صوبائی گورنر کی سفارش پر اپنی جماعت کے لیے اہل حدیث کہلانے کی منظوری حاصل کی۔ مولانا بٹالوی کی فراست کا نتیجہ تھا کہ ان کی جماعت دار و گیر سے محفوظ ہو گئی۔ میرزا غلام احمد کی مخبری اکارت گئی اور قادیانی جتنی علماء کے اڑنگے پہ آگیا، دراصل اس کا شیوہ تھا کہ وہ انگریز حکام سے مخبری کر کے اُن کے خلاف دار و گیر کا الاؤ روشن رکھتا۔

مولانا بٹالوی نے ۱۵ اپریل ۱۸۹۱ء کو حکیم نورالدین (خلیفہ اول) سے مباحثہ کیا اور اس کو بھگا دیا۔ اس کے بعد میرزا غلام احمد نے مولانا بٹالوی سے مناظرے کی طرح ڈالی لیکن پورے مئی ۱۸۹۱ء تک بے سروپا خط و کتابت کرکے فرار کیا۔ ان دنوں مولانا بٹالوی چینیاں والی مسجد کے خطیب تھے۔ آپ نے میرزا صاحب کو ان کے دعاوی پر مناظرے کی دعوت دی ۔ میرزا صاحب نے رسید ہی نہ دی۔ مولانا بٹالوی نے لدھیانہ پہنچ کر میرزا صاحب کے خسر میرزا ناصر نواب دہلوی کے مکان میں ۲۰ جولائی ۱۸۹۱ء کو تحریری مباحثہ کا آغاز کیا۔ مباحثہ ۱۲ روز تک رہا۔ آخر میرزا صاحب جھوٹ بول کر فرار ہو گئے۔ میرزا صاحب کی جمادی تو یکم اگست ۱۸۹۱ء کو مولانا بٹالوی سے حیات و وفات مسیح پر مباحثہ کا اشتہار دیا اور لاہور میں مناظرہ کرنے کا اعلان کیا۔ لیکن میرزا صاحب اس سے بھی بھاگ گئے۔ مولانا بٹالوی نے اوائل فروری ۱۸۹۲ء میں میرزا صاحب کی لاہور میں آمد پر ایک اور چیلنج کیا۔ لیکن میرزا صاحب الہام کی آڑ لے کر سیالکوٹ چلے گئے۔ مولانا بٹالوی پیچھے گئے۔ میرزا صاحب نے سیالکوٹ سے کوچ کرنے کی ٹھانی تو کسی ایک معززین نے روکا کہ مولانا بٹالوی سے مناظرہ کیجئے۔ میرزا صاحب نے عذر کیا کہ وہ مجھے کافر کہتا اور گالیاں دیتا ہے، اس سے مناظرہ جائز نہیں۔ المختصر میرزا صاحب سیالکوٹ سے اڑ گئے۔ کپورتھلہ پہنچے۔ مولانا بٹالوی نے وہاں تعاقب کیا۔ مقامی علماء نے میرزا صاحب کو گھیر لیا تو وہاں سے جالندھر چلے گئے۔ مولانا بٹالوی نے جالندھر کے علماء کو لکھا۔ لیکن میرزا صاحب ان کا نام سنتے ہی اڑنچھو ہو گئے۔

میرزا صاحب نے مولانا بٹالوی کے تعاقب سے تنگ آکر اپنے ایک الہام کا اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ چالیس دن کے اندر محمد حسین بٹالوی کو ذلیل و خوار کریگا کیونکہ اس نے میری اہانت کو شعار بنا لیا ہے۔ لیکن مولانا بٹالوی پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم رہا۔ انہوں نے ۳۰ اپریل ۱۸۹۲ء کو اپنے رسالے میں لکھا کہ وہ بفضل تعالیٰ زندہ ہیں اور میرزا غلام احمد کے مقابلہ میں تندرست و توانا اور خوش و خرم ہیں۔ میرزا صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ میرزا صاحب عجیب الخلقت انسان تھے۔ علماء کے تعاقب سے کاروبار ماند پڑ گیا تو زر اعانت کے رکنے پر ۱۵ دسمبر ۱۸۹۲ء کو میاں نذیر حسین محدث دہلوی، مولانا محمد حسین بٹالوی اور ان تمام علماء کو دعوت مباہلہ دی، جن کے نزدیک وہ اپنے دعاوی کے باعث خارج از اسلام ہو چکے تھے۔ مولانا بٹالوی نے فی الفور مباہلہ منظور کر لیا اور مرزا صاحب کو لکھا کہ وہ جہاں مباہلہ کرنا چاہیں انہیں آنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ لیکن مرزا صاحب حسب عادت فرار کر گئے۔ پھر اگلے سال ۳۰ مارچ ۱۸۹۳ء کو مرزا صاحب نے ایک اشتہار شائع کیا جس میں لکھا کہ محمد حسین بٹالوی میرے مقابلہ میں تفسیر قرآن عربی میں لکھیں۔ مولانا بٹالوی نے اپنے رسالہ اشاعۃ السنۃ میں مرزا صاحب کا چیلنج منظور کر لیا۔

مرزا صاحب حسب معمول اس سے بھی بھاگ گئے۔ مولانا محمد حسین بٹالوی لاہور سے ریل گاڑی میں سوار ہو کر پورب کی طرف جا رہے تھے کہ ٹرین میں حکیم نور الدین سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے مرزا صاحب کے عقائد پر گفتگو ہوئی۔ حکیم صاحب گریز کرتے رہے۔ بالآخر جان بچا کر نکل گئے۔ مولانا بٹالوی نے حکیم صاحب سے کہا کہ مرزا صاحب کی الہامات و تحریرات در اصل آپ کے قلم سے ہیں اور آپ ان کے پس منظر میں ہیں ــــ حکیم صاحب غصہ و برہمی کے ساتھ سراسیمگی کے عالم میں چلے گئے۔ مرزا صاحب نے ۴ مئی سنہ ۱۸۹۳ء کو اپنے ایک الہام کا اعلان کیا کہ محمد حسین بٹالوی نے ان سے بیعت کر لی ہے۔ اس پیشگوئی کو مرزا صاحب نے اپنی منظوم کتاب اعجاز احمدی مطبوعہ نومبر سنہ ۱۹۰۲ء میں دہرایا تو مولانا بٹالوی نے مرزائیت کا تعاقب تیز کر دیا۔ مرزا صاحب زچ ہوتے گئے اور ان کی یہ پیشگوئی باطل ثابت ہوئی۔ مرزا صاحب کے پاس گالیاں بکنے کے سوا اور کوئی نسخہ نہ تھا۔ انھوں نے علماء و مشائخ کے خلاف اتنی گندی زبان استعمال کی کہ عوام ششدر رہ گئے۔ مولانا بٹالوی نے اپنے رسالہ اشاعت السنہ میں شدید محاسبہ کیا۔ مرزا صاحب کی ہوا اکھڑ گئی۔ لوگ سوال کرنے لگے کہ ایک ملہم جو اپنے تئیں مامور من اللہ کہتا ہے، کیا اس قسم کی بازاری زبان بولتا اور لکھتا ہے؟ لیکن مرزا صاحب کے نزدیک ان کے الہامات کا یہی طغری تھا۔ مرزا صاحب نے اپنے ایک مبینہ مفروضہ پر مولانا بٹالوی کی موت کا اعلان کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے مرزا صاحب کے متنبی ہونے کی مہر لگا دی۔ مرزا صاحب ان سے پہلے ۲۶ مئی سنہ ۱۹۰۸ء کو انتقال کر گئے۔ مولانا بٹالوی نے بارہ سال بعد ۲۹ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو وفات پائی۔ علماء اہل حدیث نے مرزا صاحب کے کفر پر فتوی دیا۔ ان کا فتوی فتاوی نذیریہ جلد اول کے صفحہ ۹۰ پر موجود ہے۔ مرزا صاحب اس فتوی سے تلملا اٹھے اور میاں صاحب کو مناظرہ کا چیلنج دیا۔ میاں صاحب سو برس سے اوپر ہو چکے اور انتہائی کمزور تھے آپ نے مرزا صاحب کے چیلنج کو اپنے تلامذہ کے سپرد کیا۔ مرزا صاحب اپنی عادت کے مطابق فرار ہو گئے۔

جن اہل حدیث علماء نے مرزا صاحب اور ان کے بعد قادیانی امت کو زیر کیا، ان میں مولانا محمد بشیر سہسوانی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی سر فہرست تھے، لیکن جس شخصیت کو علماء اہل حدیث میں فاتح قادیان کا لقب ملا وہ مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔ انھوں نے مرزا صاحب اور ان کی جماعت کو لوہے کے چنے چبوا دیے۔ اپنی زندگی ان کے تعاقب میں گزار دی۔ ان کی بدولت قادیانی جماعت کا پھیلاؤ رک گیا۔ مرزا صاحب نے تنگ آکر انھیں خط لکھا کہ میں نے آپ سے بہت دکھ اٹھایا ہے اور صبر کرتا رہا ہوں۔ اگر میں کذاب و مفتری ہوں جیسا کہ آپ لکھتے ہیں تو آپ کی زندگی میں ہلاک ہو جاؤں گا، ورنہ آپ سنت اللہ کے

مطابق مکذبین کی سزا سے نہیں بچیں گے۔ خدا آپ کو نابود کرے گا۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مفسد و کذاب کو صادق کی زندگی میں اٹھا لے۔

خط مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء

اس خط کے ایک سال ایک ماہ اور دس دن بعد مرزا صاحب لاہور میں اپنے میزبان کے بیت الخلا میں دم توڑ گئے۔ مولانا ثناء اللہ نے ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو سرگودھا میں رحلت فرمائی۔ وہ مرزا صاحب کے بعد ۴۰ سال تک زندہ رہے۔ ان کے علاوہ مولانا عبداللہ معمار، مولانا محمد شریف گھڑیالوی، مولانا عبدالرحیم لکھو والے، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد اسمٰعیل گوجرانوالہ، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عبدالقادر روپڑی اور حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری وغیرہ نے قادیانی امت کو ہر دینی محاذ پر خوار کیا۔ اس سلسلہ میں غزنوی خاندان نے عظیم خدمات انجام دیں۔ مولانا داؤد غزنوی جو جماعت اہلِ حدیث کے امیر اور مجلس احرار اسلام کے سیکرٹری رہے انہوں نے اس محاذ پر بے نظیر کام کیا۔ فی الجملہ تحریک ختم نبوت کے اس آخری دور تک جب مرزائی مسلمانوں سے الگ کیے گئے اور آئینی اقلیت قرار پا گئے، علمائے اہلِ حدیث قادیانیت کے تعاقب میں پیش پیش رہے اور اس عنوان سے اتحاد بین المسلمین میں قابل قدر حصہ لیا۔

مرزا صاحب نے اپنے الہامات وغیرہ لکھنے کی غرض سے ایک برہمن کا بچہ شام لال بعمر ۱۲ سال ملازم رکھا تھا۔ وہ ناگری اور فارسی رسم الخط دونوں سے واقف تھا اور مرزا صاحب کے الہامات پر دستخط کرتا (ملاحظہ ہو البشریٰ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۰۰) وہ کئی سال تک ملازم رہا۔ مرزا صاحب کے عم زاد بھائی مرزا امام دین نے اپنے اشتہار "صداقت کا اظہار" مطبوعہ ۲۴ اگست ۱۸۸۸ء میں انکشاف کیا کہ شام لال ایک سیدھا بھولا لڑکا ہے اور سو تک گنتی بھی نہیں جانتا، لیکن علماء نے مرزا صاحب سے ذلیل گالیاں کھائیں، خود اپنی زبان کبھی گندی نہ کی، حالانکہ وہ عمومی شہرت کے مطابق مرزا صاحب کے علمی ذوق کی نشاندہی کر سکتے تھے۔

مولانا غلام دستگیر قصوری ان دنوں پنجاب کے علماء دین میں ایک ممتاز شخصیت تھے۔ مرزا صاحب اپنے گھیراؤ سے گھبرا گئے، تو علماء کو مناظرہ کا چیلنج کیا۔ مولانا غلام دستگیر قصوری نے مناظرہ پر صاد کیا۔ ۵ دسمبر ۱۸۹۲ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔ مقام مناظرہ موچی دروازہ کے اندر مسجد چینیاں والی طے پایا۔ مگر مرزا صاحب وعدہ کے باوجود غائب رہے۔ ایک دوسری تاریخ ۱۵ جون ۱۸۹۳ء مقرر ہوئی۔ مرزا صاحب نے مباحثہ کے لیے حکیم نور الدین اور مولوی محمد احسن کو مقرر کیا، لیکن وہ بھی حاضر نہ ہوسکے۔ اس قسم کا ٹال مٹول اور فرار ہی مرزا صاحب کی جماعتی سیرت کا خاصہ تھا۔

مرزا صاحب نے اپنے مجدد ہونے کا راگ چھیڑ کر لدھیانہ کا سفر کیا تو وہاں بعض افراد نے آپ کے استقبال کا فیصلہ کیا۔ اس غرض سے ایک میٹنگ ہوئی جس میں مرزا صاحب کے محاسن بیان کیے گئے۔ اس پر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے والد کے چچا مولوی عبداللہ نے کھڑے ہو کر بیان کیا کہ مرزا انتہا درجہ کا ملحد و زندیق ہے بعض ساتھیوں کو ان الفاظ میں تیزی محسوس ہوئی حتیٰ کہ مولانا حبیب الرحمٰن کے دادا جان نے بھی بھائی سے اتفاق نہ کیا لیکن مولوی عبداللہ نے استخارہ کیا، تو اپنی رائے کو درست پایا۔ آخر براہین احمدیہ کے غائر مطالعہ سے مرزا صاحب کے ملحد و زندیق ہونے کا اعلان کر دیا۔

چونکہ مرزا صاحب کا دعویٰ نبوت عوام و خواص کی نظروں سے اوجھل تھا اور وہ انہیں آریوں اور عیسائیوں کے مقابلہ میں ایک مناظر کی حیثیت سے جانتے پہچانتے تھے، اس لیے ابتداً مرزا صاحب کی تکفیر سے متعلق بعض جید علماء کو تردد تھا۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا محمد یعقوب نے فتویٰ دینے یا فتویٰ پر صاد کرنے سے گریز کیا۔ لیکن جب اُن کے سامنے مرزا صاحب کی تمام تحریریں رکھی گئیں تو انہوں نے مرزا صاحب کے خارج از اسلام ہونے سے اتفاق کیا اور عامۃ المسلمین میں مرزا صاحب کے تعاقب کی فضا پیدا کی۔ اسی دوران ہی میں حرمین شریفین کے علماء نے مرزا صاحب کے کفر کی تصدیق کی۔ مکہ معظمہ کے مفتی اعظم رئیس القضاۃ شیخ عبداللہ بن حسن نے مرزا صاحب کے کفر کا اعلان کرتے ہوئے اُن کے پیروؤں کو بھی اسلام سے خارج قرار دیا۔ اس کے بعد مصر، شام اور فلسطین کے مفتیان عظام نے بھی مرزا کے کفر پر فتویٰ دیا۔ ان فتووں کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر کا ہر صوبہ مرزا صاحب کے دعویٰ سے باخبر ہو گیا اور قادیانیت کو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف گستاخانہ بغاوت قرار دیا گیا۔ یہ زمانہ تھا جب وقت کے تمام بڑے بڑے علماء نے مرزا صاحب کی خبر لی اور اپنے اپنے دوائر میں مسلمانوں کو اُن کے کفر سے خبردار کیا۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا شمس الحق عظیم آبادی، مولوی محمد صدیق دیوبندی، مولوی محمد اعظم لکھنوی، مولانا محمد حسن کانپوری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالغفار لکھنوی، مولانا عبدالمجید عمر پوری، مولانا احمد حسن دہلوی، مولانا عبدالحق حقانی دہلوی، مولانا محمد حسین بنارسی، مولانا محمد عبداللہ غازی پوری۔ مولانا محمد یعقوب رحیم آبادی، مولانا محمد ادریس مجھانوی، مولانا غلام محمد بگوی خطیب شاہی مسجد لاہور، مولانا غلام احمد مدرسہ نعمانیہ لاہور، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی اورینٹل کالج لاہور، مولانا رحیم بخش معتمد انجمن حمایت اسلام لاہور، مولانا احمد علی مدرسہ اسلامیہ بٹالہ، مولانا محمد اسحٰق مفتی پٹیالہ، مولانا محمد حسین فیضی ضلع جہلم، حافظ عبدالمنان وزیرآبادی

مولانا عبدالقادر شاہ نوری، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا عزیز الرحمن دیوبندی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا احتشام الدین مرادآبادی، مولانا فقیر اللہ شاہ پوری، مولانا محمد امان اللہ دہلوی، مولانا محمد اسمٰعیل علی گڑھی، مولانا محمد ایوب ساکن کول، مولانا دہیست علی نمازی پوری، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالغفور غزنوی مولانا عبدالحق غزنوی، سید ظہور حسین قادری سجادہ نشین بٹالہ، مولانا عبدالرحمن لکھوکی، سید اکبر شاہ حنفی پشاوری، مولانا محمد ایوب حنفی پشاوری، مولوی رحمت اللہ پشاوری، مولوی تاج الدین گجراتی، مولوی ہدایت اللہ راولپنڈی، مولوی امام دین کیمبرپوری، مولوی اشرف علی سلطانپوری، مولوی عبدالقادر بیگوال، مولوی عبدالرحمن دیوبندی اور مولوی گل محمد خاں دیوبندی اپنے زمانے میں بر عظیم کے نامور علما رہتے تھے۔ تمام ملک میں مسلمانوں کے اجتماعی مزاج کی دینی جمعیت پر ان کا عظیم اثر تھا۔ ان سب نے مرزا صاحب کے ارتداد و کفر کی اس طرح پھاڑ کی کہ مرزا صاحب ناکہ کا آنسو ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے آریوں اور عیسائیوں سے مناظروں کا ڈھونگ رچا کر جو وقار حاصل کیا تھا، وہ خاک میں مل گیا۔ ان کی بدولت انگریزوں کی منشا کامیاب ہو گئی، لیکن وہ خود مسلمانوں میں ہر طرح مغضوب و متروک ہو گئے۔ علما ان کا پیچھا کرتے اور وہ ان سے بھاگتے۔ اس زمانے میں مرزا صاحب کا شر کل تعاقب ہی کیا جا سکتا تھا۔ اولاً مسلمان مرزا صاحب کے استعماری ظہور سے ناواقف تھے۔ ثانیاً برطانوی استبداد اس درجہ بے رحم تھا کہ مرزا صاحب کا سیاسی احتساب سخت مشکل تھا۔ مولانا محمد حسین بٹالوی نے انگریزوں کے استبداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے تنسیخ جہاد کی اساس قائم کی۔ پھر مرزا صاحب کا مقابلہ کیا۔ مرزا صاحب کا سب سے بڑا ہتھیار یہ تھا کہ وہ برطانوی سلطنت سے گن گاتے اور اپنے مخالفوں پر باغی ہونے کا الزام دھرتے تھے۔ ممکن تھا مرزا صاحب پنجابی مسلمانوں کے خام عقائد میں اپنے لیے جگہ پیدا کر لیتے اور اس طرح ایک طاقتور قادیانی اُمت وجود میں آتی، لیکن علما کی زبردست مزاحمت اور طاقتور احتساب کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا صاحب محدود سے محدود ہو کر رہ گئے۔ ان کی زندگی میں پیروکار ڈیڑھ دو ہزار سے زائد نہ ہو سکے۔ میرزا بشیر الدین محمود کے زمانۂ خلافت میں تعداد اس لیے بڑھی کہ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے قادیانی اُمت سے خلافت عثمانیہ کے خلاف کام لے کر فائدہ اُٹھایا۔ اس کے صلے میں قادیانیوں کو نہ صرف یہ کہ مختلف مادی فوائد حاصل ہوئے بلکہ ان کے لیے سرکاری ملازمتوں کا دروازہ کھل گیا۔ جو لوگ دین کے معاملہ میں کمزور تھے، وہ ان فوائد سے متمتع ہونے کے لیے قادیانی ہو گئے۔ اس طرح قادیانی چند ہزار سے چند لاکھ ہو گئے۔ ایک عام اندازے کے مطابق دو تین لاکھ کے درمیان تھے۔ دوسرا سبب افزائش نسل کا تھا۔ ہر خاندان میں اولاد کی پیدائش سے نصف صدی کے اندر اندر تعداد بڑھتی چلی گئی، لیکن مغربی پاکستان

مسلمانوں کی رواداری اور بے خبری کے باوجود قادیانیت کے لیے مسلمانوں میں کوئی جگہ نہ رہی۔ بعض فیاض مسلمانوں کے سوا ہر کہ و مہ کے دل پر نقش ہو گیا کہ مرزا غلام احمد کی متابعت اسلام کے منافی ہے۔ اور کوئی مسلمان قادیانی بننے کے بعد مسلمان نہیں رہتا۔ غرض برِ عظیم کے ہر صوبے میں مرزا صاحب کے خلاف دینی ولولہ پیدا ہو گیا۔ جن پٹھانوں میں سے رُوحِ جہاد سلب کرنے کے لیے مرزا صاحب کو تخلیق کیا گیا ان کے علاقوں میں قادیانیت سنگساری کا جرم قرار پائی۔ سرحد کے دو چار باشندوں ہی نے قادیانیت قبول کی۔ ان کے علاوہ دوسرے قادیانی پنجابی الاصل تھے اور انہیں انگریزوں نے اپنے مقاصد کی آبیاری و کارگزاری کے لیے سرحد و بلوچستان میں بسایا تھا۔ پنجاب کے ان اضلاع میں جو انگریزوں کے لیے سپاہی پیدا کرتے تھے۔ قادیانیت کی آبیاری کی گئی اور عسکری اضلاع میں ایک آدھ گاؤں ان کیلئے مخصوص کیا گیا۔ لیکن پنجاب کا سیاسی ہیں فرد ہونے کے باوجود مرزائیت کے لیے تنگ ہو گیا۔ تمام مساجد میں مرزائیت کے خلاف جمعہ کو وعظ ہوتے۔ کسی مرزائی کے لیے مسلمانوں میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ پہلی جنگِ عظیم تک منبر و محراب کے یہی لیل و نہار رہے کہ علماء دینی تقاریر و خطبات میں مرزائیت کا محاسبہ کرتے اور عوام اس سے بچتے۔ کوئی جگہ تھی تو مغربیت میں ڈھلے ہوئے سیاسی مسلمانوں کا ایک گروہ تھا جو قرآن و حدیث سے نابلد ہونے کے باعث مرزائیت کو مسلمانوں کا ایک فرقہ خیال کرتا اور اس سے اختلاف کو منبر و محراب کی عادت مستمرہ گردانتا یا پھر ان کے مفادات کا ایک حصہ مرزائیت کے حلقہ میں تھا۔ اس زمانہ کے تمام دینی رسائل و جرائد میں مرزائیت کی پچھاڑ کی جاتی۔ ادھر علماء کے تمام حلقے اختلافِ فکر و نظر کے باوجود، مرزائیت کے مقابلہ میں متفق الرائے تھے۔ اس زمانہ میں مرزائیت سے متعلق علماء کی جانب سے جو کتابیں، رسالے کتابچے اور اشتہارات شائع ہوتے ان کی تعداد "احرار" کی سروے رپورٹ کے مطابق ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔

مرزا صاحب کا انتقال برانڈرتھ روڈ لاہور میں ایک معتقد کے ہاں ہوا۔ لیکن ان کا جنازہ قادیان لے جانا مشکل ہو گیا۔ مسلمانوں نے زبردست مظاہرہ کیا۔ بعض منچلوں نے جھنگڑا ڈالا کہ ختمِ نبوت کا ایک سارق بیت الخلاء میں نقدِ جان ہار گیا۔ لوگوں نے ریلوے سٹیشن تک میت پر گوڑا کرکٹ پھینکا۔ یہ تمام مظاہرہ اس امر کی دلیل تھا کہ مرزا صاحب کے لیے مسلمانوں کے ذہن میں کوئی جگہ نہیں۔ وہ انہیں کافر و مرتد تصور کرتے اور ان کے دعوائے نبوت کو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم المرسلینی کے خلاف جارحانہ اقدام سمجھتے ہیں۔ ان مظاہر سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا صاحب اپنی زندگی ہی میں ملتِ اسلامیہ کے دشمن ہو چکے تھے اور ان کے لیے ہندوستانی قوم میں مذہباً کوئی جگہ نہ تھی۔ ادھر مسلمانوں کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ آئمہ تلبیس میں سے ہیں۔

انگریزوں نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد قادیانی رہنماؤں کی ضرورت سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور میرزائیوں کو ایک سیاسی ضرورت کا پیش رو قادیانی امت کو مہرے کی حیثیت سے اپنی شطرنج پر دیکھنا چاہتے تھے؛ چونکہ میرزا صاحب انہی کی تخلیق تھے۔ اس لیے اس سلسلہ میں کوئی دقت نہ تھی۔ سوال صرف استعمال کا تھا۔ میرزا بشیر الدین سیاسی ضرورت کا صحیح مہرہ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی جماعت کا مذہبی پھیلاؤ ختم ہو چکا ہے۔ اب "احمدی" ہونے والے لوگ اغراض کے تابع ہیں۔ کوئی "نادار، ملازم" مسلمان احمدی ہوتا، تو اس کے پس منظر میں کئی چیزیں ہوتیں۔ مثلاً دینی افلاس، کسی قادیانی زمیندار کا رسوخ، بعض ملازمانہ مجبوریاں اور اس سلسلہ میں کوئی نہ کوئی ترغیب و تحریص۔ کسی ایسے شخص کے احمدی ہونے کا سوال ہی نہ تھا جو دین کی تلاش میں ہو یا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتا ہو ـــــ شکار ہونے والے ناخواندہ ہوتے یا ضرورت مند اور وہ بھی لاکھوں میں دو چار۔ میرزا بشیر الدین نے مذہبی روپ میں ایک سیاسی شاطر کی تربیت حاصل کی اور اپنے طائفے کو بعض عصبیتوں کے تابع اس طرح منظم کیا کہ پنجابی مسلمان ان کی معرفت استعماری ہتھکنڈوں کا شکار ہوتے چلے گئے۔ اور برعظیم کی فرقہ وار سیاست میں برطانوی خواہشیں راہ پا گئیں۔ پنجاب ان خواہشوں کا محور تھا۔ اب سوال یہ نہ تھا کہ احمدی مسلمانوں کی آواز ہیں یا انہیں ہندوستانی مسلمانوں میں کوئی رسوخ حاصل ہے۔ سوال یہ تھا کہ احمدی برطانیہ کی سیاسی ضرورتوں کا ایک عضو تھے؛ اس عضو کی حیثیت سے وہ کسی نہ کسی خانے میں کام آسکتے تھے۔ میرزا بشیر الدین نے اپنے تئیں سیاست پر سان چڑھایا اور بہت جلد اس دائرے میں مستحکم ہونا شروع کیا ـــ وہ خلیفہ ثانی تھے۔ انہوں نے چاہا کہ ان کے پیرو کار ایک فعال اقلیت ہو جائیں اور ایک منظم جماعت کی حیثیت سے انگریزوں کو اپنی اہمیت کا احساس دلائیں۔ انہیں کوئی سی خدمت بجا لانے میں عار نہ تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے متبعین میں اس عقیدہ کو راسخ کیا کہ وہ تمام مسلمان کافر ہیں جو میرزا غلام احمد پر ایمان نہیں لائے۔ ان کے بچوں تک کا جنازہ پڑھنا حرام ہے اور ان سے کوئی دینی یا معاشرتی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدہ نے مسلمان ریاستوں میں قادیانی امت کو برطانیہ کا صحیح جاسوس بنا دیا۔ اور وہ برطانوی اقتدار کی خدمات بجا لانے میں مستعد مخلص ہو گئی۔ اکثر قادیانی ہندوستان سے مسلمان ملکوں میں جاسوسی کے لیے جاتے۔ افغانستان نے دو ایک کو سنگسار کیا۔ ادھر برطانوی خوشنودی کے لیے اس اعلان کا حوصلہ صرف قادیانی ہی کر سکتے تھے کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی چھاتیوں کا دودھ خشک ہو چکا ہے اور اب قادیان ارضِ حرم ہے۔

اس اساسی فضا نے قادیانی امت کو انگریزوں کا بہترین جاسوس بنا دیا۔ اسی باعث قادیانی اسلامی ملکوں میں اپنا جال بچھانے میں کوئی سی دشواری محسوس نہ کرتے۔ چنانچہ پہلی جنگِ عظیم چھڑنے سے قبل اسلامی

ملکوں میں مرزائی جاسوس مقرر کیے گئے۔ وہ برطانوی اشارے پر کام کرتے اور معلومات کے حصول میں انگریزی حکومت کے مددگار رہتے۔ ان سے سکاٹ لینڈ یارڈ کے عہدیدار کئی ایک کام لیتے؛ چنانچہ عربوں کو ترکوں سے بدظن کرنے کے لیے جو لٹریچر تقسیم ہوتا رہا۔ اس کے مرتب و منتظم قادیانی تھے۔ انہوں نے عرب ریاستوں میں عوام کو بھڑکا کر ترکوں کو زچ کرایا اور خلافت عثمانیہ کے خلاف اس طرز کا ایندھن جمع کیا کہ جزیرۃ العرب میں آگ کا طوفان پھیل گیا۔

مرزا بشیرالدین نے خلافت عثمانیہ کے سقوط اور جزیرۃ العرب میں انگریزوں کے داخلہ کی خوشی میں اپنے مریدوں کو چراغاں کرنے کا حکم دیا۔ قادیان کو بقعۂ نور بنا دیا گیا۔ اس کا مقصد ایک تو فی الواقعہ مسرت و وفاداری کا اظہار تھا ۔۔۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ مرزا بشیرالدین محمود اس طرح انگریزوں کو بتانا چاہتے تھے کہ ان کی اُمت برطانوی سلطنت سے کہاں تک مخلص ہے اور وہ کسی حالت میں بھی مسلمانوں کے ساتھ نہیں۔ جنگ عظیم ختم ہوگئی تو بعض عرب ملکوں مثلاً حجاز، عراق، شام، فلسطین وغیرہ میں مرزائیوں نے برطانوی سرکار کی خفیہ سے خفیہ خدمات انجام دیں۔ ان کا روپ مذہبی تھا لیکن ان کے مشن سیاسی تھے۔ وہ ان ممالک میں برطانوی مقاصد کے بہترین آلۂ کار تھے۔ ترکی میں انگریزوں کی ناکامی کو مصطفیٰ کمال نے صدمہ پہنچایا، تو وہ ان کے جان لیوا ہوگئے۔ اس غرض سے انہوں نے ہندوستان سے ایک نوجوان مصطفیٰ صغیر حاصل کیا کہ وہ ترکی میں رہ کر مصطفیٰ کمال کو ہلاک کرے گا۔ مصطفیٰ صغیر اپنے کام سے پہلے ہی پکڑا گیا اور سزائے موت پا گیا۔ لیکن مصطفیٰ صغیر اندر خانہ قادیانی العقیدہ تھا اور اس کو مرزا بشیرالدین محمود نے منتخب کرکے برطانوی سرکار کے حوالے کیا تھا۔ مرزا بشیرالدین کے اعمال و حرکات کے باعث مرزائی امت کے سیاسی خدوخال بتدریج مسلمانوں کی نگاہ میں آچکے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار میں اس رخ سے محاسبہ شروع کر دیا تھا۔ لیکن ہنوز تک قادیانی امت کا عوامی اعتبار سے مسلمانوں میں ربط تھا، ضرور تھا، مگر اس کے سیاسی کردار کی احتمالی مضرتوں سے مسلمان غافل تھے۔ اس کا شاذ ہی نوٹس لیا جاتا۔ قادیانی امت نے تحریک خلافت کے بعد فرقہ وارانہ مسئلہ میں تلخیاں پیدا کیں۔ چوہدری سر ظفر اللہ خاں مسلم لیگ کی صدارت تک پہنچے، پھر مسلمانوں کے نمائندہ ہوکر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں چلے گئے اور اپنی جماعت کی تبلیغ و تقویت کا باعث ہوئے۔ ان پندرہ برس میں مرزائی امت نے کس کس رخ سے برطانوی اقتدار کی خدمات کا فرض ادا کیا۔ اس کا اندازہ تاریخ احمدیت کی آٹھ جلدوں کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے اور ظفر اللہ خاں کی سوانح عمری "تحدیث نعمت" سے بھی بہت سی کڑیاں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ آئندہ ابواب کے عنوان سیاسی جائزے میں اس کی تفصیلات آئیں گی۔ مختصراً یہ کہ مرزائی دوسرے تمام مسلمانوں کو عقیدۃً اسلام سے خارج

بلکہ ان کے ساتھ معاشرتی ارتباط قائم کرنے سے پرہیز کرتے تھے لیکن مسلمانوں کے سیاسی حقوق سے کاملاً متمتع ہوتے اور اپنی عددی اقلیت کا غلبہ چاہتے تھے۔ خود مسلمانوں سے اصولاً الگ رہتے لیکن مسلمان شرائط کا مطالبہ کرتے تو اس سے بگڑتے کیونکہ اس طرح ان کا سیاسی وجود بے اعتبار ہو جاتا۔ وہ عوامی اعتبار سے کوئی سی طاقت نہ رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کی عوامی تحریک، احرار کی تحریک اور علامہ اقبال کے علمی محاسبہ نے میرزائیت کے چہرے سے نقاب اٹھا دی، اور برہمن شکار ہو گئی کہ ان کا وجود ہی استعماری ضرورتوں کی پیداوار ہے لیکن آزادی کے پہلے سولہ سترہ برس میں بھی مسلمانوں کا شعار یہی رہا کہ میرزائی امت کے سیاسی عزائم کا شرعی ہتھیاروں سے مقابلہ کرتے اور ختم نبوت کے مسئلہ سے انہیں زچ کرتے تھے۔

ادھر آزادی سے پہلے برعظیم میں مسلمانوں کے وجود کا مسئلہ قومی اعتبار سے اس نہج پر تھا کہ پاکستان کی تحریک نے میرزائی امت کے سیاسی احتساب کو ٹال رکھا تھا۔ تب مسلمانوں کے سامنے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی حاصل کرنے کا سوال تھا۔ پاکستان کی جدوجہد کا دھارا اس طرح بہہ رہا تھا کہ مسلمان اس مسئلہ کو تحریک بنانے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ ایک بڑی چیز یہ تھی کہ میرزائیت کا محاسبہ احرار سے مخصوص و منسوب ہو چکا تھا۔ احرار پاکستان کی تحریک میں شامل نہ تھے، مسلمان ان سے ناراض تھے۔ اس ناراضی سے فائدہ قادیانی امت نے اٹھایا لیکن یہ کوئی دیرپا چیز نہ تھی۔ قادیانی ایک خاص دور تک اپنے تئیں چھپا سکتے تھے۔ ہمیشہ کے لیے نہیں۔ ایک سیاسی استحصال اور ایک سیاسی ضرورت نے انہیں سہارا دیا، لیکن وہ سہارا اقتدار کی عصا تھا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ قادیانی امت کو اپنے سے خارج سمجھتے تھے اور یہ فضا علماء کے دینی احتساب سے پیدا ہو کر مسلمانوں کے اذہان کا جزو لاینفک ہو چکی تھی اور اس فضا کا توڑنا یا توڑنا کسی شخصیت یا ضرورت کے بس میں نہ تھا۔

سیدنا مہر علیشاہؒ کی ضربِ یداللّٰہی

پنجاب اُن دنوں علماء سے کہیں زیادہ مشائخ کا صوبہ تھا۔ مغربی اضلاع کے مسلمان زیادہ تر مشائخ ہی کے گرویدہ تھے اور صوبہ کا بڑا حصہ تعلیمات کے مقابلہ میں کرامات کا شیدائی تھا۔ مرزا غلام احمد صوبہ کے بھولے بھالے مسلمانوں کو آسانی سے شکار کر سکتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے الہامات کا کھڑاگ رچا لیا اور کئی اضلاع میں ان کا چرچا تھا۔ اکثر مشائخ اور ان کے جانشینوں نے اُن کی طرف نگاہ ہی کی اور مرزا صاحب کی حرکات کا نوٹس لیا۔

حضرت پیر مہر علیشاہؒ بیسویں صدی کے آغاز میں مشائخ پنجاب کے حلقہ کی سب سے بڑی رُوحانی شخصیت تھے۔ آپ ۱۳۱۷ھ میں حج کے لیے تشریف لے گئے، تو آپ نے دیارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی علیہ الرحمۃ نے اپنے کشف کی بنا پر آپ سے کہا کہ:

”آپ کے ہاں ایک بہت بڑا فتنہ ظاہر ہونے والا ہے۔ اُس کا سدِباب آپ کی ذات سے متعلق ہے۔ آپ یہاں خاموش بھی بیٹھے رہے تو بھی ملک کے علماء اس فتنہ کی رو سے محفوظ رہیں گے اور عامۃ المسلمین اس کی دستبرد سے بچ جائیں گے۔“ (ملفوظات طیبہ مرتبہ فقیر محمد مولوی عبدالحق)

حضرت قبلہ واپس آ گئے تو مکاشفات و مشاہدات کے ذریعہ آپ کو معلوم ہوا کہ فتنہ مذکور مرزا غلام احمد اور ان کے حواری ہیں۔ سیدنا مہر علیشاہؒ صاحب کے ملفوظات میں درج ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ

عالم دنیا میں فرمایا :

"غلام احمد میری احادیث کو اپنی تقسیم سے کترتا ہے۔ تم خاموش بیٹھے ہو، اس کا تعاقب و تدارک کرو"۔

مرزا غلام احمد نے ۱۸۹۱ء میں اپنے مسیح موعود ہونے کا اعلان کیا تو علماء اُن کے پیچھے جھاڑ کے پڑ گئے۔ مشائخ کی نگاہ میں مرزا غلام احمد ایک مناظر تھا، جو بظاہر آریوں اور عیسائیوں سے مناظرے کرتا۔ مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت سے پہلے کئی علماء اس کے جوشِ مناظرہ کی حمایت کرتے اور ان کی تحریروں پر تحسین کرتے تھے۔ مولانا محمد حسین بٹالوی نے اپنے رسالہ "اشاعت السنہ" میں براہین احمدیہ کو اس صدی کا شاہکار قرار دے کر مرزا صاحب کو بے نظیر عالم دین اور صاحب کشف و کرامات لکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید نے بھی مرزا صاحب کے مناظرانہ جذبہ کو سراہا لیکن جونہی مرزا صاحب نے مسیح موعود ہونے کا اعلان کیا، تو اس کا چہرہ سامنے آ گیا۔ پچھلے باب میں عرض کیا ہے مولانا محمد حسین بٹالوی سینہ سپر ہو گئے اور مرزا صاحب کی چپقلش شروع کی۔ سید راس مسعود نے اپنے والد کے جو خطوط جمع کیے ان میں ۲۶۵ صفحہ پر ایک خط ہے جس میں سرسید لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب کی تصانیف اس قسم کی ہیں جیسا ان کا الہام نہ دین کے کام کی نہ دنیا کے کام کی۔ بزرگان طریقت ابھی اس فتنہ سے آگاہ نہ تھے۔ مثلاً ریاست بہاولپور میں چاچڑاں کے مشہور بزرگ اور صوفی شاعر خواجہ غلام فریدؒ نے مرزا صاحب کے متعلق حسن ظن قائم رکھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ شخص حمایت دین میں کمربستہ ہے۔ علماء تمام مذاہب باطلہ کو چھوڑ کر اس نیک آدمی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں حالانکہ وہ اہل سنت والجماعت ہے اور صراط مستقیم پر ہے"۔ (ملاحظہ ہو اشارات فریدی) لیکن خواجہ صاحب کے پاس جونہی مرزا صاحب کی نئی کتابیں پہنچیں جن میں ان کے ملہمانہ ادعا اور ظلی و بروزی نبوت کی آواز کے علاوہ مسیح موعود ہونے کے دعویٰ کا اندراج تھا تو خواجہ صاحب نے مرزا صاحب سے بیزاری کا اظہار کیا اور علماء کی تائید کی۔ مرزا صاحب نے اپنی کتاب انجام آتھم مطبوعہ ۱۸۹۷ء میں حضرت خواجہ صاحبؒ کو اپنے مکذبین و منکرین کی فہرست میں شامل کیا۔ تاہم قادیانی مبلغین عوام کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے اور ان کے سامنے خواجہ صاحب کی پہلی عبارت کا حوالہ دے کر زور دیتے کہ ملک کے اتنے بڑے پیر بھی مرزا صاحب کی تحریری بیعت میں شامل ہیں۔ اس کا سادہ دل سامعین پر اثر ہوتا۔ عوام میں گمراہی کے پھیلاؤ کا اندیشہ بڑھا تو مولانا غلام محمد شیخ الجامعہ بہاولپور جو سیدنا مہر علی شاہؒ کے مریدین میں سے تھے کی تحریک پر ملک کے علماء و مشائخ کا بہت بڑا اجتماع خواجہ صاحب کے مزار پر منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں نہ صرف قادیانیت پر ضرب لگائی گئی بلکہ مرزا صاحب کا پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ مرزا صاحب اور ان کے

حواریوں کو یقین ہو گیا کہ علماء انہیں چاروں شانے چت کر رہے ہیں۔ تو انہوں نے بعض مشہور مشائخ کے نام سے اپنی تائید میں بیانات وضع کیے جن میں مولانا عبداللہ غزنوی رئیس اہلحدیث بھی شامل تھے۔ اسی طرح سیدنا مہر علی شاہؒ سے بھی ایک خانہ ساز جملہ منسوب کیا کہ آپ نے مرزا صاحب کے ایک مرید سے کہا کہ انہیں قادیان کی طرف سے عشق الٰہی کی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔ سیدنا مہر علی شاہؒ نے اپنے حجرے میں آنکھیں بند کیے بحالت بیداری دیکھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشہد کی حالت میں جلوس فرما ہیں حضور سے چار بالشت کے فاصلے پر پیر صاحب باادب بیٹھے ہیں لیکن مرزا غلام احمد اس جگہ سے دور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا ہے۔ حضرت پیر صاحبؒ قبلہ نے سیف چشتیائی میں دجال کی صورت سے متعلق اپنے بچپن کا ایک خواب لکھا ہے کہ وہ مرزا صاحب سے ہو بہو مشابہت رکھتا تھا۔ مرزا صاحب نے اپنے مسیح موعود ہونے سے متعلق علماء و مشائخ کو خطوط بھیجے، تو حضرت پیر صاحب قبلہؒ نے اردو میں "شمس الہدایت فی اثبات حیات المسیح" لکھ کر مرزا صاحب کا طلسم پاش پاش کیا۔ اس میں کتاب و سنت سے واضح فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود ہیں، وہ قیامت کے قریب زمین پر تشریف لائیں گے۔ مرزا صاحب کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ وہ وفات پا گئے اور مسیح موعود میں ہوں۔ اس کتاب سے قادیان میں تہلکہ مچ گیا اور تمام ملک کے حلقۂ علماء میں ان کے دعویٰ مسیحیت کی دھجیاں بکھر گئیں۔ حضرت قبلۂ عالم کی اس کتاب پر مولانا عبدالجبار غزنوی نے بے حد تحسین کی۔ مرزا صاحب کی حواس باختگی کا یہ عالم تھا کہ حضرت پیر صاحبؒ کے نام حکیم نور الدین سے ۲۰ فروری سنہ ۱۹۰۰ء کو خط لکھوایا جس میں بارہ سوالات اٹھائے لب لباب یہ تھا کہ "شمس الہدایت" میں آپ مولویوں اور منطقیوں کے رنگ میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اس میں صوفیوں کے مشرب کی ذرہ بھر جھلک نہیں۔ ان بارہ سوالوں کے جواب میں قبلہ پیر صاحب نے معرکہ آرا خط لکھا جو مولانا حافظ محمد غازی نے بصورت اشتہار شائع کر دیا۔ ملک بھر کے علماء و فضلاء اس خط کی عبارت پر عش عش کر اٹھے۔ مرزا صاحب کے معتقدین نے اس کا جواب دینے پر زور دیا، تو مرزا صاحب نے تنگ آ کر ۲۲ جولائی سنہ ۱۹۰۰ء کو ایک اشتہار کے ذریعے حضرت قبلہؒ کو عربی میں تفسیر نویسی کے مقابلے کا چیلنج کیا۔ اس اشتہار کا مضمون نہایت گستاخانہ تھا، جن چند لوگوں نے اس پر بطور گواہ دستخط کیے تھے۔ ان میں حکیم نور الدین مولوی محمد علی، نواب محمد علی مالیر کوٹلہ، غلام علی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جہلم اور بعض دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ اس اشتہار کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی شائع کیا گیا جو ضیاء الاسلام پریس قادیان میں چھپا اور ۲۰×۲۶ کے چودہ صفحات پر مشتمل حضرت قبلۂ عالم کو یہ اشتہار ۲۴ جولائی کی ڈاک سے ملا۔ آپ نے اسی روز جواب لکھوا کر اگلے روز راولپنڈی سے

بھجوایا اور مرزا صاحب کو بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیج دیا۔ اس جواب پر چند علماء نے بطور گواہ دستخط کیے۔ حضرت قبلۂ عالم نے اپنے اشتہار میں مرزا صاحب کے لاہور میں مباحثے کے لیے ۲۵ راگست کی تاریخ مقرر کی۔ حضرت قبلہ کی تائید میں پنجاب، سرحد اور دوسرے صوبوں کے بعض علماء و مشائخ نے بھی اپنے دستخطوں سے اشتہار جاری کیے کہ وہ ۲۵ راگست کو پیر صاحب قبلہ کے ہمراہ مباحثہ لاہور میں حاضر ہوں گے۔ مرزا صاحب تقریری مقابلے سے فرار کر گئے اور تحریری مباحثہ کی تجویز کی۔ حضرت قبلۂ عالم نے تحریری مباحثہ قبول کر لیا۔ ملک کے طول و عرض سے ہزاروں مسلمان لاہور پہنچ گئے۔ حضرت قبلہؒ کے سوانح حیات "مہر منیر" میں لکھا ہے کہ مسلمانانِ لاہور نے اپنی روایتی مہمان نوازی کا حق ادا کیا۔ استقبالیہ کمیٹیاں بن گئیں۔ سرائیں، مسجدیں، مدرسے اور لوگوں کے گھر مہمانوں سے بھر گئے۔ لاہور کے بازاروں میں عوام کے ٹھٹھ سے میلے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ تمام اسلامی فرقوں کے راہ نما ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ سنی، اہلِ حدیث اور اہلِ قرآن کے علاوہ لاہور اور سیالکوٹ کے شیعہ مجتہدین نے بھی اس محاذ حضرت قبلۂ عالم کو اپنا قائد تسلیم کرتے ہوئے ان کے نمائندہ ہونے کا اعلان کیا۔ حضرت قبلۂ عالم ۲۴ راگست کو گولڑہ سے لاہور پہنچے۔ آپ کے ہمراہ پچاس نامور علماء تھے۔ ان کے علاوہ پنجاب کے دوسرے تمام اضلاع سے مشائخ و علماء چلے آ رہے تھے۔ غرض پلیٹ فارم پر ہزاروں انسانوں کا اجتماع تھا۔ وہ جلوس نکالنا چاہتے تھے، مگر آپ نے پسند نہ فرمایا، لیکن ہجوم سے مصافحہ کرنے ہی میں کھڑے کھڑے دو گھنٹے صرف ہو گئے۔ آپ نے برکت علی محمڈن ہال اور اس سے ملحقہ عمارات میں قیام فرمایا، جہاں رات گئے تک عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہا۔ مباحثہ کے لیے شاہی مسجد کا انتخاب کیا گیا۔ مرزا صاحب کی حفاظت کے لیے پولیس نے زبردست انتظامات کر رکھے تھے، لیکن مسٹر مرزا صاحب کو نہ آنا تھا، نہ آئے، بلکہ عین وقت پر اعلان کر دیا کہ میں کسی قیمت پر لاہور آنے کو تیار نہیں۔ مولوی لوگ مجھے دعویٰ نبوت میں کاذب ثابت کرنے کے بجائے قتل کرانا چاہتے ہیں۔ مرزا صاحب کے اس اعلان سے خود قادیانی جماعت کو سخت مایوسی ہوئی۔ جو وفد مرزا صاحب کو لینے گیا تھا، اس کے بعض ارکان مرزا صاحب کی بیعت سے توبہ کر گئے۔ بعض مایوس ہو کر خانہ نشین ہو گئے، لیکن اس شکستِ فاش کے باوجود مرزا صاحب کے دو مریدوں محمد احسن اور عبدالکریم نے لاہور میں حضرت کی موجودگی کے باوجود اشتہار شائع کیے جن میں مرزا صاحب کی کامیابی کا مفروضہ جشن کیا اور مشہور کیا کہ پیر صاحب گولڑہ شریف نے امام آخر الزماں کے مقابلہ میں فرار کیا ہے۔ قادیانی امت کی اس ڈھٹائی سے لوگ سخت بیزار ہوئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ مرزا صاحب جھوٹ بول کر زندہ رہنا

چاہتے ہیں۔ انہی ایام میں قادیانی جماعت کے ایک وفد نے حضرت قبلۂ عالم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ مرزا صاحب سے مباہلہ کر لیں۔ ایک اندھے اور ایک لنگڑے کے حق میں مرزا صاحب دعا کرتے ہیں۔ دوسرے اندھے اور اپاہج کے حق میں آپ دعا کریں جس کی دعا سے اندھا اور لنگڑا ٹھیک ہو جائیں۔ وہ سچا ہے۔ اس طرح حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے گا۔ حضرت قبلۂ عالم نے جواب دیا کہ اگر مُردے بھی زندہ کرنے ہوں تو آ جاؤ۔ یہ جواب پا کر وفد چلا گیا۔ پھر کچھ پتہ نہ چلا کہ مرزا صاحب اور ان کے حواری کہاں ہیں؟ جب مرزا صاحب کی تعلّیاں بہت بڑھ گئیں، تو حضرت قبلہ صاحب نے اُن کی "ہمہ دانی" شوخیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے دو روحانی چیلنج کیے۔ ایک یہ کہ کاغذ پر قلم چھوڑ دو، سچا قلم خود بخود چلے گا۔ اور تفسیرِ قرآن لکھ دے گا۔ دوسرا یہ کہ جب شاہی مسجد میں آؤ۔ ہم دونوں اُس کے مینار پر چڑھ کر چھلانگ لگا دیتے ہیں، جو سچا ہوگا وہ بچ جائے گا، جو کاذب ہوگا، مر جائے گا۔ مرزا صاحب نے جواب میں اس طرح چپ سادھی گویا دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔

میرزا کے اس فرار کی اس روداد کو ۸۵ علماء اور ۱۲ رؤساء نے اپنے دستخطوں سے شائع کیا۔ ان دستخط کنندگان میں کرنل راجہ محمد عطاء اللہ خان سابق سفیر کابل، چوہدری محمد سلطان خان بار ایٹ لاء، مرزا محمد ظفر اللہ خان مجسٹریٹ درجہ اوّل لاہور، خلیفہ عماد الدین انسپکٹر مدارس، مرزا محمد ابراہیم قزلباش اور میاں الطاف حسین رئیس لاہور تھے۔ حضرت پیر قبلہ صاحب گولڑہ شریف واپس چلے گئے، تو مرزا صاحب نے اپنی افتادِ طبع کے مطابق ۲۸ اگست ۱۹۰۰ء کو ایک اور اشتہار شائع کیا۔ اس میں تحریری مقابلہ کا اعادہ کرتے ہوئے آئیں بائیں شائیں کی۔ ایک دوسرے اعلان میں کہا کہ وہ تفسیر فاتحہ لکھ رہے ہیں۔ پیر صاحب بھی تفسیر فاتحہ لکھیں۔ اس کے بعد اگر اہلِ علم قسم کھا کر اعلان کریں کہ پیر صاحب کی تفسیر میری تفسیر سے بہتر ہے، تو میں اپنی طرف سے پانچسو روپیہ بطور انعام پیش کروں گا۔ مرزا صاحب خلقتاً اس تعلّی بازی کے عادی تھے۔ اس اعلان کے ۷۰ دن بعد مرزا صاحب نے "اعجاز المسیح" کے نام سے سورۃ فاتحہ پر اپنی تفسیر شائع کی۔ تمام علماء و فضلاء اور عربی زبان کے اساتذہ اس لوچ نگاری پر حیران رہ گئے۔ مرزا صاحب کی تفسیر نہ صرف محاورۂ عربی سے محروم، لغوی اور نحوی اغلاط سے مملو اور مسروقہ عبارات سے پُر تھی، بلکہ خود غلط در غلط، املا غلط، انشا غلط کا پلندہ تھا۔ مرزا صاحب نے اس تفسیر میں لکھا کہ "یوم الدین" سے مراد مسیح موعود کا زمانہ ہے اور الحمد فی الاولیٰ والآخرہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس سے دو احمد مُراد ہیں۔ احمد اوّل حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور احمد دوم مرزا غلام احمد قادیانی ہیں۔ مرزا صاحب کے مرید محمد احسن امروہوی نے "شمس الہدایت" کے جواب میں "شمس بازغہ" لکھی۔

حضرت قبلہ عالم نے اعجاز المسیح اور شمس بازغہ کے رد میں سیف چشتیائی لکھی جو ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا پورا حظ تو حضرات علماء و فضلاء ہی اٹھا سکتے ہیں، لیکن اردو دان حضرات بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ کتاب کا حجم ۴۰۰ صفحات ہے۔ مولانا فضل حق پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور نے اس کتاب کے متعلق کہا تھا کہ یوں تو حضرت کے بہت سے کمالات بیان ہوتے ہیں، لیکن میں تو اس دماغ کا شیدائی ہوں جس سے سیف چشتیائی ظہور میں آئی ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں سیف چشتیائی کے متعلق لکھا ہے کہ حیات و موت عیسوی کی بحث میں سیف چشتیائی قابل مطالعہ ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام کے دیباچہ میں سیف چشتیائی کو مسئلہ حیات مسیح پر ایک بہترین تحریر قرار دیا ہے۔ لیکن مرزا صاحب نے لکھا کہ پیر صاحب گولڑہ شریف خبیث ہیں اور ان کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے نجس ہے۔ (معاذ اللہ)

مرزا صاحب گالیوں کے پیغمبر تھے۔ ان کے واہی شعور نفے۔ اپنے مخالف علماء کو گالی دینا اور انگریزی حکام سے ان کی مخبری کرنا کہ وہ سلطنت برطانیہ کے بدخواہ ہیں۔ حضرت قبلہ پیر صاحبؒ کی بدولت مرزا صاحب جمہور المسلمین میں رسوا ہوگئے اور مسلمانوں کے دلوں پر ان کی تکفیر نقش ہوگئی۔ یہ مرزا صاحب کے لیے ایک حادثہ عظیم تھا۔ وہ اب تک علماء کی مزاحمت کے باوجود مسلمانوں میں اپنے عقائد سے نقب لگا رہے تھے لیکن پیر صاحب قبلہ کی بدولت مسلمانوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ رہی۔ الا ان گھرانوں کے جو ان کے فریب کا شکار ہو چکے تھے یا حکومت کی ضرورتوں نے ان کے گرد انہیں جمع کر دیا تھا اور وہ اس طرح سرکاری فوائد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مرزا صاحب نے علماء و مشائخ کے خلاف بکنا شروع کیا۔ پیر صاحب کے خلاف ایک ہجویہ نظم لکھی۔ اس کے دو شعروں کا ترجمہ مولانا سید ابوالحسن ندوی نے اپنی کتاب "قادیانیت" کے صفحہ ۵۴ پر اعجاز احمدی صفحہ ۵۵ سے نقل کیا ہے۔ مرزا صاحبؒ نے لکھا ہے:

> "پس میں نے کہا کہ اے گولڑہ کی زمین تجھ پر لعنت، تو ملعونوں کے سبب ملعون ہوگئی۔ پس تو قیامت کو ہلاکت میں پڑے گی۔ اس فرومایہ نے کمینہ لوگوں کی طرح گالی سے بات کی ہے اور ہر ایک آدمی خصومت کے وقت آزمایا جاتا ہے۔"

مرزا صاحب کو گالی بکنے پر ٹوکا گیا تو ازالہ اوہام میں لکھا کہ قرآن مجید میں گالیاں بھری ہوئی ہیں۔

اس طرح مرزا صاحب کا حقیقی چہرہ لوگوں کے سامنے آگیا۔ ازالۂ اوہام ہی کے صفحہ ۶۰ پر لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ اذا زلزلت کے معنی غلط بتائے۔ لیکھرام کی موت سے متعلق ایک اشتہار میں لکھا کہ قرآن خدا کی کتاب اور میرے منہ کی باتیں ہیں۔ ازالہ ہی میں لکھا کہ انبیاء علیہم السلام جھوٹے ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۶۲۸، ۶۲۹) اسی کے صفحہ ۶۹۰ اور ۶۹۱ پر لکھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی بھی غلط نکلی۔ مزید فرمایا کہ ان کی اپنی تصنیف براہین احمدیہ خدا کا کلام ہے (صفحہ ۵۳۳) قرآن شریف میں جو معجزے ہیں وہ مسمریزم ہیں۔ (صفحہ ۳۰۶ تا ۳۰۸) مکہ، مدینہ اور قادیان کا نام قرآن شریف میں اعزاز کے ساتھ لکھا ہوا ہے (صفحہ ۷۶، ۷۷) قادیان کا بیت الفکر مثل حرم کعبہ ہے (صفحہ ۵۵۰) رسول اکرم خاتم النبیین والمرسلین نہیں ہیں (صفحہ ۶۶۳، ۶۷۳) قیامت نہیں ہوگی، تقدیر کوئی چیز نہیں (ازالۂ اوہام سرورق صفحہ دوم) عذاب قبر نہیں ہے (صفحہ ۳۵۳)

قبلہ پیر صاحب نے مرزا صاحب کے ان ملفوظات کو اشتہارات کے ذریعہ علماء و مشائخ تک پہنچا دیا۔ تمام لوگ جو مرزا صاحب سے حسن ظن رکھتے تھے، ان خرافات کو پڑھ کر ششدر رہ گئے اور انہیں یقین ہوگیا کہ مرزا صاحب انگریز کے سلسلہ کا ایک فریب ہے اور اس کے دعاوی اسلام کو مسمار کرنے کی ایک خوفناک تحریک ہیں۔

مرزا صاحب کو یقین ہوگیا کہ مسلمانوں میں اب ان کا چراغ نہیں جل سکتا، تو اپنے آخری حربے کی پناہ لی اور لکھا کہ پیر گولڑہ شریف ان کی زندگی ہی میں موت کا شکار ہو جائیں گے۔ لیکن مرزا صاحب اپنے مریدوں کے خاص حلقے میں اسی قسم کی تعلیاں ہانکا ہی کرتے تھے۔ ہوا یہ کہ مرزا صاحب ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو لاہور میں اپنے ایک معتقد کے بیت الخلاء میں دم توڑ گئے اور پیر صاحب قبلہ مرزا صاحب کی ظالمانہ لیکن ابلہانہ پیشگوئی کے باوجود مزید ۱۵ دن کم ۲۹ سال زندہ رہے۔ آپ کا وصال ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء کو ہوا۔ اس دوران میں قادیانی اپنے گھونگھے سے بند ہو چکے اور ان کے چہرے کی تمام نقابیں اتر چکی تھیں۔ حضرت مہاجر مکی علیہ الرحمۃ نے پیر صاحب قبلہ سے کہا تھا کہ آپ کے وہاں ہونے سے فتنہ سر نہیں اٹھا سکے گا۔ مرزا غلام احمد کو حضرت پیر صاحبؒ نے اڑنگے پر لاکر ایسی پٹخنی دی کہ مرزا صاحب اس کے بعد چت ہو کے رہ گئے۔ حتیٰ کہ پانچ چھ برس ہی میں اسہال کا شکار ہو کر

۱؎ مہر منیر حضرت سید مہر علی شاہؒ کے سوانح حیات ہیں۔ مؤلف ہیں مولانا فیض احمد صاحب فیض جامعہ غوثیہ گولڑہ شریف۔ کتاب کے صفحات ۶۰۴ ہیں۔ اس کے ۴۰ صفحات میں اسی معرکہ کی ساری تفصیلات درج ہیں۔

مرض الموت کی نذر ہو گئے۔ میرزائیت کی تبلیغ کا ہر دروازہ بند ہو گیا۔ قادیانی امت ساڑھے تین کروڑ پنجابی مسلمانوں
میں دو ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ نہ ہو سکی اور وہ بھی چالیس پینتالیس برس میں اس تعداد کو پہنچی۔ واضح رہے
کہ مرزائیوں نے مسلمانوں کے اس مطالبہ پر کبھی صاد نہیں کیا کہ اپنی مردم شماری کرائیں۔ کیونکہ اس طرح ان کا پردہ
چاک ہوتا تھا۔ ادھر پیر صاحب قبلہ کے روحانی تصرفات تھے کہ میرزا صاحب کی موت کے بعد مرزائیت کا مذہبی
سانچہ یکسر ٹوٹ گیا۔ جن گنے چنے لوگوں نے قادیانیت قبول کی وہ اسلام سے نابلد، معاشی ضرورتوں کے تابع اور
عقل کی طاعون کا شکار تھے۔ میرزا صاحب کے فرزند میرزا بشیر الدین محمود نے یہی چلن اختیار کیا کہ اپنی جماعت کی
مذہبی چھاپ کو برقرار رکھا اور ایک ایسا سیاسی گروہ پیدا کیا جو برطانوی ضرورتوں کی چاکری میں منفرد ہو۔ میرزا محمود
نے اس غرض سے ان تمام مسلمانوں کو جو ان کے والد کو نبی نہیں مانتے تھے اپنے والد کی طرح کافر قرار دیا۔ اور ان
سے بطور مسلمان ہر ہمدردی ختم کر دی۔ پہلی جنگ عظیم میں مسلمانوں کی شکست پر چراغاں کیا۔ قادیانی امت نے
دنیائے اسلام میں برطانوی عملداری کی خاطر جاسوسی کے فرائض سنبھال لیے۔ ہندوستان کی اسلامی سیاسیات
میں انگریزوں کی منشا کے مطابق کام کیا۔ کئی ایک قادیانی جن کا میرزا بشیر الدین محمود کی مصلحتوں کے نزدیک
ہندوستان میں رہنا ضروری تھا، وہ سی۔ آئی۔ ڈی سے منسلک ہو گئے۔ میرزا بشیر الدین نے خلیفہ ثانی کی
حیثیت سے اپنا سفر ۱۹۱۴ء میں شروع کیا اور یہ جنگ عظیم اول کا زمانہ تھا۔ انگریزوں کو خلافت عثمانیہ
کو تہس نہس کرنے کے لیے جن مہروں کی ضرورت تھی، میرزا بشیر الدین محمود نے ایک مسلمان کے روپ میں اس
ضرورت کو پورا کیا۔ عربوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکانے میں ان کے دو سالوں، زین العابدین ولی اللہ اور میر حبیب
نے سکاٹ لینڈ یارڈ کے حسب ہدایت نہایت جانفشانی سے کام کیا۔

مولانا ظفر علی خاں حیدرآباد سے علیحدہ ہو کر اپنے گاؤں کرم آباد چلے گئے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی
رحلت کے بعد یکم جنوری ۱۹۱۱ء سے زمیندار کی ادارت سنبھالی، تو جنگ کے آغاز تک گاہے گاہے قادیانیت
سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ زمیندار جون ۱۹۱۸ء تک نکلتا رہا۔ پھر سر مائیکل اڈوائر نے بند کر دیا۔
مولانا نے ۱۹۱۶ء میں دہلی والوں کی بنیادوں پر ہفتہ وار ستارۂ صبح شائع کیا جو پہلے کرم آباد سے نکلتا تھا پھر
لاہور سے روزنامہ ہو گیا۔ مولانا نے قادیانیت کا محاسبہ اس سختی سے کیا کہ میرزا بشیر الدین محمود اور ان کے
زلہ خوار بدحواس ہو گئے۔ میرزا بشیر الدین محمود نے سر مائیکل اڈوائر کو خفیہ خط لکھا۔ وہ حیدرآباد دکن ہی سے مولانا
کا مخالف تھا۔ اس کے اشارے پا کر مولانا کو پنجاب چھوڑ کر دوبارہ حیدرآباد جانا پڑا۔ ستارۂ صبح بند ہو

ہوگیا۔ جنگ اوّل ختم ہوئی۔ تو ۱۹۲۰ء میں زمیندار کو دوبارہ ڈیکلریشن ملا اور قادیانی زمیندار کا مستقل موضوع ہوگئے۔ مولانا قید و بند سے باہر ہوتے تو قادیانیت کے شرعی اور ملّی قلعوں پر تابڑ توڑ حملے کرتے اور مرزائی امّت کے اعمال و افکار کی اس بُری طرح خبر لیتے کہ انہیں مسلمانوں کے گرد و پیش سانس لینا مشکل ہو جاتا۔ مولانا نے چند برسوں ہی میں قادیانی مسئلہ کو عوامی تحریک بنا دیا۔ ادھر احرار رہنما اپنی دینی افتاد کے باعث شروع ہی سے قادیانیت کے محاسب تھے۔ ادھر تحریک کشمیر ختم ہوئی۔ تو مجلس احرار نے قادیانی مسئلہ ہاتھ میں لے کر قادیانی امّت کو ایسا بے نقاب کیا کہ اس کا خواب دھرے کا دھرا رہ گیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ قادیانیت کے لیے گرزِ ابر دشکن تھے۔ علامہ اقبال نے مئی ۱۹۳۵ء میں قادیانیت کے قلعہ پر آخری ضرب لگائی۔ کہ علمی دنیا میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اور وہ افرنگ زدہ مسلمان جو مسئلہ ختم نبوت سے بے خبری کے باعث قادیانیوں سے مروّت برتتے تھے۔ ان سے قطعی طور پر بیزار ہو گئے۔ علامہ اقبال نے پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں قادیانیت پر جو کچھ لکھا وہ اس قدر جامع و مانع تھا کہ مولانا عبدالمجید سالک کے الفاظ میں حالانکہ وہ قادیانیوں کے بارے میں روادار تھے کسی سے ان علمی نکات کا جواب نہیں ہو سکا۔ (ذکر اقبال صـ۲۱۱) اور نہ اُن نکات کا جواب مرزائیت کے بس میں تھا۔

اور یہ سب کچھ پیر صاحب قبلہؒ کی زندگی میں ہوا۔ واضح رہے کہ حکومت نے مولانا ظفر علی خاں کے خلاف جب بغاوت کے الزام میں حضرو ضلع کیمل پور میں ایک تقریر کی بنا پر مقدمہ چلانے کا ارادہ کیا تو سید لال شاہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے استغاثہ کے گواہوں میں پیر صاحب قبلہ کا نام لکھوایا۔ لیکن پیر صاحب نے سرکار کی خواہش و اصرار کے باوجود گواہی دینے سے انکار کر دیا اور لعل شاہ سے کہا کہ آپ نے میرا نام دینے کی جراءت کیونکر کی؟ ظفر علی خاں حضور ختم المرسلینؐ کا شیدائی ہے اور قادیانیت کے حصار کو توڑ رہا ہے۔ آپ اسے قید کرانا چاہتے ہیں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے پہلی بیعت پیر صاحب قبلہ ہی کے دستِ مبارک پر کی۔ اور اپنے سیلِ سحر بیانی کی افزائش و دستگیری کے لیے دعا کی۔ پیر صاحب قبلہ نے آپ کو ایک ورد بتایا۔ جو آپ ہر تقریر سے پہلے زیر لب پڑھتے۔ پھر تقریر شروع کرتے اور مجمع ان کی مٹھی میں ہوتا۔

علامہ اقبال نے قادیانی مسئلہ پر علامہ انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ کے علاوہ حضرت پیر صاحب قدس سرہٗ کو بعض مسائل سے آشنائی کے لیے خطوط لکھے۔ قادیانی مرزا صاحب کی نبوت کے لیے جن علماء امت کے ملفوظات کا سہارا لیتے۔ ان میں محی الدین ابن عربی سرفہرست تھے۔ ابن عربی نے فتوحاتِ مکیہ میں لکھا ہے کہ ایک مسلمان ولی کے لیے بھی روحانی ارتقاء کے دوران میں ایسے تجربات ممکن ہیں جنہیں صرف شعورِ نبوت سے

مختص مانا جاتا ہے۔" لیکن "فتوحات مکیہ" میں کئی مقامات پر شیخ محی الدین ابن عربی نے تصریح فرمائی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص پر نبی یا رسول کا اطلاق ممکن ہی نہیں۔ ملاحظہ ہو سیف چشتیائی صفحہ ۲۰۳۔ لیکن مرزا صاحب تحریف کے عادی تھے جس کی تحریف سے قرآن وحدیث نہ بچ سکے۔ اس کے سامنے فتوحات مکیہ کیا چیز تھی۔ پیر صاحبؒ ابن عربی کے فلسفہ پر کامل نگاہ رکھتے اور اس سلسلہ میں اپنی نظیر آپ ہی تھے۔ علامہ اقبال نے قادیانیوں کی مذکورہ تکنیک کے بارے میں آپ سے استفادہ کے بعد اپنے بیان میں اس کی کاٹ کی۔ غرض پیر صاحبؒ نے جس سال وصال فرمایا تو اس وقت مسلمانوں نے قادیانیوں کو علانیہ الگ کر دیا تھا اور مختلف محاذوں پر تحریک ختم نبوت کے سرخیل مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور علامہ اقبال تھے۔ ہر سہ کو حضرت پیر مہر علی شاہ صاحبؒ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ فیض پہنچا تھا۔ حضرت پیر صاحبؒ نے مرزا غلام احمد کو پچھاڑا۔ ان ہر سہ اکابر نے اس کے بیٹے مرزا بشیر الدین کو اس طرح پچھاڑا کہ قادیانی اُمت نیم جاں بلب ہو گئی۔

سیدنا مہر علی شاہ قدس سرہ العزیز کے بعد آپ کے فرزند سید غلام محی الدین شاہ جانشین ہوئے۔ آپ نے تعلیم وتربیت کے علاوہ اپنے یگانۂ عصر والد قدس سرہ کی نگاہ سے فیض حاصل کیا اور ایقان وعرفان کی استغراقانہ منزلیں طے کی تھیں۔ آپ کو اعلیٰ حضرت نے بابوجی کہہ کر مخاطب کیا تو خانوادۂ طریقت میں اسی لقب سے معروف ہو گئے۔ راقم کو آپ سے سولہ برس نیاز رہا۔ آپ نے ۱۹۵۸ء میں حرمین شریفین سے واپسی پر راقم کے غریب خانہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا۔ اس دن سے آپ کے وصال جون ۱۹۷۴ء تک احقر کو آپ سے قربت کا شرف حاصل رہا۔ ہر چند قربت سے کشش کم ہو رہی ہے۔ لیکن آپ کا وجود فی الواقعہ معرفت حق کا خزینہ تھا۔ آپ کا قرب ارادت پیدا کرتا اور محسوس ہوتا کہ اللہ کی زمین پر معجزۂ الٰہی ہیں۔ آپ بلاشبہ ایک ولی اللہ اور جود وسخا کے انسان تھے۔ آپ کے وجود میں وہ تمام اوصاف مجتمع نظر آتے جو قرون اولیٰ میں صحبت یافتگان رسالت کی خصوصیت تھے۔ آپ علائق دنیا سے اس حد تک بے نیاز تھے کہ آپ کو معلوم ہی نہ تھا دنیا کیا ہے اور اس کے شب وروز کیا ہیں؟ فیلڈ مارشل ایوب خان نے اقتدار سنبھالا اور دارالحکومت راولپنڈی لے گئے، تو آپ سے رابطہ پیدا کرنا چاہا۔ اپنا سیکرٹری بھیج کر آپ کو یاد کیا۔ راقم بھی وہیں تھا۔ صدر ایوب کی طرف سے سیکرٹری نے اخلاص کا اظہار کیا اور پیغام دیا کہ صدر آپ سے ملنے کے متمنی ہیں اور مجھے اسی غرض سے ہے بھیجا ہے۔ قصر صدارت کو شرف بخشیئے۔ آپ نے برجستہ فرمایا "نعم الامیر علی باب الفقیر وبئس الفقیر علی باب الامیر" یعنی بہترین امیر وہ ہے جو فقیر کے در پر جائے اور بُرا فقیر

وہ بے جا امیر کے در پہ حاضر ہوئے۔ فرمایا میرا معاملہ اپنے رب سے ہے۔ مجھے ملاقات سے معذور رکھیں تو بہتر ہے۔
ارباب اقتدار سے میل ملاپ اور اس طرز کی راہ و رسم نہ میرے مشائخ کا مشرب رہا ہے اور نہ میرا مسلک ہے۔ صدر
کے سیکرٹری چلے گئے۔ پھر ان سے لاہور رخصت، اگلی ملاقات کراچی میں کی۔ لیکن باباجی کا فقر و استغنا اس رفعت
پر تھا کہ اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ فرمایا کہ اقتدار اور فقر اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ غالباً اس انکار ہی کا نتیجہ تھا کہ ایوب خاں
نے اپنے لیے ایک پیر پیدا کیا، جو طریقت کے سجادہ پر ان کی سیاست کا ترجمان تھا۔ اس چیز نے راقم کو اس قدر متاثر
کیا کہ تاریخ اسلام کی وہ صداقتیں یاد آگئیں جنہیں پڑھ کر حیرت ہوتی کہ فی الواقعہ جلال و استبداد سے فقر و استغنا
نے اس طرح خطاب کیا تھا؟ اور اب راقم دیکھ رہا تھا کہ باباجی ان صداقتوں کی چلتی پھرتی تصویر ہیں۔ باباجی
سیاسی انسان بالکل ہی نہ تھے۔ ان کا وجود ایک دینی تحریک تھا۔ وہ نگاہ کرتے اور انسان اپنے اندر ایک
انقلاب محسوس کرتا۔ وہ بات چیت کے انسان نہ تھے۔ ان کا ختم نبوت کے مسئلہ سے موروثی تعلق تھا۔ اس
غرض سے شخصاً کسی تحریک، تنظیم یا تقریر میں شامل نہ ہوتے، لیکن سفر و حضر میں دعا گو رہتے۔ سنہ ۱۹۵۳ء کی تحریک
میں علماء کی یکجہتی کے لیے لاہور میں مجلس مشاورت کا اجلاس ہوا، تو آپ پہلی دفعہ مدعوین کی زبردست
خواہش پر تشریف لائے۔ آپ کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری آپ سے کچھ دیر بعد تشریف
لائے اور اگلی صف کی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ کسی نے کہا شاہ جی! اُدھر پیچھے حضرت صاحبزادہ محی الدین
شاہ گولڑہ شریف تشریف فرما ہیں۔ شاہ صاحب نے پلٹ کر دیکھا۔ فوراً آگے بڑھے۔ آپ کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ جھک
گئے۔ کہنے لگے۔ حضرت آپ آ گئے، الحمد للہ! ہماری نصرت قریب ہو گئی ہے۔ میرے سامنے اعلیٰ حضرتؒ ہیں۔
ہم تو اسی کاوش سے کر چل رہے ہیں۔ شاہ جی نے دعا کرائی، باباجی نے دعا کی۔ باباجی ہی کا فیضان تھا کہ مسلمانوں
کے مختلف مکاتیب فکر، جو بعض فروعی جھگڑوں کے باعث کبھی اکٹھا نہ ہوتے تھے۔ اس تحریک میں اکٹھے
ہو کر قادیانیت سے ٹکرا گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس تحریک میں دیوبندی، بریلوی، حنفی، اہلحدیث اور شیعہ
ایک ہو کر قادیانیت کے خلاف متحد العمل ہو گئے۔ حضرت باباجی اس وقت کے متقدین، ملک غلام محمد گورنر جنرل،
خواجہ ناظم الدین وزیراعظم اور میاں مشتاق احمد گورمانی وزیر داخلہ سے بھی ملے۔ انہیں مسلمانوں کے جذبات
اور مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت سے آگاہ کیا اور اسیران تحریک کی مشکلات کے ازالہ پر توجہ دلائی۔ راقم کو شورش
مئی ۱۹۶۸ء میں فیلڈ مارشل ایوب خاں کی ہدایت پر جنرل موسیٰ گورنر مغربی پاکستان نے ڈیفنس آف پاکستان
رولز کے تحت بلا میعاد نظر بند کیا۔ ہفت روزہ چٹان کا ڈیکلریشن منسوخ کر ڈالا اور چٹان پریس ضبط کر لیا۔ اس

کی تفصیلات چٹان کے تذکرہ میں بیان ہوں گی۔ مختصر یہ کہ گورنر موسیٰ راقم کو مروا دینے پر تل گیا۔ اس نے منصوبہ تیار کیا کہ شورش کو ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے کراچی منتقل کرتے وقت جیل کے راستہ میں مروا دیا جائے۔ اس غرض سے ایک قادیانی انسپکٹر پولیس کو قادیانی سپاہیوں کے ساتھ مقرر کیا گیا۔ اس کا انکشاف ایک بہت بڑے پولیس افسر نے جولائی ۱۹۶۸ء میں راقم سے مری میں کیا۔ اس پولیس افسر سے ملاقات کا باعث حضرت بابوجی قدس سرہٗ تھے اور وہ غالباً آپ سے بیعت تھا۔[1]

ان دنوں بابوجی قدس سرہٗ نے راقم کے بچوں کو اپنی شفقتوں میں شریک کیا۔ الفقر کی اہلیہ نے آپ سے عرض کیا ۔ حضور رحمۃ للعالمینؐ کے صدقہ میں اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم شریک حال ہے، کوئی تردد نہیں نہ کسی چیز کی احتیاج ہے۔ صرف اپنی دعاؤں میں شریک کر لیں۔ ہماری واحد ضرورت یہی ہے ۔ فرمایا: "مجھے تو اعلیٰحضرت کا حکم ہے اور میں اُن کے ارشاد کی تعمیل کر رہا ہوں۔ بفضل تعالیٰ شورش ہر بلا سے محفوظ رہے گا۔ اعلیٰ حضرت کی اُس پر نگاہ ہے۔"

بابوجی نے ۱۹۶۲ء سے لے کر اپنے وصال ۱۹۷۴ء تک ہمارے مؤدبانہ اعراض و انکار کے باوجود اپنا تفقد جاری رکھا۔ فرماتے "شورش ختم نبوت کا سپاہی ہے اور ہم اس کے دعا گو ہیں۔"

راقم نے حکومت کی دھاندلی سے تنگ آ کر کراچی کے ایام نظربندی میں ۴۵ روز بھوک ہڑتال کی۔ اس دوران میں حالت خستہ سے خستہ ہوتی گئی۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ صبح و شام کا معاملہ ہو گیا۔ کسی وقت بھی سانس آ جانے کا احتمال تھا۔ ایوب خاں اور موسیٰ خاں راقم کو موت کی نیند سلا دینا چاہتے تھے۔ پینتالیسویں روز حالت تشویشناک ہو گئی۔ مولانا تاج محمود مدیر "لولاک" نے اکابر کو اطلاع دی۔ ملک کے طول و عرض سے راقم کے نام تاروں کا تانتا بندھ گیا۔ "بھوک ہڑتال چھوڑ دو۔" اُسی روز دس بجے شب کے لگ بھگ حافظ عزیز الرحمٰن تشریف لائے اور فرمایا کہ انہیں لاہور سے مختلف راہنماؤں کا پیغام آیا اور دین پور شریف سے حضرت مولانا عبدالہادی نے تار دیا ہے۔ ایک اور تار حضرت عبداللہ درخواستی کا ہے کہ بھوک ہڑتال چھوڑ دو۔ تمہاری زندگی ضروری ہے۔ راقم نے حافظ جی کو ٹال دیا کہ صبح سوچیں گے۔ وہ چلے گئے۔ راقم تین بجے سو گیا۔ اذان کے وقت خواب دیکھا کہ جنت الفردوس کی ایک روش پر سیدنا مہر علی شاہ قدس سرہٗ العزیز، علامہ انور شاہ نوراللہ مرقدہٗ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

---

[1] تفصیلات باب بعنوان "چٹان نے تحریک پیدا کی" میں ملاحظہ ہوں۔

ٹکڑے ہیں۔ راقم کے شانے کو ان کے مقدس ہاتھ نے تھپکی دیتے ہوئے کہا:

"شورش گھبرانا نہیں، آخری فتح تمہاری ہے۔"

جب دن چڑھے راقم کو جگایا گیا تو پالٹی کی طرف سے پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد، کمشنر کراچی اور سپرنٹنڈنٹ جیل کھڑے تھے۔ تینوں آپس میں کانا پھوسی کر کے چلے گئے۔ راقم ایک جاں بلب مریض کی طرح تھا۔ ایکا ایکی دوبارہ آنکھ لگ گئی۔ پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد گورنر ہاؤس سے فکر ہو کے جھنجھوڑ کے جگایا۔ کہنے لگے ... "مبارک ہو، آپ کو حکومت نے رہا کر دیا۔ پولیس چلی گئی۔ اب آپ آزاد ہیں" اس کے بعد انہوں نے انجکشن لگانا شروع کئے اور رات کے آغاز تک انجکشن دیتے رہے۔ اس کے بعد راقم نے ۱۹۷۱ء سے سانحہ ربوہ تک تین سال قادیانی امت کا سیاسی محاسبہ جاری رکھا۔ باؤجی قدس سرہ نے راقم کو صبح شام کی دعاؤں میں شریک کر لیا۔ آپ کے روحانی تصرفات کا فیضان تھا کہ راقم کا قلب مضبوط ہو گیا۔ پھر جب جون ۱۹۷۴ء سے تحریک کا فیصلہ کن دور شروع ہوا، تو حضرت باؤجی نور اللہ مرقدہ مرض الموت کے نرغہ میں تھے، لیکن آپ کے معمول میں کوئی فرق نہ تھا۔ آپ کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اللہ والے یہی ہوتے ہیں۔ راقم نے وصال سے چند دن پہلے نیاز حاصل کیا، تو فرمایا:

"چند دن جدوجہد کے باقی، نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے" پھر خاموش ہو گئے۔ چہرہ مبارک دمک رہا تھا۔ فرمایا: "اب مشاہدے ہو کے رہے گا، نصرت آ چکی ہے۔ میں اعلیٰ حضرت کے پاس جا رہا ہوں۔ اُن سے عرض کروں گا۔ آپ نے جس پودے کی آبیاری کی تھی، وہ پھل لے آیا ہے۔"

* * *

مولانا ظفر علیخان نے سیاسی احتساب کا آغاز کیا

مولانا ظفر علی خان نے قادیانیت کے سیاسی اور عوامی محاسبہ کی نیو اٹھائی۔ آپ نظام دکن کی ملازمت سے علیحدہ ہو کر پنجاب آئے تو یہاں آپ کے والد ماجد مولوی سراج الدین احمد سخت علیل تھے۔ ان کا ۵ دسمبر ۱۹۰۹ء کو انتقال ہو گیا۔ آپ نے یکم جنوری ۱۹۱۰ء سے زمیندار کی ادارت سنبھالی۔ ان دنوں مرزا غلام احمد کے فتنہ کا شہرہ صرف پنجاب میں تھا۔ یہ ایک طرف دہلی اور دوسری طرف پشاور کے دینی حلقوں میں ذکر اذکار تھا۔ مرزا غلام احمد ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو رحلت کر گئے۔ حکیم نور الدین خلیفہ اول قرار پائے۔ وہ ۱۳ مارچ ۱۹۱۴ء کو وفات پا گئے۔ مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ ثانی بنے۔ وہ مرزا غلام احمد کے فرزند ارجمند تھے لیکن کسی دینی بصیرت کے مالک نہ تھے۔ انہوں نے اپنے گرد ایک ایسا ذہنی گروہ جمع کیا جو عملاً ہوشیار تھا اور ان کے حسب منشا قادیانیت کے نئے سانچے تیار کرتا۔ مرزا محمود خلقتاً سیاسی ذہن کے انسان تھے۔ انہوں نے اپنی جماعت کے بعض سیاسی شاطروں سے تربیت حاصل کی۔ پھر راسپوٹین کی حیثیت سے نشوونما پا کر کرنل لارنس کا پرتو ہو گئے۔ انہیں خلافت پر فائز ہوتے ہی ایک ایسا زمانہ ملا کہ پہلی جنگ عظیم کا سر آغاز تھا۔ انگریزوں کو خلافت عثمانیہ کے خلاف اس قسم کے مسلمان درکار تھے، جو ترکوں اور عربوں میں ان کے حسب منشا کام کریں اور وہ کسی مذہب کا شکار نہ ہوں۔ انہیں یہ خیال نہ ہو کہ وہ کسی مسلمان ملک یا کسی مقدس خطہ میں ایک نصرانی طاقت کے آلۂ کار ہیں۔ مرزا بشیر الدین اس غرض سے موزوں آدمی تھے۔ ایک

تو روئے عقیدہ تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے۔ دوسرے انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ برطانوی حکومت ان کے نزدیک انعامِ الٰہی ہے اور جو اس کا بدخواہ ہے وہ حلال زادہ نہیں۔ میرزا محمودؒ نے اپنے معتقدوں کی ایک ٹیم انگریزوں کے حوالے کی جو ترکی کے علاوہ جزیرۃ العرب کے مختلف ملکوں میں برطانوی سلطنت کی آلۂ کار ہو گئی۔ اس طرح میرزا بشیر الدین محمود کو اپنی خلافت کے لیے ایک اچھا موقع مل گیا۔ انہیں ایک چھوٹا سا اختلاف پیش آیا کہ مولوی محمد علی ان سے علیحدہ ہو کر لاہوری جماعت قائم کی اور میرزا غلام احمد کے متعلق اعلان کیا کہ ان کا دعویٰ نبی ہونے کا نہیں تھا۔ وہ مجدد تھے۔ مولوی محمد علی کی ناراضی کا اصل سبب یہ کہ وہ حکیم نور الدین کے بعد خلیفہ ہونے کے مستحق تھے۔ میرزا بشیر الدین محمود کا خلیفہ ہونا ان کے لیے المیہ تھا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر الگ ہو گئے اور لاہور آ کر انجمن احمدیہ کی بنا ڈال دی۔ لیکن ان کا باہمی تنازعہ انگریزوں کے لیے کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ دونوں ان کے حبیب تھے۔ میرزا محمود نے پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے دوران میں یہ فائدہ اٹھایا کہ ان سے متعلق منبر و محراب کا احتساب ڈھیلا پڑ گیا جماعت المسلمین قادیانیت کے سیاسی مضمرات سے ناآشنا تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو ملک سیاسی حالات عدم تعاون اور ترک موالات کی طرف چلے گئے۔ قادیانیت کا محاسبہ کیوں کر ہوتا؟ اس بارے میں کسی نے غور ہی نہ کیا۔ تحریک عدم تعاون کا شعلہ کجلا گیا، تو انگریزوں کی مہرہ بازی نے ہندو مسلم فسادات پیدا کیے جن عناصر نے ان کی نیو اٹھانے میں باطنی حصہ لیا، ان میں میرزا بشیر الدین محمود پیش پیش تھا۔

فسادات تھم پڑ گئے، تو لاہور کانگریس ۱۹۲۹ء تک فرقہ وار حقوق کا مسئلہ جھگڑتا رہا اور یہ قادیانی امت کے لیے عافیت کا حصار تھا۔ اس سے متعلق نہ کوئی عوامی تحریک تھی اور نہ عامۃ المسلمین اس کی مختلف مضرتوں سے آگاہ تھے۔ کانگریس نے ۱۹۳۰ء میں نمکین ستیہ گرہ شروع کیا، تو قادیانی مسلمانوں کے اجتماعی احتساب سے محفوظ تھے۔ میرزا بشیر الدین محمود مسلمانوں کو اسلام سے خارج قرار دے کر اپنے والد کے پیروؤں کو مسلمان گردانتے تھے، لیکن جب انگریزی حکومت کا اشارہ ہوتا، تو ہندوستانی مسلمانوں کی آواز ہو کر بولتے اور انہیں مختلف سیاسی خطروں سے ڈراتے۔ گو مسلمانوں میں قادیانیت کے خلاف ایک احتسابی ذہن ابھر چکا تھا، لیکن مسلمانوں کی تعلیم یافتہ جماعت کے مغربی ذہن میں قادیانیوں سے متعلق اس قسم کے جذبات تھے کہ وہ مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ہیں اور ان کے متعلق علماء کا احتساب مسلمانوں کی باہمی آویزشوں کا حصہ ہے۔ ایک بڑا گروہ رواداری کا مادہ پھونکتا اور قادیانی بڑ چھیروں سے بعض وجوہ مرعوب تھا۔ تحریکِ کشمیر ۱۹۳۲ء تک عام مسلمان اسی نہج پر رہے۔ علامہ اقبالؒ نے [illegible] میں کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دیا۔ آپ کی تحریک پر انجمن حمایت اسلام نے اپنی عاملہ عامہ

سے قادیانیوں کو خارج کیا۔ پھر ۱۹۳۵ء میں آپ نے میرزائیت کے قلعہ پر ضرب لگا کر قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا، تو قادیانیت کا مسئلہ ہر گھر میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ مغرب زدہ مسلمان جو اس مسئلہ کے مطالعہ سے محروم تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ایک اُمّت کیونکر تیار ہوتی ہے؟ اور کن رخنوں سے اس کی وحدت لٹتی ہے۔ انہیں بھی معلوم ہو گیا کہ قادیانی اُمّت کیا ہے؟ اس کی تشکیل کیونکر ہوئی ہے اور اس کی سوانح عمری کیا ہے؟ اور وہ بحمدہ تعالیٰ مسلمانوں میں رہ کر کیا کرتی اور کیا پاتی ہے؟ اگر پہلی جنگ عظیم نہ ہوتی اور اس کے بعد انگریزی استعمار کی مختلف ضرورتیں ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلہ کی آلائشوں کو ہوا نہ دیتیں، تو ممکن تھا مرزا بشیر الدین محمود کے زمانہ خلافت ہی میں قادیانی بیل منڈھے نہ چڑھتی اور اس کا بہت کچھ بالعجلت خاتمہ ہو جاتا، لیکن برطانوی استعمار نے قادیانی اُمّت کو اپنی سیاسی ضرورتوں کے تابع سہارا دیا اور وہ اوائل قیام کی اقتضاء رکھنے کے باوجود دینی اعتبار سے مسلمانوں کے لیے ایک پرابلم ہو گئی۔ میرزا غلام احمد سے لے کر حکیم نور الدین کے زمانہ تک جماعت کے تبلیغی دروازے کھلے تھے اور ادھر اُدھر سے کئی ضعیف الاعتقاد لوگ دامِ تزویر میں پھنس جاتے تھے۔ یا پھر میرزا بشیر الدین نے پہلی جنگ عظیم سے فائدہ اٹھا کر بعض خاندانوں اور ان کے متعلقین کو شکار کیا۔ غرض ۱۹۳۱ء میں کل ۵۵ ہزار نفوس سرکاری مردم شماری کے مطابق قادیانی تھے۔ ممکن تھا تعداد سامنے نہ آتی، لیکن انگریزوں نے خلیفہ کو زور دے کر مردم شماری کرائی تاکہ انہیں معلوم ہو کہ ان کے خود کاشتہ پودے کی عددی حیثیت کیا ہے؟ اور وہ کس حد تک اس سے فائدہ اُٹھا سکتے اور اس کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ اس مردم شماری کے بعد قادیانیوں کو اپنی عددی طاقت ظاہر کرنے کا پھر کبھی حوصلہ نہ ہوا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ دینی احتساب کی ہمہ گیری کے باعث کسی مسلمان کا مرزائی ہونا ممکن نہیں رہا۔ صرف ترغیب و تحریص سے کوئی نادان مسلمان میرزائی ہو تو ہو۔ میرزا محمود نے تعداد بڑھانے کے لیے افزائش اولاد کی تحریک چلائی اور اپنے مریدوں کو پند دی کہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کریں یا پھر احمدی خواتین کو سیاسی و معاشی اعتبار سے بعض بڑے آدمیوں سے بیاہ کر سول اور سرکاری افسروں سے قادیانی ہو جانے کی شہ دی۔ لیکن کسی مرحلہ میں مردم شماری پر راضی نہ ہوئے جو مسلمانوں نے بہتیرا زور دیا، انگریزوں سے کہا؛ حتیٰ کہ پاکستان بن جانے کے بعد کئی ایک جماعتوں نے اصرار کیا، مگر میرزائی سربراہ اس غرض سے کبھی تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے ہر حکومت میں ایک ایسا رسوخ پیدا کر لیا کہ سرکار کے اعتماد و رسوخ نے اس سوال پر غور ہی نہ کیا۔ ان کے نزدیک قادیانی مسلمان تھے اور کوئی ضروری پہلو اس مسئلہ میں لائقِ اعتنا نہ تھا۔ فسانہ شہ یہ تھا کہ قادیانی مسلمانوں کو عقیدۃً کافر سمجھتے لیکن سیاستاً ان کے حقوق سے فائدہ اُٹھاتے۔ مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کی ادارت سنبھالی تو مرزا صاحب کی دلالت کو

صرف ایک سال اور سات ماہ ہوئے تھے۔ ان کا دینی احتساب منبر و محراب کی محدود و مخصوص فضا میں تھا یا پھر وہ چار تبلیغی رسائل قرآن و حدیث کے تحت فقہی خامہ فرسائی کرتے لیکن ان کے باعث عوام کی ذہنی رسائی سے خارج تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء کی پرزور مزاحمت نے میرزا غلام احمد اور اُن کے جانشینوں کو شرعی اعتبار سے چت کر دیا تھا اور عام مسلمان ان کے شکار نہیں ہو رہے تھے لیکن علماء وفات مسیح، ظہور مہدی، آثار قیامت اور خروج دجال وغیرہ کے مسائل پر گفتگو کرتے یا پھر ختم نبوت کے معانی پر قرآن و حدیث کی رُو سے وعظ کرتے۔ ان کے سامنے یہ سوال ہی نہ تھا کہ میرزا غلام احمد استعماری ضرورت کی پیداوار ہیں اور برطانوی شہنشاہیت نے کن سیاسی مقاصد کے تحت انہیں جنم دیا ہے۔ اس وقت یہ سوال مسلمانوں کے ذہن میں تھا ہی نہیں کیونکہ سیاسی جرأت کا زمانہ نہیں تھا اور برطانوی استبداد اپنی کسی ایجنسی سے متعلق سیاسی چہرہ کشائی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ ایک مُہر بلب دور تھا۔

میرزا غلام احمد کے پیروؤں کو مسلمانوں میں صرف اس لیے جگہ مل اور وہ منبر و محراب کے احتساب کی عوامی پکڑ سے محفوظ رہے کہ اس زمانہ میں علماء نے تکفیر کے بہت سے پہلو رہا رکھے تھے۔ ایک فرقہ دوسرے فرقہ پر کافر ہونے کا طعن توڑ رہا تھا۔ سرسید احمد خاں بھی اسی تلوار کے زخم سہہ چکے تھے۔ اس باعث جدید تعلیم یافتہ لوگ توجہ نہ دیتے اور اس سے لاتعلق رہتے۔ ہوا یہ کہ اصل کفر کو بھی پناہ و مقام مل گئی اور اس نے ڈھونگ رچا لیا۔ لیکن اس کا پروان چڑھنا برطانوی حکومت کا مرہون تھا۔

مولانا ظفر علی خاں نے پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک زمیندار میں میرزائیت سے چھیڑیاں لیں۔ گو موضوع مضمون عام ہی کے انداز میں تھے لیکن لب و لہجہ ادبی ذوق کا ہی تھا۔ مولانا کبھی کسی نظم میں طنز کر جاتے اور کبھی نثر میں اکثر علم و بحث کے چہرے پر ایک آدھ پہلو دار فقرے سے رونق پیدا کرتے۔ مولانا کے نزدیک مرزا غلام احمد کا سلطان القلم کہلانا انہی کو خطاب تھا۔ اُن کے مجموعۂ کلام درثمین کے متعلق اس دور کے زمیندار میں لکھا کہ شاعری نہیں قلم کی مسل ہے۔

زمیندار طرابلس اور بلقان کی جنگ کے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا روزنامہ ہو گیا اس کی اشاعت دنوں ہی میں بیس ہزار ہو گئی، ان دنوں ایک عظیم اشاعت تھی۔ گو خواندگی کا تناسب حقیر تھا لیکن مسلمانوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ دو دو پیسے میں زمیندار خریدتے اور ایک آنہ اس کی پڑھائی پر خرچ کرتے سر مائیکل اڈوائر پنجاب کا گورنر تھا۔ وہ اس سے پہلے حیدرآباد میں ریذیڈنٹ رہا اور وہاں سے مولانا کے نکلوانے

کا باعث ہوا تھا۔ اس کے دل میں مولانا کے خلاف میل تھی۔ مولانا انگلستان میں پریس ایکٹ کے خلاف آواز اٹھا کر ۲۰ ستمبر ۱۹۱۳ء کو واپس آئے، تو چند روز بعد ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو انہیں کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ ادھر زمیندار ۱۹۱۳ء ہی میں ضمانت طلبیوں اور ضمانت ضبطیوں کا ہدف ہو چکا تھا۔ لیکن وہ کسی طرح دسمبر ۱۹۱۵ء تک چلتا رہا لیکن بالآخر سر مائیکل اڈوائر نے اس کو سیندور کھلا دیا۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۱۶ء میں روزنامہ 'لمعات' جاری کیا، وہ بھی کچھ دنوں بعد بند ہو گیا۔ اسی سال دسمبر میں مولانا کو اپنے گاؤں کرم آباد سے اس شرط پر ہفتہ وار 'ستارۂ صبح' نکالنے کی اجازت مل گئی کہ علمی و ادبی ہو گا۔ پہلا پرچہ جنوری ۱۹۱۷ء میں نکلا۔ کوئی چھ سات ماہ بعد 'ستارۂ صبح' لاہور منتقل ہو کر ۱۰ اگست ۱۹۱۷ء کو روزنامہ ہو گیا۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ مولانا نے ستارۂ صبح میں قادیانیت کا محاسبہ شروع کیا لیکن اہل طریقت سے بھی الجھ گئے۔ پیروں نے مشترکہ دستخطوں سے سر مائیکل اڈوائر کو ان کے خلاف عرضداشت روانہ کی حتیٰ کہ لاہور میں احتجاجی جلسہ منعقد کیا۔ سر مائیکل مولانا کے پہلے ہی خلاف تھا۔ ان حالات میں مولانا لاہور چھوڑ کر حیدر آباد دکن چلے گئے۔ لیکن مخبروں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر وہاں سے بھی ریاست بدر ہو کر لوٹ آئے۔ جنگ عظیم ختم ہوتے ہی زمیندار کا ڈیکلریشن بحال ہو گیا اور ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء سے از سر نو نکلنے لگا۔ لیکن ابتلاء و آزمائش کی صعوبتیں زمیندار اور مولانا کے ہمرکاب رہیں۔ مولانا حضرو ضلع کیمبل پور کی ایک تقریر کے خلاف قانون ہونے کی پاداش میں گرفتار کئے گئے اور زیر دفعہ ۱۲۴ الف پانچ برس اور زیر دفعہ ۱۵۳ الف دو برس قید کی سزا دی گئی۔ آپ نے قید کا پورا زمانہ سنٹرل جیل منٹگمری میں گذارا جو ان دنوں پنجاب کی جیلوں میں کالا پانی کہلاتا تھا۔ جہاں تک زمیندار کا تعلق تھا وہ سرکاری عتاب کا نشانہ بنا رہا۔ مولانا ظفر علیخاں کی اس خوبی کا جواب نہ تھا کہ وہ کسی تحریک کو لے کر اٹھتے تو برسوں کی منزلیں مہینوں میں طے کر لیتے۔ انہوں نے قادیانی امت کے خدوخال 'ستارۂ صبح' میں اس طرح واضح کئے کہ مسلمانوں میں نظری اعتبار سے ایک تحریک پیدا ہو گئی۔ اس تحریک ہی نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں عملی احتساب کی مختلف شکلیں پیدا کیں جن سے برصغیر کے مسلمانوں میں قادیانی امت کے سیاسی و عمرانی محاسبہ کا آغاز ہو گیا۔

قادیانی امت کو پہلی جنگ عظیم کے دوران اور اس سے کئی سال بعد تک چھیڑنا آسان نہ تھا کیونکہ برطانوی حکومت کی استعماری مصلحتیں گوارا ہی نہ کرتی تھیں۔ لیکن مولانا ظفر علیخاں نے ستارۂ صبح میں معرکہ طرح ڈالا اور قادیانی امت کے استعماری وجود کو دلائل و براہین سے پسپا کرنا شروع کیا۔ مولانا کے ہاتھ میں دو ہتھیار تھے، ایک نثر

کا ہتھیار تھا، دوسرا نظم کا۔ مولانا نے اپنی شگفتہ نثر میں قادیانی عقائد کا تجزیہ کیا۔ موضوع و بحث فنی ہوتا لیکن گرفت اس پیرایہ میں کرتے کہ خواص و عوام متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ جو لکھتے، دل میں کھب جاتا۔ خواص قائل معقول ہوتے، عوام میں احتجاج و تنفر کی رو دوڑ جاتی۔ مثلاً اسی زمانہ میں مولانا نے ایک مقالہ لکھا ہے "احمد کون ہے؟ حضور سرورِ کون و مکاں یا میرزائے قادیاں" میرزا غلام احمد اس عنوان سے چونک گئے اور قادیانیت کا گھونگھٹ اُتر گیا۔ ایک دوسرا مضمون "بعثتِ مجددین" کے عنوان تھا۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے ارمغانِ قادیان کے دیباچہ میں لکھا کہ نہایت بلند پایہ اور وقیع مضمون ہے جو نہایت کاوش سے لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں نہایت طویل مقالے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض مضامین ایسے ہیں جن میں طنز کا انداز نمایاں ہے۔ مثلاً متبنّیٔ قادیان کی ناک، قادیاں اور سید امیر علی مرحوم، ملنگ بہ اشتیاق کورسے کے، الولد سر لابیہ۔ متبنّیٔ قادیاں اور اُس کا لاہوری طنبورہ۔ ستارۂ صبح میں کئی ایک ایسے ہی مضامین چھپتے رہے۔ میرزا بشیر الدین محمود نے ان سے بدحواس ہو کر سر مائیکل او ڈوائر کو بصیغۂ راز امداد کی درخواست کی اور اسے مولانا کے خلاف ابھارا۔ ادھر اہلِ طریقت بھی زمیندار کی نکتہ چینی سے برہم تھے۔ انھوں نے زمیندار کے خلاف درخواست گذاری اور مولانا کے خلاف او ڈوائر کو مشتعل کیا۔ یہ چیز میرزا بشیر الدین کی بالواسطہ مددگار ہو گئی۔ اندازاً یہی قول رہا تھا کہ مولانا حیدرآباد لوٹ گئے اور ستارۂ صبح دسمبر ۱۹۱۷ء کے آخری دنوں میں بند ہو گیا لیکن ظفر علی خاں کے قلم کی بدولت مسلمانوں میں یہ ذہن پیدا ہو چکا تھا کہ میرزائی نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم المرسلینی کے غاصب ہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کی شہ رگ پر استعمار کی چھری ہیں۔ الغرض مولانا قادیانیت کے خلاف احتساب کی پہلی آواز تھے جس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی اور مسلمانوں کو اس خطرہ سے چوکنا کیا اور انھیں قادیانیت سے متعلق یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کی ملی وحدت کو لخت لخت کرنے کے لیے برطانوی استعمار کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت شروع ہونے سے چند دن پہلے لاہور کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کر رہے تھے کہ مولانا ظفر علی خاں اپنے فرزند اختر علی خاں کے ساتھ اچانک جلسہ گاہ میں آ گئے۔ مولانا انتہائی ضعیف ہو چکے تھے اور بیمار تھے۔ آپ کا نطق کمزور پڑ چکا تھا۔ نہایت مدھم بولتے، لیکن الفاظ ٹوٹتے تھے۔ شاہ جی نے مولانا کی آمد پر ان کے دونوں گالوں کو تھپتھپایا اور بولے "ظفر علی خاں تیرے ستارۂ صبح نے میرے جگر میں آگ لگا دی تھی"۔

شاہ جی فرماتے ستارۂ صبح نے مجھے قادیانیت کے زہرآب سے آگاہ کیا۔ حضرت سید مہر علی شاہؒ نے

و جہت کی کہ اس فتنہ کی سرکوبی کرنا۔ علامہ انور شاہ نے مجھے اس محاذ پر کھڑا کیا۔ مختصراً اہل قلم کی جدید کھیپ میں قادیانیت کے محاسبہ کی اُمنگ مولانا نے ستارۂ صبح کی معرفت پیدا کی اور اس لحاظ سے مسلمانوں کے سیاسی محاذ پر ظفر علی خاں پہلے حدی خواں تھے۔

سر مائیکل اڈوائر مولانا کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑا رہا۔ اُس نے سنہ ۱۹۱۱ء میں زمیندار سے ضمانت طلب کی اور ۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۱۳ء کو ضبط کر لی۔ مزید دس ہزار طلب کیے اور وہ بھی چار ماہ بعد ۴ جنوری سنہ ۱۹۱۴ء کو ضبط کر لیے۔ اس کے ساتھ ہی پریس بھی ضبط کر لیا۔ دوسرا مطبع مسلم پرنٹنگ پریس قائم کیا گیا۔ اُس سے ابتداً دو ہزار کی ضمانت طلب کی لیکن جلد ہی ضبط کر لی گئی۔ آخر ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۱۴ء کو زمیندار سرکاراً بند کر دیا گیا۔ ایک نیا پرچہ لمعات جاری کیا، وہ اڈوائر کی نذر ہو گیا اور مولانا کو لاہور سے بدر کر کے کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ مولانا تقریباً پانچ سال نظر بند رہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے اور اپریل سنہ ۱۹۲۰ء میں زمیندار از سرِ نو شروع کیا۔ اڈوائر نے حیدر آباد دکن سے مولانا کا سات سو روپے ماہوار کا وظیفہ بند کرا دیا۔ اس کے علاوہ زمیندار کے بہت سے ایڈیٹر گرفتار کیے گئے۔ خود مولانا ۵ ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء کو گرفتار ہو گئے اور حضرو کی تقریر کے جرم میں پانچ سال قید کیے گئے۔[1] اس کے بعد زمیندار کی آزمائشوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا کے فرزند اختر علی خاں بھی دو سال قید کیے گئے۔ مولانا عبدالمجید سالک زمیندار کے ایڈیٹر تھے وہ بھی گرفتار کیے گئے اور انہیں بھی دو سال قید کی سزا ہوئی۔ ظاہر ہے کہ مولانا ظفر علی خاں اور زمیندار برطانوی اقتدار کے خلاف نبرد آزما تھے۔ لیکن اُن کے قلم سے وہ عناصر بھی زک اُٹھاتے تھے جو برطانوی اقتدار کے کاسہ لیس اور اسلام سے مجرمانہ بغاوت کے مرتکب تھے۔ مولانا قید سے رہائی کے بعد قادیانیت کا محاسبہ اپنے قلم و زبان کا نصب العین بنایا اور اس شدت سے احتساب کیا کہ اس کا جینا دوبھر ہو گیا۔ مولانا نے سنہ ۱۹۲۰ء سے پاکستان بن جانے تک اور زمیندار نے پاکستان میں سنہ ۱۹۵۳ء کی تحریک تک قادیانیت کو اپنے قلم و زبان کی زد میں رکھا۔ مولانا قید و بند سے باہر ہوتے تو قادیانیت کا محاسبہ جاری رکھتے۔ کسی قومی تحریک کے پھیلاؤ میں یہ تو ہوتا کہ محاسبہ کی رفتار ذرا مدھم ہو جاتی، لیکن یہ کبھی نہ ہوتا کہ قادیانیت سے کسی مدت کے لیے چشم پوشی کرتے۔ کانگرس میں رہ کر بھی قادیانیت کے شب و روز پر نگاہ رکھتے اور اپنی تقریر و تحریر کو اس سے غافل نہ ہونے دیتے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں کانگرس نے تمکین منبہ گروہ کی تو دلی، پنجاب اور سرحد

---

[1] اس باب میں اسکا ذکر ہو چکا ہے اور اس سلسلے کے بعض دوسرے اشارات بھی آ گئے ہیں۔

کے بڑے بڑے لیڈر گجرات سپیشل جیل میں مقید تھے۔ وہاں مشاعرے ہوتے۔ مولانا مصرع طرح پر نظم کہتے، تو اس میں قادیانیت سے متعلق بھی طبع آزمائی کرتے۔ مولانا کی بعض اشعار کی نظمیں قادیانیت سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد تحریک شہید مسجد شہید گنج کے زمانہ میں، مولانا نے اپنی بیشتر نظموں میں قادیانیت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ تحریک خلافت ۱۹۱۹ء سے مولانا محض ایڈیٹر ہی نہ تھے بلکہ مسلمانوں کے ایک نامور لیڈر بھی تھے اور نظم کے علاوہ ان کی زبان کا بھی شہرہ تھا۔ وہ صحافت کے دھنی اور خطابت کے غنی تھے۔ ان کی تقاریر کے لوگ شیدائی تھے۔ مولانا نے زمیندار کے صفحوں اور صوبہ کے میدانوں میں قادیانیت کو للکارنا اور پچھاڑنا شروع کیا اور ایک مختصر سی مدت میں مسلمانوں کے تمام دروازے اس پر بند کر دیے۔ مولانا نے ۱۹۳۳ء میں قادیانیت کے عوامی احتساب کے لیے ایک جماعت بنائی۔ اس جماعت نے تقریباً ہر روز پبلک جلسے منعقد کرنا شروع کر دیے۔ حکومت نے قادیانی امت کی پشت پناہی کے لیے اندیشہ نقض امن کی آڑ لے کر ۲۴ مارچ ۱۹۳۳ء کو مولانا ظفر علی خاں اور ان کے رفقاء مولانا احمد علیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا عبدالحنان، مولانا لال حسین اختر، مولانا محمد بخش مسلم اور خان احمد یار رزمی کو گرفتار کر لیا۔ یہ پہلا مقدمہ تھا جو سیاسی پس منظر کے تحت مرزائیت کی حمایت میں حکومت نے پیل دفعہ مسلمان زعماء کے خلاف تیار کیا۔ ٹھاکر کبیر سنگھ مجسٹریٹ درجہ اول نے حفظ امن کے لیے ضمانت طلب کی۔ مولانا احمد علی، مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا محمد بخش مسلم کے عقیدتمندوں نے ضمانتیں داخل کر دیں لیکن مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالحنانؒ، مولانا لال حسین اختر اور احمد یار خاں نے انکار کر دیا۔

عدالت نے وہ نوٹس پڑھ کر سنایا جو اس مقدمہ کی بنیاد تھا کہ:

> "تمہارے اور احمدی جماعت کے درمیان اختلاف ہے۔ تم نے اس کے عقائد اور اس کے مذہبی پیشوا پر حملے کیے ہیں جس سے نقض امن کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ وجہ بیان کرو کہ تم سے کیوں نہ نیک چلنی کی ضمانت طلب کی جائے۔"

مولانا نے عدالت کو جواب دیتے ہوئے کہا:

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں مرزائیوں کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے گا۔ لیکن جہاں تک مرزا غلام احمد کا تعلق ہے، ہم اس کو ایک بار نہیں، ہزار بار دجال کہیں گے۔ اس نے حضور کی ختم المرسلینی میں اپنی نبوت کا ناپاک پیوند جوڑ کر ناموس رسالت پر کھلم کھلا حملہ کیا ہے۔ اپنے اس عقیدے سے میں ایک منٹ کے کروڑویں حصے کے لیے بھی دست کش ہونے کو تیار نہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مرزا غلام احمد دجال تھا، دجال تھا، دجال تھا۔ میں اس سلسلہ میں قانون انگریزی کا پابند نہیں۔ میں قانون محمدی کا پابند ہوں۔"

ڈاکٹر حیث قادیانی تھا اور چن چن کر مرزائی جمع کر رہا تھا۔ حکیم فضل الدین کا بیٹا حکیم عبدالسلام عمر بھی وہاں تھا۔ اس کے متعلق انفس میں سمجھا گیا کہ وہ علی گڑھ کو اس طرح فتح کرے گا جس طرح طارق نے ہسپانیہ پر قبضہ کیا تھا۔ مولانا کی تحریک علی گڑھ میں پہنچ چکی تھی۔ ان دنوں طلبہ کی روح رواں شریف حسینی، انوار صمدانی، نسیم سود معربی، سردار وکیل خان (جو جنگل پاکستان پولیس میں ڈی۔آئی۔جی بنے)، عمران الحق ادری اور بعض دوسرے نوجوان تھے۔ انہوں نے مولانا کو بلانے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض سے یونین کا سیکرٹری دعوت نامہ لے کر لاہور پہنچا۔ مولانا ۲۰ نومبر ۱۹۳۳ء کو علی گڑھ تشریف لے گئے۔ ان کا ریلوے اسٹیشن پر زبردست استقبال کیا گیا۔ اسی رات یونین ہال میں جلسہ ہوا۔ مولانا نے قادیانیت کا پول کھولا اور ارباب بست وکشاد کو طبیہ کالج میں مرزائی طلبہ کی دھاندلی پر ٹوکا۔ اگلے روز آپ نے وقار الملک ہال میں تقریر کی۔ اُدھر طلبہ نے آفتاب ہال میں ایک اور تقریر کا انتظام کیا۔ اس کا اعلان ہو چکا تھا کہ انگریز پرو وائس چانسلر اور پروفیسر حبیب نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن طلبہ نے ایک نہ سُنی۔ مولانا کی تقریر ہوئی اور قادیانیت کے پرخچے اُڑائے گئے۔ حکیم فضل الدین کے فرزند حکیم عبدالسلام عمر نے مداخلت کرنی چاہی لیکن طلبہ اُن پر پل پڑے۔ مولانا نے طلبہ کو روک کر اس کی جان بچائی۔ مولانا کی ان تقاریر کا یہ اثر ہوا کہ یونیورسٹی کے ارباب کار فتنہ مرزائیت سے واقف ہو گئے۔ قادیانیوں کی آمد و بھرتی روک دی اور علی گڑھ کے طلبہ میں قادیانی ایک گالی ہو گئے۔ اس دورہ کے بعد مولانا ہر سال علی گڑھ جاتے رہے۔ طلبہ نے آپ کو فاتح قادیانیت کا خطاب دیا۔ جب بھی علی گڑھ جاتے تو وہ نعرہ ضرور لگتا۔ اس کے بعد ہی آپ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر منتخب کیے گئے۔ اُدھر انگریز حکام علی گڑھ کی اس فضا سے پریشان تھے۔ وائسرائے کی ہدایت پر گورنمنٹ نے سر ظفر اللہ خان سے کانووکیشن ایڈریس پڑھوانے پر یونیورسٹی کے ارباب اقتدار کو تیار کیا۔ لیکن طلبہ نے فی الفور احتجاج کیا اور منسوخ کرا ڈالا۔ ان کا واحد کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے قادیانی اُمت اور مجلس کے اکابر کو مسلمانوں کی اجتماعی گرفت میں لا کر ایک ایسا اثر بنا دیا کہ وہ مسلمانوں کی علمی و سیاسی اور تہذیبی و تعلیمی مجالس سے خارج ہو گئے۔

مولانا کی شبانہ روز مساعی کا نتیجہ تھا کہ ان کی تحریک ہندوستان بھر میں پھیل گئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں سر ظفر اللہ خان کے زیر صدارت منعقد کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن مسلمانان دہلی کے اس احتجاج کی نذر ہو گیا کہ ظفر اللہ خان جب مسلمان ہی نہیں تو مسلم لیگ کی صدارت کیسے کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام سے مرزائیوں کو نکلوا دیا اور ان کی شدت کا یہ عالم تھا کہ انجمن کے اجلاس عام کی صدارت کرنے کے لیے تشریف لائے تو ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ جو انجمن کے ممبر تھے، اس اجلاس میں موجود تھے۔ علامہ نے

نواب نے انہیں حکم دیا کہ اجلاس سے چلے جائیں، وہ مسلمان ہی نہیں۔ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ علامہ کے ذاتی دوست
تھے، وہ اس ڈیپوٹیشن سے بچ بچا ہو گئے۔ ان پر اسی رات فالج کا حملہ ہوا اور اگلے روز انتقال کر گئے۔ مرزا بشیر الدین
نے کشمیر کمیٹی کی آڑ میں مسلمانوں میں شامل ہو کر رسوخ پیدا کرنا چاہا۔ انگریزی حکام کی تحریک پر بعض سرکاری مسلمان
بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے لیکن علامہ اقبالؒ نے اس طلسم کو توڑ دیا۔ مرزا بشیر الدین صدارت سے الگ کیے
گئے۔ اس کے بعد علامہ نے وہ تاریخی بیان جاری کیا جو مرزائیت کے لیے ضربِ کاری تھے اور وہ تہذیبی مسلمان
جو مرزائیوں کے متعلق روادار تھے اُن کی حقیقت سے باخبر ہو گئے۔ مرزا ظفر علی خان لاہور ہائی کورٹ کے جج تھے،
اُنہوں نے بھی مرزائیت کا مدلل محاسبہ کیا۔ اس سلسلہ میں عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ معاشیات پروفیسر محمد الیاس
برنی نے ۱۹۳۳ء میں "قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ" ایک نہایت ضخیم کتاب لکھی۔ اس کتاب کے بہت سے
ایڈیشن نکلتے رہے۔ مندرجات میں ہر دفعہ اضافہ ہوتا رہا۔ اسی طرح ملک کے مختلف حصوں سے کئی ایک
جید علماء نے اس موضوع پر کتابیں شائع کیں۔ جنگِ عظیم دوم کے آغاز (ستمبر ۱۹۳۹ء) تک زمیندار نے بہت
سے قادیانی ایڈیشن شائع کیے۔ حکومت مختلف واسطوں سے بعض ایڈیشن ضبط کرتی رہی۔ مولانا کے قادیانیت سے
متعلق بعض مضامین نظم و نثر کا مجموعہ "ارمغانِ قادیان" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اُدھر
۱۹۳۵ء میں مرزائیت کے خلاف علامہ انور شاہؒ کا ایک فتویٰ اور اشعار شائع کرنے پر زمیندار کی ضمانت چار ہزار
روپے ضبط کی گئی اور پانچ ہزار مزید طلب کی گئی تھی لیکن ابتلاء و آزمائش کے یہ معرکے مولانا کے عشقِ رسالت کو جوان کرتے
رہے۔ انہوں نے مرزائیت کا قلع قمع ہی نصب العین بنا رکھا اور قلم و زبان کا الاؤ ہمہ وقت روشن رکھا۔ احرار کے زعماء
بعض سیاسی وجوہ کے باعث مولانا سے الگ ہو گئے۔ بالخصوص تحریک شہید گنج میں جانبین کا اختلاف نقطۂ دم
تک چلا گیا۔ لیکن قادیانیت سے متعلق اپنے سیاسی تجربے اور دینی مطالعے کی بنیاد پر صف آرا رہے حتیٰ کہ ایک
مختصر سی مدت میں قادیانیت کے خلاف عوامی احتساب کی بے پناہ فضا پیدا کر دی؛ چونکہ پنجاب ہی قادیانیت کا
مولد تھا اس لیے پنجاب ہی اس کے کاسۂ سر پر گنبد ابو شکن ہو گیا۔ مولانا ظفر علی خان کے قلم و زبان، احرار کی اس
آوارگی کے ذہنی پس منظر میں پیہم شریک تھے۔ تمام امور زعمائے مجلس سیاست پر زمینداری کے فوق سے چھلکے
تھے۔ مولانا کے نظریات کی خوبیاں اُجاگر کرتے ہیں بجز یو حصہ لیا ایک آدھ کے سوا تقریباً بھی احرار
رہنماؤں کی تعریف میں اشعار کہے اور انہیں صوبائی سیاست میں ایک طاقت بنا دیا۔ غرض مولانا کے زبان و قلم
کی بدولت قادیانیت کے چہرے سے ہر نقاب اتر گئی۔ مولانا ہی کی شبانہ روز مساعی کا نتیجہ تھا کہ ؛

(۱) مرزائیت کا مسئلہ ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔

(۲) مولانا سے پہلے مرزائیت کے تبلیغی دروازے سیدنا مہر علی شاہ نور اللہ مرقدہ اور بعض دوسرے اکابر کی بدولت بند ہو چکے تھے، لیکن مولانا نے مرزائیت کے چور دروازوں پر قفل چڑھا دیا اور تبلیغی اعتبار سے ناکارہ کر دیا۔

(۳) مولانا نے مرزائیت کے سیاسی وجود کے استعماری آب و رنگ کا تجزیہ کیا اور یہ پہلا مرحلہ تھا کہ لوگوں کو مرزائیت کی حقیقت کا پتہ چلا کہ وہ کوئی مذہب نہیں بلکہ برطانوی عملداری کی ہندوستان میں منسوخ جہاد سے متعلق استعماری ضرورت کا نام ہے اور دنیائے اسلام میں انگریزوں کی خاطر اس نے جاسوسی کے پر اسرار کارنامے انجام دیئے ہیں۔

(۴) مولانا نے مسلمان عوام پر مرزائیت کے شرمناک وجود کو ننگا کر دیا اور حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ مرزائیت ملک کی آزادی کے راستہ میں ایک زبردست روک ہے۔

(۵) اس سے پہلے مغربی تعلیم یافتہ مسلمان رواداری برتتے اور انہیں مسلمانوں کی تقریبوں میں مدعو کر لیتے تھے۔ مولانا نے ایسی فضا پیدا کی کہ مسلمانوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ رہی اور وہ لوگ جو اپنی سیاسی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر انہیں ساتھ رکھتے تھے، وہ بھی چار و ناچار دستکش ہو گئے اور کسی میں ان سے میل ملاپ کا حوصلہ نہ رہا۔

(۶) وہ مسلمان جو جدید تعلیم سے بہرہ مند تھے اور ختم نبوت کے مسئلہ میں مذہب کی بنیادی علم سے ناواقف تھے بعض سیاسی افراد کو چھوڑ کر مرزائیت سے بیزار ہو گئے۔

(۷) قادیانیت سے متعلق اصلی لٹریچر کی ایک ڈار پیدا ہو گئی اور مقرروں کی ایک ایسی جماعت سامنے آئی، جس نے مذہب کے علاوہ سیاست کی بنیادوں پر مرزائیت کا محاسبہ شروع کیا حتیٰ کہ لیگ اور کانگرس کے حلقوں میں بھی یہ بات راسخ ہو گئی کہ مرزائی ان کی متحدہ جدوجہد کے خلاف استعماری خواہشوں کے آلۂ کار اور برطانوی عملداری کے ایجنٹ ہیں۔

(۸) مسلمانوں میں یہ مطالبہ قوی ہو گیا کہ مرزائی امت کو دائرہ اسلام سے خارج کر کے ایک جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے۔ علامہ اقبالؒ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں قادیانیت سے متعلق جو معرکۃ الآراء تاریخی مضمون لکھا اس نے مرزائی امت کو الگ اقلیت قرار دینے کے مطالبہ کو پروان چڑھایا۔ سیاسی غرض مندوں اور سرکاری دانشوروں کو چھوڑ کر تمام مسلمان اس سے متفق تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یورپ سے واپسی پر اپنے رفقاء سے بیان کیا کہ مرزائی برطانوی گماشتے ہیں۔ اس روایت کو خود مرزا بشیر الدین محمود نے ڈاکٹر سید محمود کے حوالے سے

نقل کیا ہے۔ غرض مولانا ظفر علی خاں جس تحریک کے سب سے پہلے راہ نما تھے وہ رنگ لائی اور مرزائیت بالآخر مسلمانوں سے الگ ایک شاخ قرار پا گئی۔ مولانا نے قادیانیت سے متعلق مختلف نظموں کی صورت میں تقریباً تین ہزار اشعار لکھے اور نثر میں بے شمار مقالات سپردِ قلم کئے۔ ان سب کا شمار مشکل ہے۔ لیکن مولانا کے تمام رشحات، ہستیٔ معتوبہ کے لیے صُبحِ قیامت کا محاسبہ تھے۔

٭ ٭ ٭

احرار کا چراغِ مصطفوی۔ قادیان کا شرارِ بولہبی

احرار شروع ہی سے قادیانیت کے محاسب تھے لیکن جماعتی طور پر تحریکِ کشمیر کے فوراً بعد ۱۹۳۳ء میں قادیانیت کا تعاقب شروع کیا اور سال ڈیڑھ سال کے اندر قادیانی قلعہ میں زبردست شگاف پیدا کر دیئے۔ مولانا ظفر علی خاں نے تحریک پیدا کر دی تھی۔ احرار نے تنظیم پیدا کی۔ اس تحریک و تنظیم نے قادیانی اُمّت کو مسلمانوں کی ذہنی فضا سے بیدخل کر دیا۔ اس صورتِ حال سے قادیانی پریشان اور انگریز مشتبہ تھے۔ اُنہوں نے اس مسئلہ کو "احرار احمدی" نزاع سے تعبیر کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح مسلمانوں کی احتجاجی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی اور وہ سیاسی شکایتیں جو مسلمانوں کو احرار سے ہیں ان کی معاون ہوں گی۔ میرزائیوں نے اس عنوان سے احرار کُشی کے لیے وزارتِ حربیہ کی، پہلے مسجد شہید گنج کی تحریک سے فائدہ اٹھایا۔ پھر پاکستان کی تحریک میں احرار سے مسلمانوں کی ناراضی کو استعمال کیا۔ قادیانی مسلمانوں کی ہر تحریک سے من حیث الجماعت ہمیشہ الگ رہے۔ ان کے نزدیک برطانوی وفاداری کے سوا کسی دوسری وفاداری کا سوال ہی نہ تھا۔ پاکستان بنا تو سر ظفر اللہ خان کا وزیرِ خارجہ ہونا ان کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہو گیا۔ میرزا بشیر الدین محمود مطمئن تھا کہ علماء بالعموم اور احرار بالخصوص تحریکِ پاکستان میں عدم شمول کے باعث مسلمانوں کا اعتماد کھو بیٹھے ہیں۔ اب ان کے لیے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں۔ اس نے پاکستان کی سیاست کو نرغے میں لینے کی سازشیں شروع کیں۔ حتیٰ کہ بلوچستان کو قادیانی صوبہ بنانے کا اعلان کیا۔ احرار سیاست سے

دستبردار ہوگئے تھے لیکن اس جسٹس منیر نے انہیں چوکنا کر دیا اور وہ قادیانی اُمت کا محاسبہ کرنے دوبارہ میدان میں آگئے انہوں نے دو سال میں وہی تحریک اور وہی تنظیم پیدا کر لی جس نے آزادی سے پہلے قادیانی اُمت کو مسلمانوں کے ذہن سے خارج کر دیا تھا۔ اب مسئلہ پاکستان کی اسلامی ریاست کا تھا۔ عوام کا احتساب اب بے پناہ ہوگیا۔ لیکن سرکاری حکام اسی طرح برطانوی استعمار کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے مسئلہ کو احرار احمدی تنازع کا نام دے کر معدوم کرنا چاہا اور تحریک راست اقدام کو مارشل لاء کے بل پر کچل ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی احرار کے خلاف پروپیگنڈا تیز ہوگیا۔ جسٹس منیر نے تحقیقاتی رپورٹ میں مسئلہ کا مذاق اڑایا احرار کو تشدد پسند اور پاکستان دشمن قرار دیتے ہوئے لکھا کہ انہوں نے پاکستان کو سبوتاژ کرنے کے لیے ہنگامہ برپا کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مارشل لاء کے استبداد نے راست اقدام کی تحریک ۱۹۵۳ء کو ختم کر دیا لیکن قادیانی مسئلہ تمام دنیائے اسلام کی نظر میں آ گیا اور جو لوگ اب تک بے خبر تھے کہ مسئلہ کیا ہے؟ وہ با خبر ہو گئے۔ جسٹس منیر نے اس مسئلہ میں نہایت بھونڈا طریق استعمال کیا۔ انہوں نے علماء کی عزت پر ہاتھ ڈال کر اسلام کا مذاق اڑایا۔ لیکن علماء بہ حیثیت کے بالا دو یا بار بار وہ تنازع کے باوجود اس کو اسلام کا سرٹیفکیٹ دینے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ جسٹس لاء کہاں گیا؟ اور مارشل لاء نے والے کدھر گئے؟ وہ اس بحث کو چھوڑتے ہندوستان کی تحریک آزادی کا پہلا سنگ میل جلیانوالہ باغ کا حادثہ اور پنجاب کا مارشل لاء تھا۔ لیکن اس کے دو برس بعد انگریز برعظیم سے رخصت ہوگیا۔ وہ مارشل لاء جو ۱۹۵۳ء میں ختم نبوت کے فدائیوں پر لگا، اس کے ۲۱ برس بعد از روئے آئین مرزائی دائرہ اسلام سے خارج ہو کر جداگانہ اقلیت قرار پاگئے اور جس قضیہ کو انگریزی عہد کے باقیات نے "احرار احمدی" تنازع کا نام دیا تھا، وہ اسلام کا بنیادی مسئلہ ہو کر حل ہو گیا۔ احرار بلاشبہ اس محاذ کی جانثار فوج تھے لیکن مسئلہ ان کا نہ تھا۔ مسئلہ محمد عربی کی اُمت اور غلام احمد قادیانی کی جماعت کا تھا۔ مرزا غلام احمد نے استعمار کی اندھیری رات میں مسلمانوں کی وحدت پر شبخون مار کر اپنے پیرو پیدا کیے تھے، قادیانی ملک کی جدوجہد آزادی میں سیاسی بدکاری کے مرتکب نہ ہوتے یا ان کا استعماری چہرہ سامنے نہ آتا تو بھی ان کا احرار کی گرفت سے بچنا ناممکن تھا۔ ان کا یہ جرم ہی ناقابل معافی تھا کہ مرزا غلام احمد نے نبوت کا سرقہ کیا۔ قرآن و حدیث کے مطالب میں قلمیں لگائیں۔ خود کو تمام انبیاء کا بروز کہا۔ جہاد منسوخ کیا۔ برطانیہ کی اطاعت لازم کی! حتیٰ کہ ان تمام مسلمانوں کو اسلام سے خارج کر ڈالا۔ جو ان کے قائل نہ تھے لیکن جب یہ حقیقت کھل کے سامنے آ گئی کہ مرزا غلام احمد برطانوی استعمار کی پیداوار ہیں۔ ان کے پیروکار مسلمانوں کے روپ میں برطانوی جاسوس ہیں اور ان کے دو کام ہیں۔ ایک مسلمان ریاستوں کی جاسوسی اور دوسرے ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی چاکری — احرار نے مختلف مجلسوں

تحریروں میں مطالعہ کیا اور جب ان کا مطالعہ ہر لحاظ سے مکمل ہوگیا تو قادیانیت کا تعاقب شروع کیا اور چند دنوں ہی میں فضا بدل ڈالی۔

چوہدری افضل حق علیہ الرحمۃ احرار کے شعر و دماغ تھے۔ انہوں نے اپنے مختلف خطبوں میں قادیانیت کا سیاسی تجزیہ کیا۔ تاریخ احرار (طبع ثانی) کے صفحہ ۱۰۱ تا ۱۰۹ پر فتنہ قادیان کے زیر عنوان نہایت شرح و بسط سے روشنی ڈالی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

(۱) ملت اسلامیہ کی تشکیل محمد عربی نے کی ہے۔ ان کے بعد کسی نبی کے مبعوث ہونے کا سوال ہی نہیں ان کے بعد کسی بھی شخص کے دعوائے نبوت سے ملت اسلامیہ تقسیم ہو جاتی اور اس کی وحدت قائم نہیں رہتی۔ دین خدا کا ہوتا ہے لیکن ملت پیغمبر اٹھاتے ہیں۔ مرزا غلام احمد خود کوئی ملت پیدا کرنے سے قاصر تھے۔ ان کا دعویٰ استعماری خواہش کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے ملت اسلامیہ میں نقب لگائی اور وحدت اسلامی کو دولخت کرنا چاہا۔ اس طرح اپنے پیروؤں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اسلامی ملکوں میں برطانوی طاقتوں کی ہر قومی خدمات انجام دے رہی ہے اور اپنی اس مسلسل غداری پر قادیانی امت نے ہمیشہ فخر و ناز کیا ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود اس سلسلہ میں کرنل لارنس ثابت ہوئے ہیں اور اپنے اس کردار کو اپنے والد کے الہامات اور ارشادات کی تائید بہت قرار دیتے ہیں۔

(۲) قادیانی نبوت نے انگریزی حکومت کی الہامی تائید کر کے برطانوی اقتدار کا اعتماد حاصل کیا نتیجۃً وہ کئی ایک سرکاری محکموں میں بہت زیادہ اثر و رسوخ کے مالک ہیں۔ بعض جگہ سارے کا سارا ضلع ان کے اثر و رسوخ میں ہے۔ کئی ایک ملازمت کے خواہاں اور روزگار کے متمنی لوگ قادیانی امت کی سفارش حاصل کرتے اور ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ہر ضلع کے قادیانیوں کا شعار ہے کہ انتظامیہ کو مختلف تحریکوں کے احوال و وقائع سے مطلع رکھتے اور اس طرح حکام ضلع کا اعتماد حاصل کرتے ہیں۔

(۳) ایک معمولی اقلیت ہونے کے باوجود قادیانی اثرات کا یہ عالم ہے کہ کونسل کے امیدوار ان کے خلیفہ سے رجوع کر کے قادیانی ووٹ حاصل کرتے اور اس طرح قادیانی احتساب کی تحریک سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے بالائی طبقے کو احساس و اندازہ ہی نہیں کہ مرزائی کس مقصد کی تخلیق اور کس فن کے اہل کار ہیں اور ان کی بدولت اسلام اور مسلمانوں پر کیا بیت رہی ہے۔ فی الجملہ قادیانی برطانوی سرکار کی خوشنودی کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں۔

(۴) مسلمانوں کی ملازمتوں پر قبضہ کرنے اور ان کی سیاست کو ہاتھ میں رکھنے کے لیے قادیانی عامتہ المسلمین کی سیاسی وحدت میں رہتے ہیں۔ درنہ ان کے نزدیک تمام مسلمان کافر ہیں۔

چوہدری صاحب علیہ الرحمۃ نے اعلان کیا کہ:

(۱) قادیانی برٹش امپیریلزم کے کھلے ایجنٹ ہیں۔

(۲) وہ استعماری ذہن رکھتے ہیں۔ اردگرد کی غریب آبادی کا بائیکاٹ کرنا اور دوسرے ذرائع سے انہیں مرعوب کرنا ان کا دھندا ہے۔

(۳) وہ مسلمانوں میں ایک نئی گروہ بندی کے طلبگار ہیں، جو مسلمانوں کی جمعیت کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹ دے گی۔

(۴) وہ مسلمانوں میں بطور ففتھ کالم کام کرتے ہیں۔

مرزائیوں نے علماء کی احتسابی تحریکوں کے باوجود قادیان کو اپنی ریاست بنا رکھا تھا۔ میرزا بشیرالدین محمود نے صوبہ کے مختلف اضلاع سے اپنی اُمت کے افراد، بُلوا کر قادیان میں بسا لیے تھے۔ علماء تقاریر جاری کرتے یا وعظ فرماتے، لیکن خم ٹھونک کر مقابلہ میں نہیں آتے تھے۔ حاجی عبدالرحمٰن اور حاجی عبدالغنی نے بٹالہ میں شبان المسلمین کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی۔ دونوں بھائی مقامی رئیس اور رسالت کے فدائی تھے۔ ان سے میرزائی اُمت اس طرح پسپا ہو چکی تھی کہ میرزا بشیرالدین کی سازش سے حاجی عبدالغنی شہید کیے گئے۔ سب شبان المسلمین کے ارکان مختلف علماء کو بُلوا کر سالانہ اجلاس منعقد کرتے اور قادیانیت کی خبر لیتے اور یہی ان کا دائرہ کار تھا۔ ایک سال اجتماع ختم ہونے پر بعض علماء قادیان دیکھنے گئے، تو قادیانی شہ زوری کا حال یہ تھا کہ میرزا بشیرالدین کے ایماء پر میرزائی نوجوانوں نے ان علماء پر حملہ بول دیا۔ انہیں اس بری طرح پیٹا کہ پناہ بخدا! چونکہ مقامی پولیس اور دوسرے حکام میرزا بشیرالدین کی مٹھی میں تھے۔ اس لیے کسی نے رپٹ تک نہ لکھی اور نہ کوئی داد رسی کی۔ اس کے بعد کئی ایک سال تک صحیح العقیدہ مسلمان قادیان جاتے ہوئے ڈرتے۔ احرار نے اس دہشت کو توڑنے کے لیے اپنے چند رضا کار قادیان بھیجے کہ وہاں جا کر مسلمانوں کی مساجد میں اذان دیں کیونکہ میرزائی اپنے سوا کسی کو اذان بھی دینے نہ دیتے تھے۔ رضا کار وہاں پہنچے، اذان دی لیکن قادیانی ڈنڈے لے کر پل پڑے اور ان نوجوان رضا کاروں کو اتنا مارا کہ زخموں سے چور چور ہو گئے۔ وہ مدت تک ہسپتال میں زیر علاج رہے۔ اس بہیمانہ تشدد کے خلاف احرار نے بٹالہ میں کانفرنس کی اور حکومت کو پہلی دفعہ للکارا کہ وہ اپنی چہیتی اُمت

کے مُنہ میں لگام رہے ۔ ورنہ نتائج خطرناک ہوں گے۔ لیکن حکومت کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی اور نہ قادیانی ٹس سے
مَس ہوئے۔ دوسری قادیان کی ریاست کے راجواڑے تھے اور وہاں قانون ان کے اشارۂ ابرو پر حرکت کرتا تھا جب
پانی سر سے گذر گیا اور قادیانی سرکش ہوتے گئے، تو احرار نے جولائی ۱۹۳۵ء میں ورکنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ
اُمرتسر میں فیصلہ کیا کہ قادیان میں احرار کا مستقل دفتر کھولا جائے، جو قادیانی اُمت کے اعمال و افکار کی نگرانی کرے
اس غرض سے مولانا عنایت اللہ کو دفتر کا انچارج مقرر کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسٹر جی۔ ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور کے
الفاظ میں قادیانیوں کا تمرد اور شورہ پشتی اپنی معراج کو پہنچی ہوئی تھی۔ جو لوگ قادیانی جماعت میں شامل ہونے سے
انکار کرتے اُنہیں نہ صرف قادیان سے نکال دیا جاتا، بلکہ بعض اوقات گرُوہ تر مصائب کی دھمکیاں دے کر دہشت
انگیزی کی فضا پیدا کی جاتی۔ مرزا محمود نے عدالتی اختیار اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ قادیان میں دیوانی اور
فوجداری مقدمات کی سماعت کی جاتی۔ جو لوگ مخالف تھے اُن کے مکانوں کو جلا دیا گیا۔ کئی ایک افراد قتل کیے گئے۔
مسٹر کھوسلہ نے اپنے فیصلہ میں اس کی مثالیں بھی دی ہیں۔ ان کے رُوبرو میرزا بشیر الدین محمود نے تسلیم کیا کہ
قادیان میں عدالتی اختیارات استعمال ہوتے ہیں اور ان کی عدالت سب سے آخری اپیل کی عدالت ہے۔ اس غرض سے
قادیانیوں نے اپنے اسٹام بھی چھاپ رکھے تھے۔ مولوی عبدالکریم ایڈیٹر "مباہلہ" شروع میں قادیانی تھے۔ جب
اُنہیں قادیانیت کی صداقت کے متعلق شکوک پیدا ہوئے، تو اس سے تائب ہو گئے۔ ان پر ظلم و ستم شروع ہوا۔ میرزا
محمود نے مولوی عبدالکریم ایڈیٹر مباہلہ کی موت کی پیشن گوئی کی جو الفضل میں چھپی۔ نتیجۃً عبدالکریم پر قاتلانہ حملہ ہوا۔
وہ بال بال بچ گئے لیکن اُن کا ساتھی محمد حسین قتل کر دیا گیا۔ اُس کے قاتل کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ وہ پھانسی پا گیا تو اُس کی
نعش قادیان لائی گئی اور نہایت اعزاز کے ساتھ اُسے بہشتی مقبرے میں دفن کیا گیا۔ اُس کی تعریف میں "الفضل"
کے صفحات سیاہ کیے گئے۔ میرزا بشیر الدین محمود نے اعلان کیا کہ اُس کی رُوح پھانسی پانے سے پہلے ہی خدائے عادل
کے حکم سے پرواز کر گئی تھی۔ مولوی عبدالکریم مباہلہ قادیان سے اُٹھ کر امرتسر چلے گئے۔ اُن کا مکان نذرِ آتش کر
دیا گیا۔ ایک دوسرا قتل میرزائی مبلغ محمد امین کا تھا جس کو کلہاڑی سے قتل کیا گیا۔ ہلاک اس لیے کیا گیا کہ میرزا
بشیر الدین محمود اُس سے ناراض ہو گیا تھا۔ پولیس نے اس سلسلہ میں کوئی کارروائی نہ کی۔ اُس کے قاتل فتح محمد نے
عدالت میں اقرار کیا کہ اُس نے محمد امین کو کلہاڑی سے ہلاک کیا تھا۔ تب قادیان میں میرزائیوں کی طاقت کا یہ عالم
تھا کہ ان کے خلاف کوئی شہادت دینے کی جرأت ہی نہ کر سکتا تھا۔ مسٹر کھوسلہ کے الفاظ میں سرکاری حکام قادیانیت
کے مقابلے میں غیر معمولی حد تک مفلوج ہو چکے تھے۔ اس ہولناک فضا میں احرار کو خیال تھا کہ مولانا عنایت اللہ

قادیان میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ انہیں معلوم تھا کہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ برسرِ عمل ہے اور بعض دنیاوی اغراض کی خاطر میرزائیت کی خوشنودی کو مقدم رکھتا ہے۔ احرار نے مولانا عنایت اللہ کے جانشینوں کی ایک فہرست تیار کر لی اور ہر چہ بادا باد کے تحت کمربستہ ہو گئے۔ میرزا بشیر الدین محمود نے قادیانی ہائی کمان کی میٹنگ بلا کر احرار پر ہاتھ اٹھانے سے اجتناب کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ میرزائی اُمّت کے بلیے یہ سودا مہنگا ہو گا۔ میرزائی اُمّت کے بڑے بڑے افسر انگریز حکام کے پاس پہنچے اور فریاد کی کہ انہیں احرار سے بچایا جائے۔ ادھر احرار قادیان میں ایک تبلیغی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر چکے اور صوبہ بھر کے مسلمان اس میں شمولیت کی دھڑا دھڑ تیاری کر رہے تھے۔ وائسرائے نے صوبائی گورنر کو لکھا۔ گورنر نے بعض اعلیٰ افسروں کی معرفت احرار سے کہا کہ وہ قادیان میں کانفرنس نہ کریں۔ وہاں میرزائیوں کی اکثریت ہے اور اقلیت کو حق نہیں کہ ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے۔ احرار نے جواب دیا قادیان کے سوا میرزائیوں کی اکثریت کہاں ہے؟ اُن کی تبلیغ دوسرے تمام مقامات پر بند کر دی جائے، تو حکومت کی خواہش پر غور کیا جا سکتا ہے۔ میرزا بشیر الدین کی بوکھلاہٹ کا یہ عالم تھا کہ اُس نے کانفرنس کے عرصہ بعد جب چوہدری ظفر اللہ خاں وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر ہو گئے، تو انہیں آمادہ کیا کہ وہ اپنی والدہ کو بے کر کے افسروں سے ملیں اور احرار کے چنگل سے نجات دلائیں۔

پہلی احرار کانفرنس ۲۱-۲۲-۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو بصدارت امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قادیان میں منعقد ہوئی۔ میرزا بشیر الدین محمود کی خوشنودی کے لیے حکومت نے قادیان کے میونسپل حدود میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ احرار نے میونسپل حدود سے باہر کانفرنس کا ایک عظیم الشان پنڈال بنایا۔ پشاور سے دہلی تک ہزارہا لوگوں نے شمول کا اعلان کیا۔ اس غرض سے اسپیشل ٹرینیں چلائی گئیں۔ جب سید عطاء اللہ شاہ بخاری قادیان کے ریلوے اسٹیشن پر اسپیشل ٹرین سے پہنچے، تو ہزارہا عقیدت مندوں نے ان کا استقبال کیا۔ تقریباً دو لاکھ افراد شریکِ اجلاس ہوئے۔ شاہ جی نے دس بجے رات تقریر کا آغاز کیا اور صبح کی اذان تک تقریر جاری رکھی۔ اس تقریر سے قادیانی اُمّت کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ میرزا بشیر الدین نے حکومت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چوہدری سر ظفر اللہ خاں نے وائسرائے اور گورنر سے فریاد کی، تو شاہ جی کے خلاف دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت وارنٹ جاری کر دیے گئے اور انہیں شروع دسمبر ۱۹۳۴ء کو منصوری سے گرفتار کر لیا گیا۔ دیوان سکھا نند مجسٹریٹ گورداسپور کی عدالت میں روداد مقدمہ چھپا۔ میرزا بشیر الدین محمود نے بھی چار دن تک شہادت دی۔ آخر مجسٹریٹ نے ۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء کو چھ ماہ قید بامشقت کا حکم سنایا۔ اس فیصلے کے خلاف سیشن جج گورداسپور کی عدالت میں اپیل کی گئی۔ انہوں نے

لہٰذا شاہ جی کو ضمانت پر رہا کر دیا۔ پھر ۶ جون ۱۹۳۵ء کو ایک تاریخی فیصلہ لکھا، جس سے قادیانی امت بے نقاب ہو گئی۔ مسٹر کھوسلہ نے شاہ جی کے جرم کو محض اصطلاحی قرار دیکر تا اجلاس عدالت قید محض کی سزا دی۔ اس فیصلے نے عوام کے احتساب کو ثبات دیکر خواص کو بیدار کیا۔

مسٹر کھوسلہ کا تاریخی فیصلہ عوام میں لوک گیت کی طرح پھیل گیا۔ مرزائی اس کے مندرجات کی صداقت سے کپکپا اٹھے۔ اب وہ اس تگ و دو میں تھے کہ احرار کی پکڑ سے کیوں کر نکل سکیں۔ لیکن انہیں کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ادھر ایک دو سال میں صوبائی خود مختاری کا آغاز ہو رہا تھا۔ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں سرکاری مسلمان جتھہ بند ہو کر انتخاب جیتنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ پنجاب کا صوبہ مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں میں سب سے اہم تھا۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں انتخابات ہندوؤں اور مسلمانوں کے دوائر میں منقسم تھے لیکن پنجاب واحد صوبہ تھا، جہاں ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ ایک تیسری طاقت سکھ تھی، جو آپس میں کسی حد تک منقسم تھے۔ لیکن اکالی رہنما تمام سکھ نشستوں پر قبضہ کرنے کے متمنی تھے۔ اس انتخابی کشمکش کے ہنگامی پس منظر میں شہید گنج کی مسجد گرائی گئی، جس سے صوبہ کی سیاست یکسر پلٹ گئی۔ اس سے جو تحریک پیدا ہوئی، اس میں احرار نے اس عنوان سے حصہ نہ لیا کہ اس کے مضمرات میں انتخابی اغراض کارفرما ہیں اور باہمی تصادم یا قانون شکنی سے شہید گنج کی بازیابی ممکن ہے۔ احرار محسوس کرتے تھے کہ انگریز کے ایما پر مسلمانوں نے شہید گنج کے انہدام کا جھگڑا اس لیے رچایا ہے کہ ان کے لیے انتخاب کی راہیں مسدود کر دیں۔ احرار حصہ لیتے تو قید ہو جاتے اور انتخاب سرکاری مسلمانوں کے ہاتھ میں رہتا۔ احرار نے حصہ نہ لیا تو مسلمانوں کے قہر و غضب کا شکار ہو گئے اور انتخاب کے نتائج ان کی نفی کر گئے۔ اس تحریک کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کسی ایک مخلص رہنما نے حصہ لیا۔ ان کی طاقت احرار کے خلاف استعمال ہوئی اور جس کا فائدہ سرکاری مسلمانوں کے علاوہ مرزائی امت نے اٹھایا۔ مرزا بشیر الدین محمود نے کئی ایک سیاسی مسلمانوں کو خرید لیا۔ انہوں نے احرار پر تابڑ توڑ حملے کیے جس سے کچھ عرصہ کے لیے مرزائیت کے خلاف مسلمانوں کا زور ٹھنڈا پڑ گیا اور تحریک کا اعلان و افکار کی گرانی میں جوش و خروش مند رہا۔ احرار کے خلاف مسلمانوں کی اس ناراضگی سے مرزائیت قدرے مطمئن ہو گئی، لیکن تابکے؟ ادھر ۱۹۳۷ء میں انتخابات ختم ہوتے ہی سکندر وزارت قائم ہوئی، ادھر شہید گنج کا طلسم ٹوٹ گیا۔ عامۃ المسلمین کو پتہ چل گیا کہ انہدام مسجد کا پس منظر کیا تھا اور انہیں کیونکر فریب دیا گیا۔ احرار نے بعض دوسری سیاسی مصروفیتوں کے باوجود قادیانی محاذ کی توانائی برقرار رکھی۔ اور مسلمانوں کے ذہن سے مرزائی امت کو نکال دیا۔ گو احرار الیکشن میں شکست کھا گئے اور جو لوگ ان کے ٹکٹ پر

منتخب ہونے تھے، دو یونینسٹ پارٹی سے جاملے۔ حضرت مولانا مظہر علی اظہر اور چوہدری عبدالرحمٰن دا ہوں احرار ٹکٹ پر منتخب ہو گئے، لیکن احرار کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ایک قادیانی بھی منتخب نہ ہو سکا۔ میرزا بشیرالدین محمود اس صورتِ حالات سے سخت پریشان تھا۔ اس نے احرار کے خلاف کئی سازشیں کیں۔ ایک طرف برطانوی سرکار کو بھڑکاتا رہا۔ دوسری طرف مسلمانوں میں ان کے خلاف فضا پیدا کرنے میں لگا رہا۔ اس غرض سے پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ اس نے شاہ جی کے قتل کا منصوبہ تیار کیا کہ ان کا وجود قادیان کے لیے پیغامِ اجل تھا اور وہ اس سلسلہ میں ایک ادارہ اور ایک تحریک تھے۔ ان کی تقریروں نے ایک ایسی تحریک پیدا کی کہ اس سے پہلے قادیانی امت کو اس طرز کے عوامی محاذ سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ غرض شاہ جی ان تمام علماء کے احتساب کا مجموعہ تھے جو اب تک قادیانی محاذ پر لڑتے رہے اور اس سلسلہ میں اپنی عمریں بتا چکی تھیں۔

میرزا بشیرالدین محمود نے راجندر سنگھ آتش نام کے ایک سکھ کو، جو نوجوان راقم کے ساتھ ہی منٹگمری سنٹرل جیل میں رہا تھا، دس ہزار روپے کے عوض شاہ جی کے قتل پر تیار کیا۔ اس غرض سے پانچ ہزار روپے پیشگی دیے اور پانچ ہزار قتل کے بعد ادا کرنے کا وعدہ کیا، لیکن راجندر سنگھ نے شاہ جی کو دیکھا، ان کی تقریر سنی تو اپنے ضمیر کو تیار نہ کر سکا۔ میرزا محمود راجندر سنگھ کے انکار سے پریشان ہوا۔ اسے سازش کے منکشف ہونے کا خطرہ تھا۔ اس نے سی آئی ڈی سے سازش کر کے راجندر سنگھ کو کلکتہ میں گرفتار کرا دیا اور اس پر الزام عائد کیا کہ وہ انقلابی پارٹی کا ممبر ہے۔ جب اسے پنجاب لایا گیا، تو اس نے میرزا محمود کی سازش کے انکشاف کا ارادہ کیا کہ وہ اس حقیقتِ حال سے عدالت کو مطلع کریگا اور بتلائے گا کہ اس کی گرفتاری میرزائی امت کی سازش سے ہوئی ہے۔

میرزا بشیرالدین کو خطرہ تھا کہ وہ شاہ جی کے قتل کی سازش آشکارا کرے گی۔ جب راجندر سنگھ کا ارادہ پولیس کے علم میں آیا، تو صوبائی گورنمنٹ کے حکم پر اس کو فی الفور رہا کر دیا گیا، لیکن شاہ جی کے خلاف میرزائی افسروں کی پشت پر بغاوت وغیرہ کے جرم میں کئی مقدمات تیار کیے گئے۔ ادھر ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ احرار نے برطانیہ کی جنگی اعانت کے خلاف تحریک کا آغاز کیا، تو ایک دوسرا محاذ کھل گیا اور تمام احرار رہنما سنگین مقدمات میں گرفتار کر لیے گئے، حتیٰ کہ بعض نمایاں کارکن بھی جیل میں ڈال دیے گئے۔ بعض کو نظربند کیا گیا۔ بعض کو طویل سزائیں دی گئیں۔ اس طرح جنگ کے دوران تمام نقشہ بدل گیا۔ شاہ جی کے مقدمہ میں سرکاری رپورٹر لدھا رام منحرف ہو گیا۔ اس نے عدالت کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ شاہ جی کی تقریر اس نے وزیراعظم سکندر حیات کی ہدایت اور مسٹر براڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ایما پر وضع کی ہے، تاکہ انہیں

بڑی سے بڑی سزا دی جا سکے۔ اس انحراف و انکشاف سے شاہ جی کا مقدمہ لاہور ہائی کورٹ میں چلا گیا۔ چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ اور جسٹس رام لال پر مشتمل ڈویژن بنچ نے سماعت کی اور شاہ جی کو بری کر دیا۔ اس کے بعد حکومت کو کان ہو گئے اور اس نے دوران جنگ شاہ جی کے خلاف کوئی مقدمہ قائم نہ کیا۔ دوسرے تیسرے سال کئی ایک احرار رہنما قید گزار کر رہا ہو گئے۔ جنگ کا زمانہ تھا لیکن احرار نے قادیانی محاذ کو شدت سے قائم رکھا اور مرزائی امت کی اس طرح نگرانی کی کہ وہ اپنے طور سے کوئی سازش نہ رچا سکی۔ ادھر مسلم لیگ نے اوائل ۱۹۴۰ء میں پاکستان کا نصب العین اختیار کیا۔ احرار اس سے متفق نہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ احرار مسلمانوں میں سیاستہً کمزور ہو گئے۔ تاآنکہ مسلمان ان سے برگشتہ ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو ہندوستان کے سیاسی مستقبل سے متعلق برطانوی حکومت کے نمائندوں سے گفتگو شروع ہوئی۔ اس کا ایک مرحلہ جنرل انتخابات تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس کے خلاف تھے کہ احرار انتخابات میں حصہ لیں لیکن مولانا مظہر علی اظہر نے مسلم لیگ سے ٹکر لے کر ایسی بے اتفاقی کی کہ احرار مسلمانوں کے غیظ و غضب کا شکار ہو گئے۔ مرزا بشیر الدین محمود نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے احرار کے خلاف اس غرض سے لاکھوں روپیہ صرف کیے کہ انہیں مسلمانوں میں جماعتی حیثیت سے ختم کرا دیں۔ گو اپنی جماعت کے لیے مسلمانوں میں وہ کوئی جگہ پیدا نہ کر سکے لیکن سیاسی مسلمانوں میں انہیں قدم رکھنے کا موقع مل گیا اور جو لوگ آزادی کے وارث ہو رہے تھے۔ ان کے نزدیک قادیانی سیاستہً مسلمان ہی تھے، لیکن عوام احرار سے ناراضی کے باوجود قادیانیت کو مسترد کر چکے تھے۔ اور مذہبی مسلمان ہی منبر و محراب کی معرفت احرار ہی سے متاثر تھے۔ پاکستان قائم ہوا، تو احرار دو حصوں میں بٹ گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ہندوستان کے ہو گئے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا محمد علی جالندھری اور شیخ حسام الدین وغیرہ پاکستان آ گئے۔ احرار نے حالات کو محسوس کرتے ہوئے سیاست سے ہاتھ اٹھا لیے شاہ جی عملاً سبکدوش ہو گئے۔ مرزا بشیر الدین محمود نے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کیے۔ وہ قادیان سے اٹھ کر لاہور آ گیا اور یہاں جودھامل بلڈنگ (نزد میو ہسپتال) میں قیام کیا۔ اس نے مختلف اخبار نویسوں سے ناطہ باندھا۔ کئی ایک کو رام کیا اور لا کالج لاہور کے مینارڈ ہال میں پاکستان کے بعض سیاسی مسائل پر تقریریں شروع کیں۔ بالخصوص مسئلہ کشمیر پر اس نے شرح و بسط سے اظہار خیال کیا۔ ظاہر ہے کہ سرکاری مسلمان تو پہلے ہی فراخدل تھے۔ ان تقاریر سے بعض سیاسی مسلمان بھی متاثر ہوئے۔ ادھر عوام میں قادیانی امت نے رسوخ حاصل کرنا چاہا۔ احرار اس وقت منتشر تھے۔ ان کا ترجمان "آزاد" راقم کی ادارت میں نکل رہا تھا۔ راقم

نے اُڑا دیں میرزا بشیر الدین محمود کا نوٹس لیا۔ اس کے علاوہ شروع ۱۹۴۸ء میں احرار کے زیر اہتمام کوئی تبلیغی جلسہ تھا راقم نے اس میں میرزائیت کے کفر کا اعلان کرتے ہوئے ظفر اللہ خاں کے تقرر پر احتجاج کیا اور یہ پاکستان میں اس سلسلہ کی پہلی آواز تھی۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے راقم کو خط لکھا کہ پاکستان میں اللہ تعالیٰ نے اس عنوان سے اعلائے کلمۃ الحق کا سہرا تمہارے سر باندھا ہے۔ یہ خط ۱۹۴۸ء کے چٹان میں شائع کیا گیا۔

میرزا بشیر الدین محمود پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پہلے پاکستان کو اپنے مسلک کی موت سمجھتے لیکن مباشتہ گو مگو کی حالت میں تھے جسٹس منیر کی رپورٹ (اردو ایڈیشن) کے صفحہ ۲۱۰ پر بھی اس کا ذکر موجود ہے کہ وہ (میرزا بشیر الدین محمود) قیام پاکستان کے خلاف تھے۔ میرزا صاحب نے اپنی ایک تقریر میں کھلا اعلان کیا تھا "موجودہ ملکی تقسیم غلط ہوئی ہے۔ وہ تقسیم ختم کرانے اور دونوں ملکوں کے باہمی افتراق دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس عارضی تقسیم کو کسی نہ کسی طرح ختم کیا ہی جائے گا اور ہندوستان اور پاکستان پھر سے اکھنڈ ہندوستان بنا دیا جائے گا۔

میرزا صاحب کی یہ تقریر ان کی جماعت کے آرگن الفضل میں چھپی۔ اس کے علاوہ میرزا صاحب نے منیر انکوائری کمیٹی کے روبرو تسلیم کیا کہ انہوں نے ۱۱ جون ۴۴ء کو اپنی ایک تقریر میں پاکستان کے مطالبہ کو غلامی مضبوط کرنے والی زنجیر قرار دیا تھا۔ اسی طرح ۳ جون ۱۹۴۷ء کو میرزا صاحب نے بہ عنوان "سکھ قوم کے نام دردمندانہ اپیل" ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں یہ الفاظ تھے کہ میں دعا کرتا ہوں اے میرے رب میرے اہل ملک کو سمجھ دے۔ اول تو یہ ملک بٹے نہیں اور اگر بٹے تو اس طرح بٹے کہ پھر مل جانے کے راستے کھلے رہیں۔ اللھم آمین۔

چوہدری سر ظفر اللہ خاں کے بھتیجے کا نکاح ۳ اپریل ۱۹۴۷ء کو تھا۔ میرزا صاحب نے اس تقریب میں بھی اسی طرز کے خیالات کا اظہار کیا اور فرمایا کہ انہیں کوشش کرنی چاہیے کہ یہ حالت جلد دور ہو اور اکھنڈ ہندوستان بنے جہاں ساری قومیں شیر و شکر ہو کر رہیں۔ (ملاحظہ ہو الفضل ۵ اپریل ۱۹۴۷ء)

اسی طرح ۱۴ مئی ۱۹۴۷ء کو میرزا صاحب نے اپنی مجلس علم و عرفان میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہندوستان کو اکٹھا رکھنا چاہتی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم پر اگر ہم راضی ہوئے تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے، پھر یہ کوشش کریں گے کہ جلد سے جلد متحد ہو جائیں۔

یہ تو خیر قبل از تقسیم کی باتیں تھیں لیکن پاکستان میں قادیانی اُمت نے تاریخ احمدیت* کی تدوین شروع کی تو اس کی دسویں جلد کے صفحہ ۲۴۹ پر لکھا کہ:

ہم دل سے پہلے ہی اکھنڈ ہندوستان کے قائل تھے جس میں مسلمان کا پاکستان اور ہندو کا ہندوستان

برضا و رغبت شامل ہوں اور اب بھی ہمارا عقیدہ وہی ہے۔"

میرزا صاحب کے خیالات ان کے بیٹے لفظ بہ لفظ کی آواز تھے اور تمام قادیانی بہ دل و جان ان کے مؤید تھے۔ میرزا صاحب کے بھائی اور مسٹر ایم۔ ایم۔ احمد کے والد میرزا بشیر احمد ایم۔ اے نے بھی ان ہی خیالات کا اظہار کیا اور اپنے کئی پمفلٹوں میں اس خیال کا اعادہ کیا کہ وہ تقسیم سے راضی نہیں، اکھنڈ ہندوستان کی طرف جانا چاہتے ہیں لیکن پاکستان بن گیا تو میرزا بشیر الدین محمود نے پینترا بدلا اور پاکستان کو اپنے تصرف میں لینے کا عزم کیا۔ سر ظفر اللہ خان پہلے دن سے وزیر خارجہ تھا۔ جس کے سپرد دو کام تھے۔ ایک مختلف مقامات کے میرزائی افسروں کا تحفظ، دوسرا وزارت خارجہ میں میرزائی افسروں کی بھرتی۔ اس طرح مختلف ممالک کے سفارت خانوں میں قادیانی عہدیداروں کی بھرمار ہو گئی۔ انہوں نے مختلف اسلامی ملکوں میں نہ صرف اپنے تبلیغی مشن قائم کیے، بلکہ بعض عرب ملکوں میں خفیہ اہلکار متعین کیے جو عالمی سامراج کی ہدایات پر کام کرتے اور دوہری تنخواہ پاتے تھے۔ چودھری ظفر اللہ خان کا خفیہ کام کابینہ کے اندرونی راز اور بعض اہم سرکاری فیصلے میرزا بشیر الدین محمود تک پہنچانا تھا۔ جب تک قائد اعظم زندہ رہے، چودھری ظفر اللہ خان چوکنا رہا۔ خان لیاقت علی خان کی شہادت تک اس نے زیادہ پاؤں نہ پھیلائے لیکن خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم ہو گئے، تو اس نے تمام حدود پھاند ڈالے اور بلا جھجک قادیانیت کے پھیلاؤ میں منہمک ہو گیا۔ میرزا بشیر الدین محمود نے اپنے خطبات میں زور دینا شروع کیا کہ ان کے مرید تمام محکموں میں بھرتی ہوں اور اس طرح فوج، پولیس، ایڈمنسٹریشن، ریلوے، فنانس، اکاؤنٹس، کسٹمز اور انجینئرنگ پر چھا جائیں۔ (ملاحظہ ہو الفضل ۱۱ر جنوری ۱۹۵۲ء)

اسی سال میرزا بشیر الدین نے خطبہ دیا کہ ۱۹۵۲ء گزرنے نہ پائے کہ دشمنوں پر احمدیت کا رعب غالب آ جائے اور وہ مجبور ہو کر احمدیت کی آغوش میں آ گریں۔"

اس سے پہلے میرزا بشیر الدین نے دسمبر ۱۹۵۱ء کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ "وقت آنے والا ہے، جب یہ لوگ (مخالفین و منکرین) مجرموں کی حیثیت میں میرے سامنے پیش ہوں گے۔"

میرزا صاحب نے ۱۶ر جولائی ۱۹۵۲ء کے خطبہ میں فرمایا:

"اپنا بیگانہ، کوئی اعتراض کرے، کوئی پروا نہیں۔ ہونا وہی ہے جو میں نے کہا ہے اور وہی ایک دن ہم کر کے رہیں گے۔ (الفضل ۲۹ر جولائی ۱۹۵۲ء)

میرزا صاحب نے ۲۳ر جولائی ۱۹۴۸ء کو فرمایا کہ وہ بلوچستان کو احمدی صوبہ بنانا چاہتے ہیں، منیر انکوائری

رپورٹ میں میرزا صاحب کے اس اعلان پر تبصرہ کرتے ہوئے ججوں نے لکھا کہ ان کی تقریر نہ صرف نامناسب بلکہ غیر مآل اندیشانہ اور اشتعال انگیز تھی (رپورٹ اردو میں صفحہ ۲۸۰)

میرزا صاحب نے بلوچستان کو قادیانی صوبہ بنانے کا اعلان اُس کے آخری انگریز ایجنٹ مسٹر جیفرے سے مل بھگت سے کیا اور مسٹر ڈی۔ وائی فل اور مسٹر ہنڈرسن سے بیعت دریز کرنے کے بعد اس خوش فہمی کا شکار ہوگئے کہ بلوچستان اُن کی ریاست ہوگا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اب صوبہ بلوچستان ہمارے ہاتھوں سے نکل نہیں سکتا۔ یہ ہماری شکارگاہ ہوگا۔ دُنیا کی ساری قومیں مل کر بھی ہم سے یہ علاقہ چھین نہیں سکتیں۔

میرزا صاحب کا یہی اصل روپ تھا۔ جب تک انگریز رہا وہ مذہب کی کمین گاہ میں بیٹھ کر انگریز کی سیاسی خدمات انجام دیتے رہے۔ انگریز چلا گیا تو سیاسی شاطر کی حیثیت سے سامنے آگئے اور قادیانیت کو برسرِ اقتدار لانے کی جدوجہد میں سرگرم ہوگئے۔ میرزا صاحب اس خیال سے مطمئن تھے کہ احرار جیسی فعال جماعت مسلم لیگ سے ٹکراؤ کے باعث متروک ہو چکی ہے۔ دوسرے علماء ان سے ٹکر لینے کا حوصلہ نہیں رکھتے اور نہ انہیں مسلم لیگ کی تن آسان لیڈرشپ سے کسی مزاحمت یا مداخلت کا خطرہ ہے۔ خود لیگ میرزا صاحب کی سیاسی تیاریوں سے بے خبر تھے۔ ان کے نزدیک قادیانیت صرف ایک مذہبی مسئلہ تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ ختم نبوت کے مسئلہ پر کلام کرتے تھے۔ میرزا محمود ان حالات میں بطور ایک سیاسی شاطر کے حصولِ اقتدار کیلئے بے جھجک ہوتے گئے۔ ان کی خودسری کا یہ حال تھا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اسی گھمنڈ سے باتیں کرتے گویا ملک کی حکومت ان کے ہاتھ میں ہے۔ چوہدری ظفر اللہ خاں عالمی سطح پر اس کی شہ پر کام کرتے اور ملک میں جہاں کہیں جس عہدے پر کوئی میرزائی افسر تھا، وہ کھلا اعلان اپنے فرقہ کی خدمت کرتا اور اپنے عقیدے کی تبلیغ میں بے باک تھا۔ احرار کا تبلیغی عنصر اس سے غافل نہ تھا لیکن کاروباری سیاسی مسلمانوں کو یہ تاثر دینے میں کامیاب تھے کہ ان کے خلاف جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ مختلف اسلامی فرقوں کے تنازعات کی پرانی آویزش اور مسجد و محراب کی باہمی خصومت کا پرانا ورثہ ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر دسمبر ۱۹۴۹ء تک خانہ نشین رہے لیکن وا قعہ دسمبر میں پاکستانی فوج کے ایک لیفٹیننٹ کرنل نے اپنے ایک سی۔ایس۔پی دوست کے ہمراہ شاہ جی سے ملاقات کی اور بیان کیا کہ ہم پاکستان سے پہلے قادیانیت سے متعلق علماء کے تعاقب کو فی الواقعہ ایک فضول مذہبی جھگڑا سمجھتے تھے۔ آپ لوگ جب قادیانیت کے متعلق لب و لہجہ اختیار کرتے تو خیال ہوتا کہ یہ ملائیت کی خصوصیت ہیں یا احرار کی افتادِ طبیعت کہ وہ ذہنی طور پر مشغول رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد جو حقائق ہمارے مشاہدے میں آئے اور جن

تجربوں سے ہم گذر رہے ہیں وہ اتنے سنگین ہیں کہ پاکستان کی مرزائیوں کی لیڈرشپ کے بعد :

(۱) اپنی موجودہ ہیئت کھو بیٹھے گا اور اس کا کوئی دوسرا نقشہ ہوگا۔

(۲) یا ہندوستان کی طشتری میں کسی نہ کسی شکل میں پلٹ جائے گا۔

(۳) یا اس کی حیثیت ایک مرزائی ریاست کی سی ہوگی۔

ان تینوں میں جو شکل جس طرح قائم ہوگی، اس کے پس منظر میں مرزائی ہوں گے۔ اس غرض سے وہ اندرخانہ اپنے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ شاہ جی نے ان سے کہا کہ آپ یہ سب باتیں ملک کے وزیراعظم خان لیاقت علی خاں کے نوٹس میں لائیں اور ان سے کہیں کہ اپنی کسی متعلقہ ایجنسی کی معرفت جملہ معلومات حاصل کریں۔" کرنل نے کہا :

" شاہ جی! ہماری اصل مصیبت یہ ہے کہ حکمران جماعت دین سے معاشرتی دلچسپی رکھتی ہے، مذہبی نہیں — وہ اولاً اپنی ذات، ثانیاً اپنی جماعت پھر اس کے حدود میں اپنے مقاصد و مصالح دیکھتی ہے۔ اسے اسلام اور اس کی دعوت کے معتقدات و مقتضیات سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کو بتائیں کہ مرزائی کیا ہیں؟ آپ نے اس داستان کا نوٹس لیا اور اس طرح کوئی تحریک بن گئی، تو لازماً حکمران جماعت آگاہ ہوگی۔ نتیجۃً مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر کی بیداری سے قادیانی امت کو بھی احتساب کا اندیشہ ہوگا اور اس طرح وہ خطرہ جو ہم محسوس کرتے ہیں، ٹل جائے گا۔ اس وقت سوال مسلمان عوام اور مسلمان حکام کو اس فتنہ کے علمی برگ و بار اور اس کی عملی تگ و دو کے نقش و نگار سے مطلع کرنے کا ہے۔ میرے ساتھ یہ سی ایس پی افسر ہیں اور وزارت خارجہ میں اہم عہدہ پر فائز ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خاں پاکستان کا وزیر خارجہ ہے، لیکن اس کے منصب کا فائدہ مرزائیت کو پہنچ رہا ہے۔ وہ بیرونی دنیا میں پاکستان کی نمائندگی کے بجائے اپنی جماعت کی نمائندگی کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ اس نے بیرونی ملکوں میں قادیانی امت کے لیے سیاسی و معاشی رابطے مہیا کیے ہیں۔ اگر مرزائی یہاں کامیاب ہوگئے تو بین الاقوامی ممالک کی معرفت قادیانیت کو اندرون ملک تحفظ ملے گا۔"

شاہ جی ان باتوں سے کس قدر آزردہ ہوگئے۔ کہنے لگے کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کس سے کہوں؟ اور کیسے کہوں۔ بوڑھا ہوگیا ہوں۔ اب ہمت نہیں رہی۔ کرنل صاحب بولے، شاہ جی پاکستان کو اس خطرہ سے آپ نکال سکتے ہیں۔ آپ کی چند تقریریں موجودہ حکمرانوں کے کان کھول دیں گی اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ملک زلزلہ کس قدر خطرہ میں ہے۔ شاہ جی کچھ دیر گم سم رہے۔ یکایک دو چار ہچکیاں آئیں اور چہرہ اشکبار ہوگیا، پھر اسی سلسلے میں دو تین ماہ غور کرتے رہے اور اپریل ۱۹۵۲ء کو لاہور میں احرار کانفرنس منعقد کی۔ اس کے بعد کانفرنس

کی مجلس عاملہ میں میرزائیت کے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ آخر یہ طے پایا کہ مجلس احرار کو سیاست سے سبکدوش کر دیا جائے۔ اس کا مشن صرف تبلیغی اور اصلاحی سرگرمیوں تک محدود رہے اور یہی ایک طریق ہے جس سے میرزائیت کا بھرپور احتساب ہو سکتا ہے۔ شاہ جی کا خیال تھا کہ احرار نے اپنا سیاسی وجود باقی رکھا تو میرزا بشیرالدین محمود کو وار کرنے میں آسانی ہوگی اور مسلم لیگ کی لیڈرشپ کسی حالت میں بھی احرار کے سیاسی وجود کو برداشت نہیں کرے گی۔ احرار کے اس فیصلے سے میرزا بشیرالدین محمود چوکنا ہو گئے لیکن انہوں نے اپنی جارحانہ سرگرمیوں کو جاری رکھا اور اس امر کی مطلقاً پرواہ نہ کی کہ عامۃ المسلمین اس سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ میرزا بشیرالدین محمود، سر ظفر اللہ خاں کی معرفت عالمی سامراج سے اس امر کا یقین حاصل کر چکا تھا کہ میرزائیوں کے لیے پاکستان میں کوئی خطرہ نہیں اور پاکستان ان کے مستقبل کا ضامن ہے۔

احرار نے سیاسی حیثیت ختم کرنے کے بعد قادیانیت کے احتساب پر گرما گرم جلسوں اور جگہ جگہ کانفرنسیں شروع کیں۔ منیر انکوائری رپورٹ میں ان کی تفصیلات موجود ہیں۔ احرار نے میرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا اپنے ہر جلسہ اور ہر کانفرنس میں مطالبہ کیا حتیٰ کہ چوہدری ظفر اللہ خاں کو بھی اس کی پس پردہ سرگرمیوں پر آڑے ہاتھوں لیا۔ وزارت خارجہ سے اس کی سبکدوشی کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ میرزا محمود نے احرار کے خلاف اپنے حربے استعمال کرنا شروع کیے۔ وہ اس خیال میں تھا کہ احرار مر چکے ہیں اور قادیانیت کی راہ میں کوئی مزاحم نہ ہوگا لیکن احرار نے اس شدت سے احتساب کیا کہ میرزا محمود تھرا گیا۔ اس نے کئی واسطوں سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اکثر سرکاری ملازم پہلے ہی اس کے ساتھ تھے اور سیاسی مسلمان قادیانیت کے متعلق علما کے احتساب کو ملائیت گردان کر غیر جانبدار تھے۔ میرزا محمود نے سیاسی مسلمانوں کو ساتھ ملا کے رکھا۔ بعض کو ہاتھ میں لینا شروع کیا۔ کئی ایک خود فروش صحافی خریدے، جو احرار کے سیاسی ماضی پر پاکستان دشمنی کا الزام اچھالتے۔ ان کے خلاف کہانیاں وضع کرتے اور ان کی بعض تقریروں کو اپنے ڈھلے ہوئے فقروں سے داغدار کرتے۔ میرزا محمود کا شعار تھا کہ بعض افسروں کی نفسی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا، اپنے مریدوں کی معرفت ان کے لیے نازونوش اور لہو و لعب کی محفلیں رچاتا اور احرار کے متعلق ان کی ذہنی فضا کو مسموم کرتا۔ اس طرح کے افسر پہلے ہی انگریزی استبداد کی ذریت تھے، ان کا ذہن احرار کے متعلق وہی تھا، جو انگریز نے تیار کیا تھا۔ اس سلسلہ میں پنجاب سی۔آئی۔ڈی کا رویہ صد درجہ مذموم رہا کیونکہ اس کے افسر بجز ایک آدھ کو چھوڑ کر تقریباً سبھی برطانوی استبداد کے ذلہ خوار اور اب میرزا بشیرالدین کی مختلف الاصل تحریصات و ترغیبات کا شکار تھے۔ میرزا صاحب بدستور

اس خیال میں تھے کہ عالمی سامراج ان کی مدد کرے گا اور وہ بلوچستان کو اپنی ریاست بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہوں نے اپنی سیاسی سر و بازی کے لیے ۱۹۴۸ء میں کوئٹہ جا کر بعض پتے لگانا شروع کیے لیکن انہیں اندازہ و احساس ہی نہ تھا کہ بلوچستان کا مسلمان دین کے بارے میں کس قدر ذکی الحس ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک میرزائی میجر محمود کو جو کوئٹہ میں قادیانیت کے خلاف ایک جلسہ گاہ کا جائزہ لے رہا تھا کسی ایک سرکار نے پکڑ کر ہلاک کر دیا۔ اس سے حکومت پاکستان کے انٹیلی جنس بیورو کو بڑی سخت تکلیف ہوئی۔ اس نے احرار کے خلاف پنجاب سی آئی۔ ڈی کو لکھا کہ احرار کی سرگرمیاں پاکستان کے لیے مضرت رساں ہیں۔

مسٹر ایم۔ ایم۔ احمد منٹگمری (ساہیوال) میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کی بدولت میرزائیوں کو حوصلہ ہوا کہ مختلف گاؤں میں جا کر تبلیغ کریں۔ اس سے مسلمانوں کا برافروختہ ہونا قدرتی امر تھا۔ نتیجۃً اوکاڑہ میں ایک میرزائی مقدس غلام محمد قتل ہو گیا۔ اسی مہینہ راولپنڈی میں بدرالدین نام کے ایک قادیانی کو ولایت خاں نام کے ایک مسلمان نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ میرزا بشیرالدین اندرون خانہ ہراساں ہوا لیکن ربوہ میں بیٹھ کر کئی طرح کی سیاسی و مذہبی سازشوں میں مشغول رہا۔ اس کو یقین تھا کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گا کیونکہ ظفراللہ خاں کی معرفت سامراجی طاقتوں کے سفارت خانے اس سے رابطے قائم کیے ہوئے تھے۔ ادھر میرزا محمود نے اپنے خطبات میں احرار رہنماؤں کے متعلق جارحانہ کلمات روزمرہ بنا رکھے تھے۔ وہ بعض میرزائی عناصر سے پخت و پز کر کے احرار رہنماؤں کو قتل کروانا چاہتا تھا لیکن اسے کوئی ایسا معتمد نہیں مل رہا تھا جو یہ کام کر سکے۔ وہ مسلمانوں کے ردعمل سے بھی ڈرتا تھا۔ لیکن اس نے احرار کے اینٹی لیگ ماضی میں پناہ لے رکھی تھی اور اسی برتے پر اشتعال انگیز تقریریں کر رہا تھا۔ اس نے ۱۵ر جنوری ۱۹۵۲ء کو (مطبوعہ الفضل) اعلان کیا کہ علمائے ذیل سے خون کا بدلہ لیا جائے گا:

(۱) سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ (۲) ملا عبدالحامد بدایونی

(۳) ملا احتشام الحق تھانوی (۴) ملا مفتی محمد شفیع

(۵) ملا مودودی

ان علماء کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے احرار کی دعوت پر میرزائیت کے عزائم کا عمیق مطالعہ کیا اور قادیانیت سے متعلق مشترکہ لائحہ عمل میں ہم آواز ہو گئے۔ میرزا بشیرالدین اور چوہدری سر ظفراللہ خاں اس قدر دلیر ہو چکے تھے کہ روز بروز جماعت المسلمین سے بے پروا ہوتے گئے۔ سر ظفراللہ خاں نے ۱۸ر مئی ۱۹۵۲ء کو جہانگیر پارک

کراچی میں قادیانی اُمت کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کرنے کا اعلان کیا۔ مسلمانوں نے اسے اپنے لیے چیلنج سمجھا اور مساجد میں اس پر احتجاج کیا۔

خواجہ ناظم الدین وزیراعظم پاکستان نے انٹیلی جنس بیورو کی رپورٹ پر چوہدری ظفر اللہ خاں کو جلسہ میں شریک ہونے سے منع کیا لیکن چوہدری صاحب استکبار کے گھوڑے پر سوار تھے۔ اپنے وزیراعظم کی بات نہ مانی۔ اُن سے کہا کہ وہ (خواجہ صاحب) اس بات پر مُصر ہوں، تو وہ اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے کو تیار ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب امریکی وزیر خارجہ نے وزیراعظم پاکستان کو یہ تاثر دیا کہ چودھری ظفر اللہ خاں کو راضی نہ رکھا گیا تو امریکہ پاکستان کی مدد کرنے کو تیار نہ ہوگا، حتیٰ کہ گندم مہیا کرنا مشکل ہو جائے گا جس کی پاکستان کو اس وقت سخت ضرورت ہے۔ اس کا انکشاف خواجہ صاحب نے انکوائری کمیٹی کے رُوبرو شہادت دیتے ہوئے کیا۔ چوہدری ظفر اللہ خاں نے کراچی کے جلسۂ عام میں کہا کہ "احمدیت ایک ایسا پودا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود لگایا ہے۔ اب وہ جڑ پکڑ گیا ہے۔ اگر یہ پودا اکھاڑ دیا گیا، تو اسلام ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے باقی نہ رہے گا، بلکہ ایک سُوکھے ہوئے درخت کی مانند ہو جائے گا اور دُوسرے مذاہب پر اپنی برتری کا ثبوت مہیا نہ کر سکے گا۔ (تحقیقاتی رپورٹ اُردو متن صفحہ ۸۳) اس عنصر کے ردِّ عمل میں فساد ہو گیا، نتیجۃً مرزائیوں کی بعض عمارتوں کو نقصان پہنچا۔ احرار یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے اور مرزائی مُنہ زوری کے علاوہ سینہ زوری پر تُل گئے ہیں تو مولانا لال حسین اختر نے کراچی میں مختلف مکاتیبِ فکر کے علماء کی ایک میٹنگ بلائی۔ ان کے سامنے تمام واقعات رکھے اور ۲ جون ۱۹۵۲ء کو ایک مجلسِ مشاورت طلب کی۔ اس کے دعوت نامے پر مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا یوسف کلکتوی اور مولانا لال حسین اختر کے دستخط تھے۔ اس مجلسِ مشاورت نے ذیل کے مطالبات مرتب کیے:

(۱) قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

(۲) چوہدری ظفر اللہ خاں کو وزیر خارجہ کے عہدے سے سبکدوش کیا جائے۔

(۳) تمام کلیدی عہدوں سے احمدیوں کو ہٹایا جائے۔

اس غرض سے آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اجلاس کی صدارت فرمائی اور کنونشن منعقد کرنے کے لیے ایک بورڈ مقرر کیا گیا۔ اس کے ارکان حسبِ ذیل تھے:

علامہ سید سلیمان ندویؒ، مفتی محمد شفیعؒ، مولانا عبدالحامد بدایونی، علامہ یوسف کلکتوی، علامہ [illegible] صاحب،

مولانا سلطان احمد، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا لال حسین اختر، الحاج ہاشم گزدر اور مفتی جعفر حسین مجتہد۔ مولانا احتشام الحق تھانوی کوئٹہ پہنچ گئے۔ الحاج محمد ہاشم گزدر کے مکان پر بورڈ کا اجلاس ۱۳؍جولائی ۱۹۵۲ء کو ہوا۔ مندرجہ ذیل چودہ جماعتوں کو آل پارٹیز کنونشن میں شمول کے لیے دعوت نامے جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا:

(۱) جمعیت العلمائے پاکستان (۲) جمعیۃ العلمائے اسلام
(۳) جماعت اسلامی (۴) تنظیم اہلسنت والجماعت
(۵) جمعیۃ اہل سنت (۶) جمعیت اہلحدیث
(۷) موتمر اہلحدیث پنجاب (۸) ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پنجاب
(۹) مجلس تحفظ ختم نبوت (۱۰) مجلس احرار اسلام
(۱۱) جمعیۃ العربیہ (۱۲) جمعیۃ الفلاح

سید عطاء اللہ بخاری مرزائی سیاست کے اُتار چڑھاؤ کا گہرا مطالعہ کر رہے تھے۔ انہوں نے رفقاء کو ہدایت کی کہ ہر مکتبِ خیال کے علماء سے مل کر انہیں قادیانی اُمت کے عزائم سے آگاہ کریں۔ پھر اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے جو راستہ سب کی رائے ہو اسی کے مطابق عمل کیا جائے۔ اس غرض سے شاہ جی نے ۱۳؍جولائی ۱۹۵۲ء ہی کو لاہور میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقد کی جس میں صوبہ بھر کے علماء و مشائخ نے شرکت کی۔ اس غرض سے جو دعوت نامہ جاری کیا گیا، اس پر مولانا غلام محمد ترنم، مفتی محمد حسن، مولانا احمد علیؒ، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا داؤد غزنویؒ، مولانا نور الحسن بخاری اور سید مظفر علی شمسی کے دستخط تھے۔ اس کانفرنس میں سیدنا مہر علی شاہؒ کے فرزند ارجمند حضرت سید غلام محی الدین شاہؒ تشریف لائے۔ اس کانفرنس میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دیئے جانے، سر ظفر اللہ کو وزارتِ خارجہ سے ہٹائے جانے اور قادیانی افسروں کو کلیدی آسامیوں سے الگ کیے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔ ادھر کراچی میں ۱۳؍جولائی ہی کو اس امر کا فیصلہ کیا گیا کہ مسئلہ قادیانیت پر آخری غور و خوض کرنے کے لیے ۱۶، ۱۷، ۱۸؍جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں تمام مکاتبِ فکر کی کنونشن منعقد کی جائے۔ اس ابتدائی اجتماع میں شرکت کے لیے مولانا ابوالحسنات قادری، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا مرتضیٰ احمد میکش لاہور سے کراچی گئے اور کنونشن کی تیاریوں کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ یہ کوئی معمولی چیز نہ تھی بلکہ مرزائیت کے شدید احتساب کی طرف ایک فیصلہ کن اقدام تھا۔ چونکہ یہ سب کچھ احرار رہنماؤں کی مساعی سے ہو رہا تھا، لہٰذا

مرزا بشیر الدین محمود احرار کے خلاف محاذ قائم کیے ہوئے تھے اور ان کی ملی بھگت سے احرار کے خلاف مقدمات قائم کیے جا رہے تھے، چنانچہ شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہم گرفتار کیے گئے۔ اس قہر شاہی کا خمیازہ ۱۸ جولائی ۱۹۵۲ء کو اہل ملتان نے بھگتا کہ تھانہ کپ کے باہر پولیس نے احتجاجی جلوس پر فائرنگ کی جس سے تین آدمی شہید اور تیرہ زخمی ہو گئے۔ ان زخمیوں میں سے بھی تین ہسپتال میں دم توڑ گئے۔ لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج کو انکوائری پر مامور کیا گیا۔ اس نے پولیس فائرنگ کی حمایت کی، لیکن ان شہیدوں کا خون رنگ لایا۔ تمام صوبے میں مرزائیوں کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی، حتیٰ کہ پنجاب مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے بھی مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا ریزولیوشن پاس کیا۔ اس سلسلے میں عوام کے جذبات کا یہ حال تھا کہ منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق ۵ مارچ ۱۹۵۳ء سے پہلے صوبہ بھر میں ۳۹۰ جلسے منعقد ہوئے تھے، جن میں سے ۱۳۳ کا اہتمام مجلس احرار کی مختلف شاخوں نے کیا اور ان میں محولہ بالا مطالبات کی تائید کی گئی۔ جو علماء کراچی کانفرنس میں شریک ہوئے وہ یہ تھے:

(۱) مولانا ابو الاعلیٰ مودودی (۲) سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ (۳) مولانا ابو الحسنات قادریؒ
(۴) مولانا محمد یوسف بنوری (۵) مولانا احمد علی لاہوریؒ (۶) مولانا ابراہیم میر سیالکوٹ
(۷) مولانا شمس الحق وزیر معارف قلات (۸) خلیفہ حاجی ترنگ زئی، پشاور
(۹) پیر سرسینہ شریف ڈھاکہ (۱۰) مولانا راغب حسین ایم اے ڈھاکہ (۱۱) مولانا اطہر علی ڈھاکہ
(۱۲) مولانا سخاوت الانبیاء، ڈھاکہ (۱۳) مولانا محمد امین امیر جمعیت ناجیہ (۱۴) مولانا عزیز الرحمٰن ناظم حزب اللہ ڈھاکہ (۱۵) مفتی محمد حسن جامعہ اشرفیہ لاہور (۱۶) مولانا محمد ادریس کاندھلوی
(۱۷) مولانا ظفر احمد عثمانی (۱۸) علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۹) مفتی محمد شفیع دیوبندی
(۲۰) مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی (۲۱) مولانا مفتی صاحب داد خان صاحب سندھ مدرسہ کراچی
(۲۲) مولانا عبد الحامد بدایونی (۲۳) مولانا محمد یوسف کلکتوی (۲۴) مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ
(۲۵) مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ (۲۶) مولانا محمد علی جالندھری (۲۷) مولانا احتشام الحق تھانوی۔

(۱) اس کانفرنس میں خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کے رویہ کو منفی قرار دے کر راست اقدام کا فیصلہ کیا گیا۔

(۲) قادیانی فرقے کے کامل مقاطعہ کی تجویز پاس کی گئی۔

(۳) چونکہ خواجہ ناظم الدین، سر ظفر اللہ خاں کو برطرف کرنے پر رضامند نہ تھے اس لیے ان سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا گیا۔

(۴) کچھ ایک مقتدر مسلمانوں اور مختلف مذہبی جماعتوں کے نمائندوں کی ایک جنرل کونسل بنائی گئی۔ اس میں سے پندرہ ممبروں کو مجلس عمل کا رکن قرار دیا گیا۔ پہلے آٹھ اور پھر سات ممبر منتخب کیے گئے، جو حسب ذیل تھے:

(۱) سید عطاء اللہ شاہ بخاری
(۲) مولانا ابوالحسنات قادری
(۳) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
(۴) مولانا عبدالحامد بدایونی
(۵) حافظ کفایت حسین
(۶) پیر صاحب سرسینہ شریف مشرقی پاکستان
(۷) مولانا محمد یوسف کلکتوی
(۸) مولانا احتشام الحق تھانوی
(۹) پیر غلام مجدد سرہندی
(۱۰) مولانا نور الحسن
(۱۱) ماسٹر تاج الدین انصاری
(۱۲) مولانا اختر علی خاں
(۱۳) مولانا محمد اسمٰعیل گوجرانوالہ
(۱۴) سید مظفر علی شمسی
(۱۵) حاجی محمد امین سرحدی

خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کے لیے پیر صاحب سرسینہ شریف، مولانا عبدالحامد بدایونی اور ماسٹر تاج الدین انصاری پر مشتمل ایک وفد مرتب کیا گیا اس کی خواجہ صاحب سے ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مطالبات پر ہمدردی کا اظہار کیا، لیکن فرمایا کہ وہ ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔ خواجہ صاحب ۱۴ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور آئے تو مولانا اختر علی خاں، مولانا ابوالحسنات قادری، سید مظفر علی شمسی اور ماسٹر تاج الدین پر مشتمل ایک دوسرے وفد نے ان سے ملاقات کی لیکن خواجہ صاحب نے وہی عذر کیا کہ بعض مشکلات کے پیش نظر وہ ان مطالبات کو تسلیم کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ ادھر کراچی میں علماء کا ایک وفد، جس میں علامہ سلیمان ندوی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا اختر علی خاں شامل تھے، خواجہ صاحب سے ملا اس وفد کو بھی خواجہ صاحب نے وہی جواب دیا۔ اس سے اگلے روز ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا ابوالحسنات اور سید مظفر علی شمسی نے سردار عبدالرب نشتر کی موجودگی میں خواجہ صاحب سے ملاقات کی اور اتمام حجت کیا کہ ایک مہینہ گزر چکا ہے، لیکن خواجہ صاحب اپنے جواب پر قائم رہے۔ فرمایا کہ مرزائیوں کو چھیڑنے سے امریکہ ہمیں گندم نہیں دے گا اور مسئلہ کشمیر کے حل میں ہماری مدد کرے گا۔ جب خواجہ صاحب کے دو ٹوک جواب سے مجلس عمل کے راہنما مایوس ہو گئے، تو ۲۰ فروری ۱۹۵۳ء کو اس پر غور و خوض کرنے کے لیے کراچی میں اجلاس بلایا گیا۔

اس اجلاس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، ماسٹر تاج الدین انصاری، صاحبزادہ فیض الحسن، سید نور الحسن بخاری، مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی سندھ، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا محمد یوسف کلکتوی، اور سید مظفر علی شمسی شریک ہوئے۔ مولانا ابوالحسنات نے صدارت کی اور فیصلہ کیا کہ راست اقدام کی شکل کیا ہو؟ پانچ رضاکار مطالبات کے جھنڈے اٹھا کر وزیر اعظم کی کوٹھی پر جائیں اور پُرامن رہ کر لگاتار مظاہرہ کریں۔ اسی قسم کا مظاہرہ گورنر جنرل کی کوٹھی پر جاری رہے۔ مولانا ابوالحسنات کو پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا اور عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ رضاکاروں کے ساتھ مطلقاً نہ جائیں۔ حکومت نے ۲۶، ۲۷ فروری کی درمیانی رات کو سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر لیا۔ جن میں ماسٹر تاج الدین انصاری، سید مظفر علی شمسی، مولانا لال حسین اختر، مولانا ابوالحسنات قادری اور مولانا عبدالحامد بدایونی وغیرہم بھی تھے۔ اس سے اگلے روز پنجاب میں احرار کے تمام متعلقین پکڑ کر جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔ جس سے صوبہ بھر میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اسی سلسلے میں لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور لائل پور میں پکڑ دھکڑ کا طوفان آ گیا۔ یہی فضا راولپنڈی اور منٹگمری میں پیدا ہوئی، ہر جگہ حکومت سے ٹکراؤ ہونے لگا۔ مولانا تاج محمود لائل پور میں تحریک کے راہنما تھے۔ انہوں نے نظام کو معطل کر دیا۔ اس سلسلے کی پوری روئداد ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے علیحدہ باب میں بیان کی جائے گی۔ مختصر یہ کہ پنجاب پولیس کے اوسان خطا ہو گئے۔ کئی شہروں میں ڈپٹی کمشنروں کو ان کے تشدد کے باعث عوام نے گدھوں پر سوار کرایا اور پھرایا۔ جب صوبائی نظم و نسق بالکل معطل ہو گیا تو مرکزی حکومت کے بنگالی وزیر اور اعلیٰ حکام لاہور آ گئے۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل کا دماغ بے ٹھکانہ ہو گیا۔ اس زمانے میں اسکندر مرزا ڈیفنس سیکرٹری تھے ان سب کی توجہات سے ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ سارا شہر فوج کے انتظام میں آ گیا غرض قادیانیت کے خلاف یہ سب سے بڑی تحریک تھی۔ جو پاکستان میں چلی اور حکومت نے اپنے بہیمانہ تشدد کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ اس کی تفصیلات ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے تحت کسی اگلے باب میں آئیں گی۔ شاہ جی اپنے ساتھیوں سمیت پہلے کراچی سنٹرل جیل میں رکھے گئے، پھر سکھر جیل میں بھجوا دیا گیا۔ جہاں آپ سے آخری چارج شیٹ لگی۔ منیر انکوائری کمیشن نے کام شروع کیا تو شاہ جی ۱۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیئے گئے میاں محمود علی قصوری نے لاہور ہائیکورٹ میں شاہ جی کی نظر بندی کے خلاف رٹ دائر کر دی۔ جسٹس ایس۔ اے رحمٰن نے قانونی غلطی کا فائدہ دے کر ۷ جنوری ۱۹۵۴ء کو شاہ جی اور ان کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔ شاہ جی نے رہا ہوتے ہی اپنی پہلی تقریر میں جسٹس منیر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اسی سال انہیں مجلس تحفظ ختم نبوت کا صدر منتخب کیا گیا۔ آپ نے ایک جلسۂ عام میں

اعلان کیا کہ میں آج بھی اور حشر کے دن بھی ان تمام شہیدوں کے خون کا دعویدار ہوں جنہیں عشقِ نبوت کی پاداش میں اسلامی سلطنت کے ہلاکو خانوں نے قتل کیا ہے۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی اپنے زمانے میں سات ہزار حافظ قرآن صحابہ کو ختمِ نبوت کی خاطر شہید کرایا تھا۔ شاہ جی کہ حکومت کے بے پناہ تشدد پر انتہائی ملول تھے اور تحریک کے سبوتاژ کیے جانے پر سخت غمزدہ تھے، ہمیشہ حکومت پر کڑی تنقید کرتے۔ حکومت نے ۱۹۵۵ء میں انہیں ۱۰ ماہ کے لیے گھر میں نظر بند کیا گیا۔ پھر ۲۴ اپریل ۱۹۵۸ء کو خانیوال کی تقریر میں پکڑ لیا۔ کوئی پانچ چھ ماہ مقدمہ چلتا رہا۔ اسی دوران میں سکندر مرزا نے بطور صدر پاکستان سید مظفر علی شمسیؒ کی معرفت شاہ جی سے ملاقات کی خواہش کی لیکن شاہ جی ٹال گئے۔ ۱۹۵۸ء کے آخر میں ان کے جسمانی عوارض عود کر آئے اور وہ ایک طویل بیماری کا شکار ہو گئے۔ پھر ۱۸ مارچ ۱۹۶۱ء کو ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور ۲۱ اگست کی شام کو ۶ بج کر ۵۵ منٹ پر تحریک ختم نبوت کا سب سے بڑا قائد ۶۹ برس کی لازوال جدوجہد کے بعد اس فانی کائنات سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

احرار اپنے سیاسی عمل سے دستبردار ہو چکے تھے اور صرف قادیانیت اُن کی جدوجہد کا محور تھا، لیکن ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں قادیانی اور سرکاری دوائر سے اُن کے خلاف بے پناہ گولہ باری کی گئی اور قلم فروش دانشوروں کا ایک طائفہ اُن کے متعلق خرافات نگاری میں مشغول ہو گیا۔ اس سلسلے میں حکومت نے بے شمار روپیہ صرف کیا اور اُن تمام بے دین قلمکاروں کو سرکاری خزانے سے نوازا جو اس تحریک کی رسوائی کے لیے احرار کو مطعون کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ الغرض قادیانیت کا محاسبہ پاکستان دشمنی قرار پا گیا۔ سب سے زیادہ افسوسناک منیر انکوائری رپورٹ تھی۔ جسٹس منیر نے تحقیقات کے دوران میں نہ صرف علماء کا استہزاء کیا بلکہ بحیثیت جسٹس ہونے کے زعم میں اسلام کے خلاف ایک ایسی دستاویز مرتب کی جس سے یورپ کے عیسائی حلقوں نے بے لگام ہو کر فائدہ اٹھانا چاہا۔ یہ ایک ایسی رپورٹ تھی کہ اس کے خلاف کئی ایک مسلمان دانشوروں نے، جو تحریک ختم نبوت میں شامل نہ تھے اور جنہیں احرار سے عمر بھر سیاسی اختلافات رہے، اس کے خلاف اپنے بعض مقالوں، کئی کتابوں اور اکثر تقریروں میں احتجاج کیا۔ جسٹس منیر نے سب سے زیادہ غصہ احرار کے خلاف نکالا اور اُن کے متعلق اس قسم کی لغو زبان استعمال کی کہ اس طرح کی زبان استعمال کرنے کا حوصلہ کبھی بشیر الدین محمود کو بھی نہ ہوا تھا۔

بہرحال ختم نبوت کی تحریک احرار کی انتھک جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے اسلام کے ایک بنیادی مسئلے پر تمام مکاتبِ فکر کے علماء کو اکٹھا کیا اور ایک ایسی تحریک کی بنیاد اٹھائی جو اس وقت گو وقتی تشدد اور عیاش افسروں کے ستم کا شکار ہو گئی لیکن مسلمانوں کے دل و دماغ میں ہمیشہ کے لیے قادیانیت سے نفرت راسخ ہو گئی۔ یہی مجلس احرار کے اس امتیاز کو سلب کرنا ناممکن ہے کہ وہ اس تحریک کے سرخیل تھے۔

❖ ❖ ❖ ❖

علامہ اقبال کا تاریخی بیان؛

علامہ اقبال کے بیانات و ارشادات "قادیانی خط و خال پر حرف آخر تھے۔ آپ کے ان بیانوں ہی نے قادیانی حصار توڑ ڈالا۔ جن مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں کے نزدیک قادیانی، ملت اسلامیہ کا فرقہ تھے، اور ان کے نزدیک قادیانی عقائد کے خلاف احتسابی تحریکیں منبر و محراب کا خاصہ تھیں، انہیں بخوبی معلوم ہو گیا کہ مرزائیت کا اصل جوہر کیا ہے؟ اس کے مذہبی مضمرات اور سیاسی مضمرات کیا ہیں؟ کن عوامل نے اس کو جنم دیا اور اس کا وجود کن مقاصد کے تابع ہے؟ جن خواص کے اذہان قادیانیت کے مسئلہ میں روادار تھے یا وہ اپنی یورپی ذہانت کے باعث متذبذب تھے، یا ان میں کچھ لوگ اساسات اسلام سے بے خبر ہونے کے باعث قادیانیوں کو مسلمان خیال کرتے تھے، انہیں ماحقہٗ معلوم ہو گیا کہ مرزا غلام احمد کی استعماری نبوت یکسر مصالح کی پیداوار تھی اس کی امت دائرہ اسلام سے خارج ہے اور قادیانی العقیدہ افراد ایک جداگانہ اقلیت ہیں۔ ان بیانوں کے بعد مسلمان خواص نے قادیانی امت کو عقیدۃً اپنے ذہن سے خارج کر ڈالا اور صرف وہ سرکاری و سیاسی مسلمان ان کے ساتھ رہ گئے جو مذہب سے متنفر لیکن قومی طور پر مسلمان تھے یا وہ لوگ جنہیں قادیانی امت سے کسی دائرے میں کوئی فائدہ پہنچتا تھا اس طرز کے سرکاری و سیاسی مسلمان سات کروڑ مسلمانوں میں چند ہزار سے زائد نہ تھے۔

علامہ اقبال قادیانیت سے متعلق کبھی خوش رائے نہ تھے، لیکن اس کے مضمرات کا مطالعہ انہوں نے آل انڈیا

کشمیر کمیٹی کے تجرباتی دور ۳۲-۱۹۳۱ء میں کیا مرزا بشیر الدین محمود کمیٹی کے صدر تھے۔ علامہ اقبال ان کے مشکوک اپنے تعلقوں اور سیاسی لہو و لعب سے بیزار ہو گئے۔ مرزا نے ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو بعض مسلمان اکابر کو جمع کیا۔ پھر ان سے مل کر آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی۔ لیکن علامہ اقبال اور ان کے بارہ احباب مثلاً سید محسن شاہ، ایڈووکیٹ اور خان بہادر حاجی رحیم بخش وغیرہم پر جلد آشکار ہو گیا کہ مرزا بشیر الدین محمود اپنی اُمت کی معرفت کیا گل کھلا رہا اور کیا ناٹک کھیل رہا ہے۔ انہوں نے کمیٹی کو لکھ دیا کہ آئندہ کشمیر کمیٹی کا صدر غیر قادیانی ہو۔ اس پر ۵ مئی ۱۹۳۳ء کو لاہور سیسل ہوٹل میں مرزا بشیر الدین محمود مستعفی ہو گیا۔ علامہ اقبال صدر منتخب کیے گئے، لیکن علامہ نے محسوس کیا کہ مرزائیوں نے ایک ایسا جال پھیلا رکھا ہے جس سے کشمیر کمیٹی کی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ آپ نے ۲۰ جون ۱۹۳۳ء کو صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور ایک پریس بیان میں کہا کہ

> "بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے (قادیانیت) کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرے کا مجاور یا کسی زندہ و نام نہاد پیر کا مرید بن جائے۔"

علامہ اقبال کا یہ بیان ۲۰ جون ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا۔ دوسرا بیان ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جاری کیا۔ جس میں صدارت سے اپنی دستکشی کا سبب بیان کرتے ہوئے قادیانی امت کے پوشیدہ اغراض پر اشارات کیے کہ تحریک کشمیر کی آڑ میں اس نے اپنا دام تزویر بچھا کر مسلمانوں کو شکار کرنا چاہا۔ اس کے بعد علامہ قادیانیت کے بالاستیعاب مطالعہ میں مشغول ہو گئے اور سید سلیمان ندوی، علامہ انور شاہؒ اور سید مہر علی شاہؒ کو خطوط لکھ کر بعض استفسارات کیے۔ پہلا بیان ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء کو جاری کیا۔ اس سے قادیانی قلعہ میں تھرتھری پیدا ہو گئی۔ انگریزوں کا مضطرب ہونا طبعی امر تھا کہ اُن کی تخلیق کا مستند تھا۔ اُدھر پنڈت جواہر لال نہرو نے مرزائی امت کے دفاع میں "ماڈرن ریویو" کلکتہ میں تین مقالے تحریر کیے۔ علامہؒ نے ان مقالوں کے جواب میں 'اسلام اور احمدیت' کے زیر عنوان ایک معرکہ آرا مقالہ لکھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو خاموش ہو گئے، لیکن خود قادیانی نفس بھی اس مقالہ کے علمی نکات اور واضح سوالات کا جواب نہ دے سکے۔ علامہؒ نے پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنے ایک نجی خط محررہ ۲۱ جون ۱۹۳۶ء میں لکھا کہ میرے ذہن میں اس سے متعلق کوئی ابہام نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔ سید سلیمان ندویؒ کے نام علامہ

نے اپنے ایک خط محررہ ۵؍ اگست ۱۹۳۵ء میں لکھا "الحمدللہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے"۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے تھے۔

وہ بیان کہاں چھپے؟ راقم تلاش بسیار کے باوجود ان کا پتہ لگانے سے قاصر رہا، وہ بیان مل جاتے تو اس کتاب میں شریک ہو سکتے تھے۔

علامہ اقبال کا پہلا بیان

قادیانیوں اور جمہور مسلمانوں کی نزاع نے جو مسئلہ پیدا کیا ہے وہ نہایت اہم ہے اور ہندوستان نے اس کی اہمیت کو حال ہی میں محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک کھلی چٹھی کے ذریعہ انگریزی قوم کو اس مسئلہ کی معاشرتی اور سیاسی الجھنوں سے آگاہ کروں، لیکن افسوس کہ میری صحت نے ساتھ نہ دیا۔ البتہ فی الوقت ایک ایسے مسئلہ کے متعلق جو میرے نزدیک ہندی مسلمانوں کی پوری زندگی کو متاثر کرتا ہے، بہ مسرت مختصراً کچھ عرض کروں گا۔ لیکن آغاز ہی میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی مذہبی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا اور نہ میں قادیانی تحریک کے بانی کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ پہلی چیز سے ان لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں جن کے لیے یہ بیان جاری کیا جا رہا ہے اور دوسری کے لیے ہندوستان میں ابھی وقت نہیں آیا۔ میرا نقطہ نظر تاریخ کے علاوہ موازنۂ مذاہب کے ایک طالب علم کا ہے۔ ہندوستان مختلف المذاہب اقوام کی سرزمین ہے۔ اسلام دینی حیثیت سے ان تمام مذاہب کی نسبت زیادہ گہرا ہے جو جزوی کاملیت پہ مذہب اور جزوی طور پہ نسل سے تشکیل پاتے ہیں۔ اسلام نسلی تخیل و تصور کی کاملاً نفی کرتا اور اپنی اساس قطعاً دینی اعتقاد پر رکھتا ہے، چونکہ اس کی اساس ہی دینی ہے جو سرتاپا روحانیت ہے، اس لیے خونی رشتوں سے کہیں زیادہ لطیف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ایسی تمام تحریکوں کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہیں جنہیں وہ اپنی اساسی وحدت کے لیے خطرناک سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہے، لیکن اپنی بنیاد کسی نئی نبوت پر رکھتی اور ان تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیتی ہے جو اس کے مبینہ الہامات پر اعتقاد نہیں رکھتے، مسلمان اس جماعت کو اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرتے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے، کیونکہ وحدتِ اسلامی کا تحفظ ختم نبوت کے عقیدہ ہی سے ممکن ہے۔

انسانیت کی تمدنی تاریخ میں ختم نبوت کا تخیل اولین ہونے کے علاوہ تکمیلی و تخلیقی ہے۔ اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ مغربی اور وسط ایشیا کے قبل از اسلام کے موبدانہ تمدن کی تاریخ کے بغور مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق موبدانہ تمدن میں زرتشتی، یہودی، نصرانی اور صابی تمام مذاہب شامل ہیں۔ ان تمام مذاہب میں نبوت کے تسلسل و اجراء کا تصور نہایت لازم تھا، اس لیے وہ مسلسل انتظار کی کیفیت میں رہتے تھے۔ موبدانہ انسان کی یہ مستقل انتظار غالباً نفسیاتی حظ کا باعث تھی۔ عصر جدید کا انسان روحانی طور پر موبدیت سے بہت زیادہ آزاد منش ہے۔ موبدانہ رویہ کا نتیجہ یہ تھا کہ پرانی جماعتیں ختم ہوتیں اور ان کی جگہ مذہبی حیلہ ساز نئی جماعتیں لا کھڑی کرتے۔ اسلام کی جدید دنیا میں جاہل اور جوشیلے ملاؤں نے جدید پریس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انتہائی ڈھٹائی سے بیسویں صدی میں قبل از اسلام کے موبدانہ نظریات کو رائج کرنا چاہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام جو تمام قوموں کو ایک ہی رسی میں پرونے کا دعویٰ رکھتا ہے، ایسی تحریک کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھ سکتا جو اس کی موجودہ وحدت کے لیے خطرہ ہو اور مستقبل میں انسانی معاشرہ میں مزید افتراق و انتشار کا باعث بنے۔

قبل از اسلام کی موبدیت کے احیاء کی دو صورتوں میں سے میرے نزدیک بہائیت، قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے، لیکن موخر الذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی مگر باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے انتہائی مہلک ہے۔ اس کا حاسد خدا کا تصور جس کے پاس مخالفین کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہیں اور نبی سے متعلق نجومی کا تخیل اور روح مسیح کے لیے تسلسل کا عقیدہ، یہ سب اس قدر یہودیانہ ہیں کہ اس تحریک کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی یہودیت کی طرف رجوع کر رہی ہے۔ روح مسیح کا تسلسل مثبت یہودیت کی نسبت یہودی باطنیت کا جزو ہے۔ پولی مسیح بال شیم (BAAL SHAM) کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر بوبر لکھتا ہے "کہا جاتا ہے کہ مسیح کی روح پیغمبروں اور صالح آدمیوں کے ایک طویل سلسلہ (جنہیں دور حاضر میں صادق کہا جاتا ہے) کے واسطے سے زمین پر اتری۔" اسلامی ایران میں قبل اسلام کے موبدانہ اثرات کے تحت جو ملحدانہ تحریکیں اٹھیں، انہوں نے تناسخ کے اس تصور کو چھپانے کے لیے "بروز"، "حلول" اور "ظل" وغیرہ کی اصطلاحات وضع کیں۔ موبدانہ نظریہ کی وضاحت کے لیے نئی اصطلاحات کا وضع کرنا اس لیے ضروری تھا کہ وہ مسلمانوں کے قلوب کو ناگوار نہ گزریں۔ حتیٰ کہ "مسیح موعود" کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں

بلکہ اجنبی ہے اور اس کا مبدا بھی قبل از اسلام کا موبدانہ تصور ہے۔

یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دورِ اول کے دینی اور تاریخی ادب میں نہیں ملتی۔ اس حیرت انگیز حقیقت کا انکشاف پروفیسر ونسنک نے اپنی کتاب موسومہ "احادیث نبوی میں ربط" میں کیا ہے۔ یہ کتاب احادیث کے گیارہ مجموعوں اور اسلام کے تین اولین تاریخی شواہد پر حاوی ہے۔ اور یہ بات ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اسلاف نے اس اصطلاح کو کیوں استعمال نہ کیا۔ یہ اصطلاح غالباً انہیں اس لیے قبول نہ تھی کہ اس سے تاریخی عمل کا غلط نظریہ قائم ہوتا تھا۔ موبدانہ ذہن وقت کو مدور حرکت تصور کرتا تھا۔ لیکن صحیح تاریخی عمل کو بحیثیت ایک تخلیقی حرکت کے ظاہر کرنے کی عظیم سعادت مسلمان مفکر اور مورخ ابن خلدون کے حصہ میں آئی۔

ہندی مسلمانوں نے قادیانی تحریک کے خلاف جس شدید احساس کا ثبوت دیا ہے وہ جدید اجتماعیات کے طالب علم پر بالکل واضح ہے۔ عام مسلمان جسے پچھلے ہفتے ایک صاحب نے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں ملازدہ کا خطاب دیا تھا، اس تحریک کی مخالفت زیادہ تر حفظِ نفس کے احساس کے تحت کر رہا ہے کیونکہ اسے عقیدہ ختم نبوت کے معانی و مطالب پر پوری دسترس نہیں۔ نام نہاد "تعلیم یافتہ" مسلمانوں نے اسلام میں ختم نبوت کے عقیدہ کے تمدنی پہلوؤں کو سمجھنے کی کوئی سی حقیقی کوشش کبھی نہیں کی، حتیٰ کہ مغربیت کی شکست زدہ اور غیر محسوس اثر پذیری نے انہیں حفظِ نفس کے جذبہ ہی سے عاری کر دیا ہے۔ بعض نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمان اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ اس معاملہ میں اپنے مسلمان بھائیوں کو رواداری کا مشورہ دے رہے ہیں۔ میں ہربرٹ ایمرسن (گورنر پنجاب) کو تبلیغِ رواداری پر معذور سمجھتا ہوں کہ ایک ماڈرن فرنگی جس نے بالکل مختلف تمدن میں پرورش پائی ہو اس کے لیے اتنی گہری نظر پیدا کرنی دشوار ہے کہ وہ ایک بالکل مختلف تمدن رکھنے والی جماعت کی ہیئت ترکیبی سے متعلق اہم مسائل کو سمجھ سکے۔

ہندوستان میں حالات اور بھی عجیب و غریب ہیں۔ مختلف مذاہب کا یہ ملک جس میں ہر مذہبی گروہ کی بقا اور مستقبل کا انحصار اس کے اپنے استحکام پر ہے کہ جو مغربی لوگ اس پر حکمران ہیں ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کریں۔ "امن آزادانہ" اور "ناگزیر" پالیسی نے ہندوستان ایسے ملک پر بدقسمتی سے بہت برا اثر ڈالا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندوستان میں برطانیہ کے تحت مسلمانوں کا استحکام مقابلۃً بہت ہی کم محفوظ ہے حتیٰ کہ حضرت مسیح کے زمانہ میں یہودی جماعت کا رومن کے ماتحت محفوظ تھا ۔ ہندوستان میں کوئی سا مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر کوئی بھی دعویٰ کر سکتا اور ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ لبرل حکومت کسی خاص جماعت کے استحکام و یکجہتی کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی بشرطیکہ یہ سٹے باز حکومت کو اپنی اطاعت و وفاداری کے علاوہ اس امر کا یقین دلا دے کہ اس کے پیرو حکومت کی اطاعت کے فرائض اور سرکاری محصول باقاعدہ ادا کرتے رہیں گے ۔ اسلام کے حق میں اس پالیسی کا مطلب ہمارے عظیم شاعر اکبر نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا ، جب اُس نے اپنے مطائباتی انداز میں کہا تھا ۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ

انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

میں قدامت پسند ہندوؤں کے اس مطالبہ سے پوری ہمدردی رکھتا ہوں جو انھوں نے نئے دستور میں برہناتے تحفظ مذہبی مصلحین کے خلاف پیش کیا ہے ۔ یہ مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے یقیناً پہلے ہونا چاہیئے تھا ، جو ہندوؤں کے برعکس اپنے اجتماعی نظام میں نسلی تصور کو قطعی نفی کرتے ہیں ۔ حکومت کو موجودہ صورتِ حالات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے اور اگر ممکن ہو تو اس معاملے میں جو قومی وحدت کے لیے اشد ضروری ہے ۔ عام مسلمانوں کی ذہنیت کا اندازہ لگانا چاہیئے ۔ بہرحال جب کسی قوم کی وحدت خطرہ میں ہو تو اس کے لیے اور کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ معاندانہ قوتوں کے خلاف اپنا دفاع کرے ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدافعت کا طریقہ کیا ہے ؟ اور وہ طریقہ یہی ہے کہ حقیقی جماعت کسی مذہبی سٹے باز کو ملقب بالدین کرتے پائے تو اس کے دعاوی کو تحریر و تقریر کے ذریعہ جھٹلایا کرتے ۔ کیا یہ مناسب ہے کہ اصل جماعت کو تو رواداری کی تلقین کی جائے جس کا استحکام اور وحدت خطرہ میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو جبکہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو ۔

اگر کوئی گروہ جو حقیقی جماعت کے نقطۂ نگاہ سے باغی ہے حکومت کی خصوصی خدمات انجام دے تو حکومت اس کی خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے ۔ دوسری جماعتوں کو اس سے کوئی شکایت نہ ہوگی ، لیکن یہ توقع عبث ہے کہ خود جماعت ایسی قوتوں کو نظرانداز کر دے جو اس کے اجتماعی وجود کے لیے سنگین خطرہ ہوں ۔ اس سلسلے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مسلم فرقوں کے باہمی مناقشات کا اثر

بنیادی مسائل پر کچھ اثر نہیں پڑتا جن پر سب فرقے باوجود اختلاف کے متفق ہیں۔ خواہ وہ ایک دوسرے کے خلاف الحاد کے فتوے ہی دیتے ہیں۔

ایک اور چیز بھی حکومت کی خصوصی توجہ کی محتاج ہے ہندوستان میں اس بناء پر کہ وہ ترقی پسندانہ خیالات رکھتے ہیں، مذہبی بٹے بازوں کی حوصلہ افزائی سے لوگ مذہب سے بالعموم بیزار ہونے لگتے ہیں ———— اس طرح مذہب کا اہم عنصر ہندوستانی قوموں کی زندگی سے آخرکار خارج ہو جائیگا نتیجۃً ہندوستانی دماغ ایسی صورت میں مذہب کی جگہ کوئی اور بدل پیدا کریگا، جس کی شکل روس کی مادی دہریت سے کسی طرح مختلف نہیں ہوگی۔

لیکن پنجابی مسلمانوں کو صرف اس مذہبی سوال ہی نے پریشان نہیں کر رکھا بلکہ کچھ تنازعے سیاسی نوعیت کے بھی ہیں، جن کی طرف سر ہربرٹ ایمرسن نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ بلا شبہ یہ سوال خالصتًا سیاسی نوعیت کے ہیں، لیکن پنجابی مسلمانوں کے اتحاد پر مذہبی مسائل ہی کی طرح اثر انداز ہو رہے ہیں۔ جہاں مجھے پنجابی مسلمانوں کی وحدت کے احساس پر حکومت کا شکریہ ادا کرنا ہے، وہاں میں حکومت کو خود اپنا احتساب کرنے کا مشورہ بھی دوں گا۔ میں پوچھتا ہوں کہ شہری اور دیہاتی مسلمانوں کی تفریق کا ذمہ دار کون ہے؟ جس نے مسلمانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ان کا دینی حصہ خود کئی گروہوں میں بٹ گیا ہے جو ہر دم آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں۔

سر ہربرٹ ایمرسن نے پنجابی مسلمانوں میں قیادت کے فقدان کا گلہ کیا ہے، لیکن اے کاش وہ محسوس کرتے کہ شہری و دیہاتی کی تفریق جسے حکومت خود غرض سیاسی حیلہ بازوں کے ذریعے جنہیں وحدت اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں، برقرار رکھے ہوئے ہے اس چیز نے اس قوم کو اس قابل ہی نہیں رہنے دیا کہ وہ صحیح راہنما پیدا کر سکے۔ میرے خیال میں اس حربہ کا استعمال ہی اس غرض سے کیا گیا ہے کہ صحیح قیادت پیدا ہی نہ ہو سکے۔ سر ہربرٹ ایمرسن مسلمانوں میں صحیح قیادت کے فقدان کا رونا روتے ہیں، لیکن میں حکومت کے اس نظام کو جاری رکھنے کا رونا روتا ہوں جس نے اس صوبہ میں صحیح راہنما کی پیدائش ہی کو ناممکن بنا دیا ہے۔"

وڈ کے اس بیان سے میرزائی امت بوکھلا اٹھی اور سرکاری دوائر میں کھلبلی مچ گئی تو آپ نے

ایک مختصر توضیحی بیان میں کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے اس بیان سے بعض حلقوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اور یہ تاثر لیا گیا ہے کہ میں نے حکومت کو یہ لطیف مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانی تحریک کا بزور انسداد کرے۔ میرا یہ مدعا ہرگز نہ تھا۔ میں نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جسے ہندوستان کے موجودہ حکمران اختیار کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی پالیسی ممکن ہی نہیں۔ البتہ مجھے اعتراف ہے کہ میرے نزدیک یہ پالیسی مذہبی جماعتوں کے مفادات کے منافی ہے، لیکن اس سے بچنے کی اور کوئی راہ نہیں اور جنھیں اس سے خطرہ ہے انھیں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے مناسب طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ میرے نزدیک حکومت کے لیے بہترین راستہ یہ ہے کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت دے۔ اور یہ اُن کی اپنی پالیسی کے بھی عین مطابق ہوگا۔ ادھر مسلمان بھی ان سے وہی رواداری برتیں گے جو وہ باقی مذاہب کے بارے میں اختیار کرتے ہیں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں

"ماڈرن ریویو" کلکتہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے تین مقالوں کی اشاعت کے بعد مختلف مذہبی اور سیاسی مسالک کے مسلمانوں نے مجھے متعدد خطوط بھیجے۔ ان خطوط کے راقموں میں سے بعض نے خواہش کی ہے کہ میں احمدیوں کے متعلق مسلمانانِ ہند کی روش کے بارے میں مزید توضیح کروں اور اس کے حق بجانب ہونے کا ثبوت بہم پہنچاؤں۔ بعض نے مجھ سے پوچھا ہے کہ احمدیت میں اصل تنقیح طلب مسئلہ میرے نزدیک کیا ہے۔ میں پیش نظر بیان میں سب سے پہلے ان تقاضوں کو پورا کرنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک بالکل بجا ہیں۔ پھر ان سوالات کا جواب دوں گا جو پنڈت جواہر لال نہرو نے پیش کیے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے اس بیان کے بعض حصے غالباً پنڈت جی کے لیے دلچسپی کا باعث نہ ہوں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ ان حصوں کو نظر انداز کر دیں تاکہ ان کا وقت بیجا صرف نہ ہو۔

میرے لیے یہ کچھ ضروری نہیں کہ جو مسئلہ مشرق اور غالباً پوری دنیا کے نہایت عظیم الشان مسائل میں سے ایک ہے اس کے ساتھ پنڈت جی کی دلچسپی کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ پہلے قوم پرست

ہندوستانی لیڈر ہیں جنھوں نے دنیائے اسلام کی موجودہ روحانی بے چینی کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس بے چینی کے متعدد پہلو اور امکانی اثرات ہیں اس لیے صد درجہ مطلوب ہے کہ ہندوستان کے ذی فکر سیاسی لیڈر اس معاملے کے حقیقی مفہوم کے لیے دل کے دروازے کھولیں، جس نے اس وقت قلب اسلام میں ہیجان پیدا کر رکھا ہے۔

میں یہ امر پنڈت جی یا اس بیان کے کسی دوسرے خواہشمند سے چھپانا نہیں چاہتا کہ پنڈت جی کے مقالوں نے فی الوقت میرے دل میں ایک حد تک احساسات کی تکلیف دہ کشمکش پیدا کر دی ہے۔ یقیناً جانتا ہوں کہ پنڈت جی وسیع تہذیبی ہمدردیوں کے انسان ہیں، لہٰذا میرا ذہن اسی طرف مائل ہو سکتا ہے کہ پیش کردہ مسائل کو سمجھنے کی خواہش میں وہ پرخلوص ہیں، لیکن جس طریق پر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ایک ایسی نفسیاتی کیفیت بے نقاب ہوتی ہے جسے پنڈت جی سے منسوب کرنا مجھے دشوار نظر آتا ہے۔ میرا میلان فکر یہ ہے کہ قادیانیت کے بارے میں میرے بیان نے جو اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک مذہبی اصول کی تشریح جدید انداز میں کی گئی تھی، پنڈت جی اور قادیانیوں دونوں کو مشکل میں ڈال دیا، اس لیے کہ دونوں ر پنڈت جی اور قادیانی مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی اتحاد و یک جہتی کے امکانات کو خصوصیت سے ہندوستان کے اندر ناپسند کرتے ہیں۔ اگرچہ دونوں کے وجوہ مختلف ہیں۔ بدیہی ہے کہ ہندوستانی قوم پرست کو جس کی سیاسی تصوریت نے احساس حقیقت کو عملاً کچل ڈالا ہے۔ شمال و مغربی ہند کے مسلمانوں میں خود مختاری کی خواہش پیدا ہونا گوارا نہیں۔ وہ سمجھتا ہے اور میرے نزدیک غلط سمجھتا ہے کہ قومیت ہند کی خاطر ملک کی تمام مستقل تہذیبوں کو مٹا دینا چاہیئے، حالانکہ ان کے تعاون ہی سے ہندوستان ایک سیر حاصل اور پائیدار ثقافت کو نشوونما دے سکتا ہے۔ جن طور طریقوں کا حامی ہندوستانی قوم پرست ہے ان کی بنا پر جو قومیت وجود پذیر ہوگی، اس کا نتیجہ باہم تلخی، بلکہ تشدد کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح بدیہی ہے کہ قادیانی بھی مسلمانان ہند کی سیاسی بیداری سے مضطرب ہیں، کیونکہ محسوس کرتے ہیں مسلمانان ہند کا سیاسی وقار بڑھ جائیگا تو قادیانیوں نے رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے اپنے ہندوستانی نبی کی نئی امت نکالنے کے جو منصوبے تیار کر رکھے ہیں وہ یقیناً درہم برہم ہو جائیں گے۔ میں نے مسلمانان ہند کو یہ جتانے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان کے اندر اس کی تاریخ کے موجودہ نازک دور میں داخلی اتحاد و ہم آہنگی صد درجہ ضروری ہے اور میں نے ان انتشار انگیز قوتوں کے خلاف انھیں متنبہ کیا تھا جو اصلاحی تحریکات کا لباس

پہن کر بروئے کار آتی ہیں۔ میرے لیے یہ امر کم حیرت افزا نہیں کہ میری ان کوششوں نے پنڈت جی کے لیے اس قسم کی تو تو سے اظہارِ ہمدردی کا موقع بہم پہنچا دیا ہے۔

بہرحال میں پنڈت جی کے تعریضات کی چھان بین کے ناخوشگوار کام کو طول نہیں دینا چاہتا۔ جو اصحاب قادیانیوں کے متعلق عام مسلمانوں کی روش کی مزید توضیح کے خواہاں ہیں۔ ان کے فائدے کے لیے میں ڈیورنٹ[1] کی کتاب "فلسفے کی کہانی"[2] سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے قادیانیت کے سلسلے میں زیرِ غور مسئلہ عام خواندہ کے بدبرو زیادہ واضح ہو جائے گا۔ ڈیورنٹ نے سپینوزا[3] جیسے عظیم القدر فلسفی کو جماعت بدر کیے جانے کے متعلق یہودیوں کا نقطۂ نگاہ چند فقروں میں جامعیت سے پیش کر دیا ہے۔ خوانندگان جان کر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اقتباس پیش کرنے سے میں خواہ مخواہ سپینوزا اور بانیِ احمدیت کے درمیان کسی قسم کے موازنے کا خواہاں ہوں۔ ان دونوں کے درمیان ذہن و دانش اور سیرت و کردار کے اعتبار سے بُعد بعید ہے "خدا مست" سپینوزا نے کبھی دعویٰ نہ کیا کہ وہ کسی نئی تنظیم کا مرکز ہے اور جو یہودی اس پر ایمان نہ لائیں وہ یہودیت کے دائرے سے خارج ہیں۔ لہٰذا سپینوزا کو جماعت بدر کرنے کے سلسلے میں یہودیوں کی روش کے متعلق ڈیورنٹ کا اقتباس قادیانیت کے سلسلے میں مسلمانوں کی روش پر بدرجہا بہتر انداز میں منطبق ہوتا ہے۔ اقتباس یہ ہے:

"مزید براں اکابرِ یہود کی رائے تھی کہ ایمسٹرڈم[4] میں یہودیوں کی چھوٹی سی جماعت کو انتشار سے محفوظ رکھنے کے لیے مذہبی وحدت و ہم آہنگی واحد ذریعہ تھی اور غالباً یہ اتحاد کو باقی رکھنے کا ایک آخری وسیلہ تھا۔ یہودی قوم دنیا میں بکھر چکی تھی اس کی بقا کی یقینی تدبیر اور کوئی نہ تھی۔ اگر ان کی اپنی کوئی مملکت، کوئی ملکی قانون، سیکولر قوت و طاقت کے اپنے ادارے ہوتے، جن سے کام لیکر داخلی ہم آہنگی اور خارجی احترام حاصل کر سکتے تو

---

[1] DURANT

[2] STORY OF PHILOSOPHY

[3] SPINOZA مشہور ولندیزی فلاسفر ۱۶۳۲ء ایمسٹرڈم میں پیدا ہوا۔ نسلاً یہودی تھا۔

[4] AMSTERDAM

غالباً وہ زیادہ روادار بن جاتے، لیکن مذہب ان کے لیے حبِ وطن بھی تھا اور ایمان
بھی۔ عبادت گاہ ان کے نزدیک مذہبی مراسم و عبادات کے علاوہ عمرانی و سیاسی زندگی کا
مرکز بھی تھی، جس بائیبل کی صحت کو سپنوزا نے محلِ نظر قرار دیدیا تھا، وہ قوم یہود کے لیے
"سفری وطن" تھی۔ ان حالات میں انھوں نے مسلّمہ عقائد سے انحراف کو غداری اور روزالگا
کو خودکشی قرار دیدیا۔"

یہودیوں کی حالت یہ تھی کہ وہ اغیار قوم کے اندر اقلیت میں تھے، لہٰذا وہ سپنوزا کو ایک انتشار
انگیز عامل قرار دینے میں بالکل حق بجانب تھے، جس سے ان کا اجتماعی شیرازہ بکھر جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا
اسی طرح مسلمانانِ ہند بھی قادیانی تحریک کو ہندوستان کے اندر اسلام کی اجتماعی زندگی کے لیے بدرجہا
خطرناک قرار دینے میں بالکل حق بجانب ہیں اور قادیانی تحریک پوری دنیائے اسلام کے کافر ہونے کا
اعلان کر چکی ہے اور مسلمانوں سے کلی مقاطعہ کرتی ہے۔ سپنوزا کا فلسفہ مابعد الطبیعیات یہودیوں کی
اجتماعی زندگی کے لیے اتنا خطرناک نہ تھا، میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کا مسلمان وجداناً خاص نوعیت کے
ان حالات کا صحیح احساس رکھتا ہے جن میں وہ ہندوستان کے اندر گھرا ہوا ہے اور اسے کسی دوسرے
ممالک کے مسلمانوں کے مقابلے میں انتشار انگیز قوتوں کا بدرجہا زیادہ احساس ہے۔ میرے نزدیک عام
مسلمانوں کا یہ وجدانی ادراک قطعاً درست ہے اور مجھے کوئی شبہ نہیں کہ اس کی بنیاد مسلمانانِ ہند کے
ضمیر میں بہت گہری ہے۔ جو لوگ ایسے معاملے میں رواداری کا نام لیتے ہیں وہ اس لفظ کے استعمال میں بیحد
غیر محتاط ہیں، بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ رواداری کی حقیقت ہی سے واقف نہیں۔ رواداری کی روح انسانی
قلب کی بے حد مختلف روشوں سے رونما ہوتی ہے۔ گبن کہتا ہے ایک رواداری فلسفی کی ہے جس کے
نزدیک تمام مذاہب یکساں سچے ہیں۔ ایک رواداری مورخ کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں
طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری سیاست دان کی ہے جو تمام مذاہب کو یکساں مفید سمجھتا ہے، ایک
رواداری اس انسان کی ہے جو فکر و عمل کے دوسرے طور طریقوں کو برداشت کر لیتا ہے، کیونکہ وہ خود فکر و
عمل کے مختلف طور طریقوں سے بالکل بے پروا ہو جاتا ہے۔ پھر ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض
کمزوری کی بنا پر ان تمام ذلتوں کو انگیز کر لیتا ہے جو اس کی محبوب اشیاء یا افراد کے لیے روا رکھی جاتی ہے
ظاہر ہے کہ رواداری کے یہ نمونے کوئی اخلاقی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس غیر مشتبہ طور پہ

ظاہر ہوتا ہے کہ اس رواداری پر کاربند ہونے والا انسان روحانی اخلاق کا اظہار کر رہا ہے۔ حقیقی رواداری عقل و دانش کی وسعت اور روحانی پھیلاؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی رواداری وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو روحانی اعتبار سے قوی ہوں۔ اپنے ایمانی حدود کی پوری پوری حفاظت کرتے ہوئے دوسرے معتقدات برداشت کر لیں بلکہ بعض کی قدر بھی کریں۔ ایسے روادار کا ایمان ترکیبی و امتزاجی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ دوسروں کے تعلق میں ہمدردی کے معانی بہ آسانی پیدا کر لیتا ہے اور ان کے ایمان کی قدر کر سکتا ہے۔ ہمارے عظیم القدر ہندوستانی شاعر امیر خسرو نے اس قسم کی رواداری کی حقیقت ایک بت پرست کی کہانی کے سلسلے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کی ہے۔ بتوں کے ساتھ بت پرستی کی شدید محبت و عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے شاعر مسلمان خواندگان کتاب کو خطاب کر کے کہتا ہے ؎

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری

ہم زوے آموز پرستش گری

(ترجمہ) اے کہ تو ہندو کو بت کا طعنہ دے رہا ہے کیا یہ ضروری نہیں کہ تو اس سے پرستش و عبادت کا طریقہ سیکھ لے۔

خدا کا سچا پرستار ہی عبادت کی صحیح قدر و قیمت محسوس کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس کا مرجع دیتا ہوں، جن پر خدا پرست کا کوئی عقیدہ نہیں۔ جو لوگ ہمیں رواداری کی تلقین کر رہے ہیں ان کی حماقت یہ ہے کہ اپنے مذہبی حدود کی پوری پوری حفاظت کرنے والے انسان کی روش کو نارواداری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ روش اخلاقی کمتری کا نشان ہے۔ حالانکہ یہ رائے غلط ہے وہ نہیں سمجھتے کہ اس روش کی قدر و قیمت اصلاً جیاتی ہے۔ جہاں کسی جماعت کے افراد وجداناً یا معقول دلیل کی بنا پر محسوس کریں کہ عمرانی نظام کی اجتماعی زندگی خطرے میں ہے ان کی دفاعی حیثیت کا جائزہ لیتے وقت زیادہ تر حیاتیاتی معیار پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں ہر کسی عمل کا اندازہ اس طرح کرنا چاہیئے کہ اس میں قدر بقا کی کیا کیفیت ہے۔ اس سلسلے میں اصل سوال یہ نہیں کہ جس شخص کو کافر یا ملحد قرار دیا گیا اس کے بارے میں فرد یا جماعت کی روش اخلاقی اعتبار سے اچھی ہے یا بری۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہ روش حیات بخش ہے یا حیات کش؟ پنڈت جواہر لال نہرو بلا شبہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ جو معاشرہ مذہبی اصول پر مبنی ہوگا اس کے لیے لازماً ایک محکمۂ احتساب و تعزیر کی ضرورت ہوگی۔ مسیحیت کے تعلق میں تو یہ خیال درست ہے۔ لیکن تاریخ اسلام پنڈت جی کی منطق کے برعکس

یہ ثابت کر رہی ہے کہ اسلام کی گزشتہ تیرہ سو سال کی زندگی کے دوران میں محکمۂ احتساب و تعزیر[1] سے
تمام مسلم ممالک کاملاً ناآشنا رہے۔ قرآن نے ایسے ادارے کی صریح ممانعت کر دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے
دوسروں کی کمزوریاں تلاش نہ کرو اور ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے برا نہ کہو[2]۔ پنڈت جی تاریخ اسلام کا مطالعہ
کریں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہودی اور عیسائی اپنے وطنوں میں مذہبی تعزیر و تعذیب سے بھاگ کر
ہمیشہ اسلامی سرزمینوں میں پناہ لیتے رہے ہیں۔ جن دو بنیادوں پر اسلام کا ڈھانچہ قائم ہے وہ اتنی سادہ ہیں
کہ کفر اس معنی میں تقریباً غیر ممکن ہے جو کسی شخص کو دائرہ اسلام سے خارج کر دے۔ یہ بالکل درست ہے
کہ جب کوئی شخص ایسے اصول کا اعلان کرتا ہے جو موجب کفر ہوں اور جن سے مروجہ عمرانی نظام کے لیے
خطرہ پیدا ہو جائے تو ایک آزاد مسلم مملکت یقیناً اس کے انسداد کے لیے قدم اٹھائے گی، لیکن اس حالت
میں مملکت کا اقدام خالص مذہبی مصالح کے بجائے زیادہ تر سیاسی مصالح پر مبنی ہوگا۔ پنڈت جواہر لال ایک
ایسے معاشرے میں پیدا ہوئے اور اسی میں انہوں نے پرورش پائی جس کے حدود بھی پوری طرح متعین نہیں
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں کوئی داخلی ہم آہنگی بھی نہیں۔ میں بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں ایسے شخص کے لیے
یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ایک مذہبی معاشرہ عقائد عوام کی چھان بین کے لیے مملکت کی طرف سے مقرر کردہ
محکمۂ احتساب کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے اور فروغ پا سکتا ہے۔ یہ حقیقت اس اقتباس سے بھی واضح
ہے جو پنڈت جی نے کارڈینل نیومین[3] کی تحریرات سے پیش کیا۔ وہ متحیر ہیں کہ آیا میں کارڈینل کے اصول
کا اطلاق اسلام کے تعلق میں قبول کر لوں گا؟ میں انہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام اور کیتھولک مسیحیت
کے داخلی نظاموں میں بہت بڑا فرق ہے۔ کیتھولک مسیحیت میں پیچیدہ اور عقل سے بالاتر قسم کے عقائد کی
کثرت ہے، جن سے تازہ الہامی تعبیرات کے امکانات برابر پرورش پاتے رہے اور یہ حقیقت مسیحیت کی

---

[1] INQUISITION یعنی مذہبی احتساب و تعزیر کا وہ محکمہ جس نے ہسپانیہ، اٹلی اور یورپ کے دوسرے ممالک میں
مدت تک قیامت برپا کیے رکھی۔

[2] اشارہ بظاہر سورۂ حجرات کی آیت کے اس ٹکڑے کی طرف ہے: لَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ
بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۔

[3] CARDINAL NEWMAN

تاریخ سے واضح ہے ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین دو بنیادوں پر قائم ہے ۔ اوّل خدا ایک ہے (لا الٰہ الا اللہ) دوم محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان مقدس ہستیوں کے سلسلے میں سے آخری ہیں جو وقتاً فوقتاً تمام ممالک اور تمام ادوار میں عالم انسانیت کو زندگی کا صحیح طریقہ سکھانے کے لیے وجود میں آتی رہیں ۔ اگر عقیدہ ایسی چیز ہے جیسا کہ بعض مسیحی مصنفوں کی رائے ہے جو عقل سے بالا ہوتا ہے اور سیاسی اتحاد کے لیے اس سے اتفاق ضروری ہے خواہ اس کا مابعد الطبیعی مفہوم سمجھ میں آئے یا نہ آئے تو ان دو سادہ بنیادوں کو عقیدہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا ، کیونکہ دونوں کی تائید عالم انسانیت کے تجربے سے ہو چکی ہے اور دونوں کا ثبوت عقلی استدلال کی بنا پر بخوبی پیش کیا جا سکتا ہے ۔ ایسا کفر جس کے بارے میں یہ فتویٰ حاصل کرنا ضروری ہو کہ اس کا مرتکب دائرہ مذہب کے اندر رہا یا باہر نکل گیا ۔ صرف اس مذہبی معاشرے میں زیر غور آ سکتا ہے جو ایسی سادہ بنیادوں پر قائم ہو اور وہ بھی اس وقت جب ان سادہ بنیادوں میں سے دونوں یا کسی ایک کا رد مستلزم ہو ۔ ایسا کفر تاریخ اسلام میں شاذ ہی واقع ہوا اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا ۔ اسلام حدود کی حفاظت کے متعلق زیادہ سے زیادہ اہتمام کے باوجود ایسی تعبیر کی اجازت دیتا ہے جو اصل حدود کے اندر رہے ۔ کیونکہ ایسے کفر کا اظہار جو اسلام کے حدود سے تعرض کرے ، تاریخ اسلام میں شاذ ہی پیش آیا ۔ لہٰذا اس قسم کی سرکشی کے باب میں عام مسلمانوں کے احساسات طبعاً بہت شدید رہے ۔ بہائیوں کے خلاف مسلمانانِ ایران میں شدتِ احساس کا سبب یہی تھا ۔ اسی طرح قادیانیوں کے خلاف مسلمانانِ ہند کے شدید احساسات کا سبب بھی یہی ہے ۔

یہ درست ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقوں میں فقہ و الٰہیات کے فروعی مسائل میں اختلاف پر بھی کفر کے فتوے اکثر صادر ہوتے رہے ۔ ان فتووں میں لفظ کفر فروعی مسائل الٰہیات کے اختلاف اور ذہنی کفر جو مرتکب کو ملت بدر کر دے ، کے خلاف بھی بلا امتیاز استعمال کیا جاتا رہا ۔ اس وجہ سے دورِ حاضر کے بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان جنہیں الٰہیات اسلامی کی تاریخ کے بارے میں حقیقتاً کچھ علم نہیں سمجھ رہے ہیں کہ یہ ملتِ اسلامیہ کے عمرانی اور سیاسی انتشار کی علامت ہے ۔ حالانکہ یہ تصور بالکل غلط ہے ۔ اسلامی الٰہیات کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ فروعی اختلافات پر بھی کفر کے جو فتوے ایک دوسرے کے خلاف صادر ہوتے رہے وہ انتشار انگیز ہونے کے بجائے حقیقتاً الٰہیات کے متعلق افکار میں ترکیب و ترتیب کے محرک بنتے رہے ———————

پروفیسر ہرگرونج[1] کہتا ہے: "جب ہم فقہ اسلامی کے نشو و ارتقاء کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک طرف یہ دیکھتے ہیں کہ ہر عہد میں علمائے کرام معمولی محرک کی بنا پر ایک دوسرے کی مذمت میں اس حد تک پہنچتے رہے کہ کفر کا فتویٰ بھی صادر کر دیا، دوسری طرف وہی علمائے کرام زیادہ سے زیادہ وحدتِ مقصد کے پیش نظر پیشروؤں کے ایسے ہی اختلافات میں موافقت کی کوششیں کرتے رہے۔" اسلامی دینیات کا طالب علم جانتا ہے کہ اس قسم کا کفر مسلم فقہا کے نزدیک اصطلاحاً کفر دون کفر یا ایک کفر کا دوسرے سے کم ہونا کہلاتا ہے یعنی کفر کی وہ قسم جس کا مرتکب ملت سے خارج نہیں ہوتا۔ البتہ اعتراف کر لینا چاہیئے کہ جب یہ معمولی کفر ملاؤں کے ہاتھ میں پہنچتا ہے تو بڑے فتنے کا باعث ہو سکتا ہے کیونکہ وہ ذہنی تساہل کی بنا پر دینی فکر کے سلسلے میں تمام مخالفتوں کو مطلق سمجھتے ہیں اور اختلاف میں اتحاد کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اس فتنے کے انسداد کی صورت یہی ہے کہ مدارس دینیات کے طلبہ کے سامنے اسلام کی ترکیبی و اتحادی روح کا تصور زیادہ سے زیادہ واضح طریق پر پیش کریں اور انہیں ازسرنو بتائیں کہ دینیات کے علم کلام میں منطقی تضاد اصولِ حرکت کا وظیفہ ادا کرتا ہے۔ باقی رہا بڑے کفر کا مسئلہ تو یہ صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی مفکر یا مصلح کی تعلیمات اسلام کے حدود پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے قادیانیت کی تعلیمات کے سلسلے میں یہ صورت موجود ہے۔

یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ تحریک احمدیت دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک گروہ قادیانیوں کا ہے اور دوسرا لاہوریوں کا۔ قادیانی گروہ بانیٔ تحریک کو مکمل نبی تسلیم کرتا ہے لیکن لاہوری گروہ نے اعتقاداً یا مصلحتاً یہی مناسب سمجھا کہ قادیانیت کو مدھم شکل میں پیش کیا جائے۔ تاہم یہ مسئلہ کہ بانیٔ احمدیت ایسا نبی تھا جس کی بعثت کا انکار مستلزم کفر ہے، دونوں گروہ کے درمیان محل نزاع ہے۔ احمدیوں کی اس داخلی کشمکش کے سلسلے میں یہ فیصلہ کرنا کہ کون حق بجانب ہے، میرے پیش نظر مقصد کے لیے غیر ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں اور اس کے وجوہ ابھی پیش کروں گا کہ ایسے نبی کا خیال جس سے انکار ملت سے خارج ہونے کو مستلزم ہو احمدیت کی اصل و اساس ہے اور قادیانیوں کا موجودہ امام لاہوری امام کے مقابلے میں روحِ تحریک سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

---

[1] HURGRONJE

اسلام میں ختم نبوت کے تصور کی تہذیبی و ثقافتی قدر و قیمت کی پوری تشریح میں نے دوسری جگہ کردی ہے۔ اس کا مفہوم بالکل سادہ ہے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جنہوں نے اپنے پیروؤں کو ایک قابل عمل قانون دے کر آزاد کر دیا جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ کسی دوسری انسانی ہستی کے آگے روحانی اعتبار سے سر تسلیم خم نہ کیا جائے۔ دینیات کے نقطہ نگاہ سے اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ جس سماجی وسیاسی نظام کو اسلام کہا جاتا ہے، وہ کامل، مکمل اور ابدی ہے۔ رسول اللہ (صلعم) کے بعد کوئی ایسا الہام ممکن ہی نہیں جس سے انکار مستلزم کفر ہو۔ جو بھی شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرے وہ اسلام سے غداری کا مرتکب ہوگا۔ چونکہ قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ بانی احمدیت اس الہام کا حامل تھا لہٰذا وہ پوری دنیائے اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانی تحریک کا استدلال جو صرف قرون وسطیٰ کے کلامی کے لیے زیبا سمجھا جا سکتا ہے ۔۔۔ یہ ہے کہ اگر اسلام کے مقدس پیغمبر کی روحانیت دوسرے نبی کی تخلیق نہ کرے تو اس روحانیت کو ناکام سمجھا جائیگا۔ وہ اپنی نبوت کو اسلام کے مقدس پیغمبر کی نبوت پرور روحانی قوت کی شہادت قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ یہ سوال کریں کہ آیا رسول اللہ (صلعم) کی روحانیت ایک سے زیادہ پیغمبروں کی تربیت بھی فرما سکتی ہے تو اس کا جواب نفی میں دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہوا کہ محمد (صلعم) (معاذ اللہ) آخری نبی نہ تھے۔ آخری نبی میں ہوں۔

بانی احمدیت نے تاریخ انسانیت میں عموماً اور تاریخ ایشیا میں خصوصاً ختم نبوت کے اسلامی فکر کی ثقافتی و تہذیبی قدر و قیمت نہ سمجھی اور یہ تصور قائم کر لیا کہ ختم نبوت ان معنی میں رسول اللہ (صلعم) کا کوئی پیرو درجہ نبوت تک نہیں پہنچ سکتا رسول اللہ (صلعم) کی نبوت میں ناتمامی کا نشان ہے۔ میں اس کی نفسیات کا مطالعہ کرتا ہوں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اپنے ادعائے نبوت کی خاطر وہ اسلام کے مقدس پیغمبر کی اس خصوصیت سے فائدہ اٹھاتا ہے جسے وہ تخلیق روحانیت قرار دیتا ہے، لیکن ساتھ ہی رسول اللہ (صلعم) کی "خاتمیت" سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ اس روحانیت کی تخلیقی صلاحیت صرف ایک ہی نبی یعنی بانی تحریک احمدیت تک محدود رکھتا ہے۔ اس طرح یہ نیا نبی چپ چاپ اس بزرگ ہستی کی خاتمیت پر متصرف ہو جاتا ہے جسے وہ اپنا روحانی مورث قرار دیتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ میں اسلام کے مقدس پیغمبر کا بروز ہوں۔ اس طرح وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ رسول اللہ (صلعم) کا بروز ہونے کی صورت میں اس کی خاتمیت حقیقتاً خود رسول اللہ (صلعم) کی خاتمیت ہے گویا معاملے کو

کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو رسول اللہ (صلعم) کی خاتمیت کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ دونوں خاتمیتوں کو اس کی اپنی اور رسول اللہ (صلعم) کی خاتمیت کو ایک قرار دے کر وہ تصور خاتمیت کے زمانی مفہوم سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

تاہم ظاہر ہے کہ لفظ بروز کامل مماثلت کے معنی میں بھی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا کیونکہ بروز بہر حال اصل سے الگ ہوگا۔ صرف اوتار کی حیثیت میں بروز اصل سے متحد ہوتا ہے لہٰذا اگر ہم بروز کے معنی "روحانی صفات میں مماثل" قرار دیں تو استدلال بے اثر رہے گا۔ لیکن اگر اس کے برعکس ہم بروز کے معنی آریائی تصور کے مطابق اوتار کے لیں تو استدلال بظاہر قابل قبول بن جائے گا مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ اس طریق کا ملبوس کا مجوز ایک مجوسی ہے جس نے بھیس بدل لیا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے اور اس سلسلے میں ہسپانیہ کے عظیم القدر مسلمان صوفی محی الدین ابن عربی کی سند پیش کی جاتی ہے کہ ایک مسلمان ولی کے لیے بھی روحانی ارتقا کے دوران میں ایسے تجربات ممکن ہیں جنہیں صرف شعور نبوت سے مختص مانا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شیخ محی الدین ابن عربی کا یہ نظریہ نفسیات کے نقطۂ نگاہ سے نامحکم ہے، لیکن اگر اسے درست بھی مان لیا جائے تو قادیانیوں کا استدلال شیخ محی الدین ابن عربی کے صحیح موقف سے متعلق کلیۃً غلط فہمی پر مبنی ہے۔ شیخ اسے ایک خالصۃً ذاتی تجربہ قرار دیتے ہیں، جس کی بنا پر کوئی ولی ان لوگوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دے سکتا جو اس پر اعتقاد نہ رکھیں اور ایسا اصلاً ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل شیخ کے نقطۂ نگاہ کے مطابق ایک عہد یا ایک ملک میں ایک سے زیادہ ولی ہو سکتے ہیں جو شعور نبوت تک پہنچ سکتے ہیں، لیکن قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اگر مان بھی لیا جائے ایک ولی کے لیے نفسیاتی اعتبار سے عرفان نبوت حاصل کر لینا ممکن ہے تو اس عرفان کی عمرانی و سیاسی اہمیت کوئی نہیں، کیونکہ وہ کسی نئی "تنظیم" کا مرکز نہیں بن سکتا اور اسے اعلان کا حق دار نہیں ہو سکتا کہ وہی "تنظیم رسول اللہ (صلعم)" کے پیروؤں کے لیے ایمان و کفر معیار ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی کی صوفیانہ نفسیات سے قطع نظر کرتے ہوئے میں "فتوحات مکیہ" سے متعلقہ عبارتوں کا مطالعہ غور و احتیاط سے کر چکا ہوں اور مجھے یقین ہو چکا ہے کہ یہ عظیم القدر ہسپانوی صوفی رسول اللہ (صلعم) کی خاتمیت کا ویسا ہی پختہ معتقد ہے جیسا کوئی راسخ العقیدہ مسلمان ہو سکتا ہے۔ اگر اسے صوفیانہ کشف میں معلوم ہو جاتا کہ آگے چل کر مشرق میں تصوف کے بعض ہندوستانی آمادی اس کی صوفیانہ نفسیات کے پردے میں رسول اللہ

(صلعم) کی خاتمیت پر زد لگانے کے لیے تیار ہو جائیں گے تو وہ علمائے ہند سے بھی پہلے دنیا کے مسلمانوں کو تحریک اسلام کے خلاف متنبہ کر دیتا۔

اب میں احمدیت کی حقیقت پر آتا ہوں۔ تقابلِ مذہب کے نقطۂ نگاہ سے اس کے مآخذ پر بحث حد درجہ دلچسپ ہوگی۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی زیرِ غور آئیگا کہ اسلام سے پیشتر کے مجوسی تصورات کس طرح اسلامی تصوف کے ذریعے سے اس کے بانی پر اثر انداز ہوئے۔ لیکن میرے لیے یہاں یہ بحث شروع کرنا غیر ممکن ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ احمدیت کی اصل حقیقت قرونِ وسطیٰ کے تصوف اور دینیات کے گرد میں چھپی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے ہند نے اسے خالص دینی تحریک سمجھا اور اس کے انسداد کے لیے دینی حربے لیکر نکل پڑے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس تحریک سے نپٹنے کا یہ طریق مناسب نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں علماء صرف جزوی کامیاب ہوئے۔ بانیِ احمدیت کے الہامات کا نفسیاتی تجزیہ احتیاط سے کیا جائے تو یہ غالباً اس شخصیت کی داخلی زندگی کا ایک ایک پہلو بروئے کار لانے کے لیے ایک مؤثر طریقہ ہوگا۔ مولوی منظور الٰہی نے بانی کے الہامات کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اس کا ذکر کر دینا ہوں اس مجموعے میں نفسیاتی چھان بین کے لیے سیر حاصل اور متنوع ذخیرہ موجود ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب بانیِ احمدیت کے کردار اور شخصیت کے لیے ایک کلید مہیا کرتی ہے مجھے امید ہے کہ کبھی جدید نفسیات کا کوئی نوجوان طالب علم اس کا سنجیدہ مطالعہ اپنا فرض منصبی قرار دے لے گا۔ اگر وہ قرآن مجید کو معیار بنائے گا اور یہاں اسے کرنا چاہیئے، البتہ وجوہ یہاں بیان نہیں کیے جا سکتے اور اگر وہ اپنے مطالعے کو بانیِ احمدیت اور معاصر غیر مسلم متصوفین مثلاً رام کرشن بنگالی کے تجربات کی تقابلی تحقیق تک توسیع دے گا تو اسے اس تجربے کی اصلی حیثیت کے متعلق ایک سے زیادہ مرتبہ سرپیچ حیرت بننا پڑے گا جس کی بنا پر بانیِ احمدیت کے لیے نبوت کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔

عوام کے نقطۂ نگاہ سے ایک اور طریق بھی ہے جو یکساں مؤثر اور زیادہ بار آور ہے۔ یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کے دینی فکر کی تاریخ کم از کم ۱۷۹۹ء سے پیشِ نظر رکھ لی جائے اور اس کی روشنی میں احمدیت کی حقیقت سمجھی جائے۔ ۱۷۹۹ء دنیائے اسلام کی تاریخ میں حد درجہ اہم سال ہے۔ اس سال ٹیپو سلطان نے شہادت پائی اور اس کی شہادت کے ساتھ ہندوستان میں سیاسی وقار کے لیے مسلمانوں کی امید کے تمام چراغ گل ہو گئے۔ اسی سال نوارینو[1] کی جنگ ہوئی جس میں ترکی بیڑا تباہ کر دیا گیا۔ جس شخص نے ٹیپو سلطان کی تاریخ شہادت کہی وہ بڑا بلیغ نظر

---

[1] NAVARINO یونان کی ایک بندرگاہ جسے آج کل پائیلوس PYLOS کہتے ہیں یہاں ۲۰ اکتوبر

تھا۔ یہ تاریخ ٹیپو سلطان کے مقبرہ کی دیوار پر کندہ ہے :

زوجہب عزّ اسلام والعقد کلما

(روم اور ہندوستان کی عزت و شان کا ٹھ جاتی رہی)

یوں ۱۷۹۹ء میں ایشیا کے اندر مسلمانوں کا سیاسی زوال آخری حد پر پہنچ گیا۔ لیکن جس طرح جنگ بینا[1] کے دن جرمنی کا زوال بھی شکست سے جدید جرمن قوم اٹھی، اسی طرح یہ کہنا بھی بالکل بجا سمجھا جا سکتا ہے کہ ۱۷۹۹ء میں مسلمانوں کے سیاسی انحطاط سے دور حاضر کا اسلام پیدا ہوا اور اپنے ساتھ نئے مسائل لایا۔ اس نکتے کی توضیح میں آگے چل کر کروں گا۔ فی الحال میں خواندگان کرام کی توجہ ان بعض مسائل کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جو ٹیپو سلطان کی شہادت اور ایشیا میں یورپی سامراج کے فروغ کے بعد اسلامی ہند میں پیدا ہوئے کار آئے۔

کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی اور سیاسی تصور ہے؟ ہندوستان اور ان ملکوں کے مسلمان جو سلطنت ترکیہ کے دائرے سے باہر ہیں، ان کا رشتہ خلافت ترکی سے کیا ہے؟ کیا ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالسلام؟ اسلام میں اصول جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ قرآن مجید کا ارشاد ہے: "خدا کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے اصحاب امر و حکم ہوں، یعنی تمہارے فرمانروا۔[2] "تم میں سے" کا مطلب کیا ہے؟ رسول اللہ صلعم کی جن احادیث میں امام مہدی کے ظہور کے متعلق پیشین گوئی کی گئی ہے ان کی حیثیت کیا سمجھی جائے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے، بدیہی وجوہ کی بنا پر صرف مسلمانان ہند سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جیسے ان مراح

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

۱۷۹۸ء کو برطانوی اور فرانسیسی بیڑے نے مصر و ترکی کے متحدہ بیڑے کو تباہ کیا تھا۔ ترکی نے یونانیوں کی بغاوت فرو کرنے کے لیے قدم اٹھایا تھا، انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اسے ناکام بنا دیا۔

ٹیپو سلطان شہید کی تاریخ شہادت میں بظاہر اس واقع کی طرف نہیں بلکہ نپولین کے حملہ کی طرف اشارہ ہے جو اسی دور کا واقعہ ہے جس میں ٹیپو سلطان نے شہادت پائی۔ البتہ یہ درست ہے کہ ترکی بیڑے پر نوارینو میں سخت ضرب لگی اور اس کی جنگی قوت بری طرح مجروح ہوئی۔ اگرچہ یہ واقعہ ٹیپو سلطان کی شہادت سے کم و بیش اٹھائیس سال بعد پیش آیا۔

[1] (JENA) یہ جنگ اکتوبر ۱۸۰۶ء میں ہوئی تھی اور نپولین نے اس میں پروشیا کی قوت تباہ کر دی تھی۔

[2] یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم

اسلامی دنیا میں تیزی سے تسلط حاصل کرتا جا رہا تھا، اسے بھی ان سوالات سے گہری دلچسپی تھی۔ ان پر جو بحثیں ہوئیں وہ ہندوستان میں اسلامی تاریخ کا ایک نہایت دلچسپ باب ہیں۔ یہ داستان بہت طویل ہے اور ابھی تک کسی ذی بصیرت صاحب قلم کے انتظار میں ہے۔ جن مسلمان مدبروں کی نگاہیں زیادہ تر حقائق حال پر جمی ہوئی تھیں، وہ علماء کے ایک طبقے کو ایسے دینی استدلال پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ان کے نزدیک وقتی حالات سے مطابقت رکھتا تھا۔ مگر محض منطق کے زور سے ان عقائد پر قابو پانا آسان نہ تھا جو صدیوں سے جمہور مسلمانانِ ہند کے ضمیر پر مسلط چلے آ رہے تھے۔ ایسے حالات میں منطق یا تو سیاسی مصلحت کی بنا پر قدم آگے بڑھا سکتی ہے یا قرآن و احادیث کی تازہ تعبیر کا طریقہ اختیار کر سکتی ہے۔ دونوں صورتوں میں ظاہر تھا کہ یہ عوام کو متاثر نہ کر سکے گی۔ مسلم عوام کی شدید مذہب پسندی کو صرف ایک چیز یقینی طور پر متاثر کر سکتی تھی اور وہ آسمانی سند تھی۔ چنانچہ عقائد کی مؤثر تردید کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ کسی ایسی الہامی بنیاد کی تلاش کی جائے جو مذکورہ مسائل سے تعلق رکھنے والے دینی اصول کی تعبیر سیاسی اقتدار سے موزوں طریق پر کرے۔ یہ الہامی بنیاد احمدیت نے مہیا کی اور احمدی خود مدعی ہیں کہ برطانوی سامراج کے لیے یہ سب سے بڑی خدمت ہے جو انہوں نے انجام دی۔ سیاسی اہمیت کے دینی نظریات کی الہامی بنیاد کے لیے پیغمبرانہ دعوے کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اس مدعی کے نظریات قبول نہیں کرتے وہ مطلق کافر ہیں اور لازماً دوزخ کے شعلوں کی نذر ہوں گے۔ احمدیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ مسیح ایک عام فانی انسان کی طرح وفات پا گئے اور ان کے ظہور ثانی کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی شخصیت رونما ہو گی جو روحانی اعتبار سے مسیح کی مثیل ہو گی۔ جس حد تک میں احمدیت کی اہمیت سمجھتا ہوں، اس سے تحریک کو ایک حد تک معقول شکل مل گئی۔ لیکن روح تحریک کے پیچھے ایسی چیز کا ضروری نہیں۔ میری رائے میں یہ نبوت کی طرف ابتدائی اقدامات تھے اور تحریک کے اصل مقاصد نبوت ہی پورا کر سکتی تھی۔

جو ملک تہذیب و تمدن کی ابتدائی منزلوں میں ہیں، وہاں منطق نہیں بلکہ روحانی سند و اقتدار سے کام لیا جا سکتا ہے۔ جہاں خاص جہالت موجود ہو نیز خوش اعتقادی حد درجہ عجیب امر یہ ہے کہ خوش اعتقادی اور ذہانت بعض اوقات پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔ پھر کسی شخص میں یہ اعلان کر دینے کی جسارت ہو کہ وہ ایسے ربانی الہام کا حامل ہے جس سے انکار دائمی لعنت کا موجب ہو گا، اس کے بعد کسی محکوم ملک میں ایسی سیاست آمیز دینیات ایجاد کر لینا اور ایک جماعت بنا لینا آسان ہے جس کا عقیدہ سیاسی غلامی ہو۔ پنجاب کے سادہ لوح کسان جو صدیوں سے ہر قسم کے ناجائز تصرفات کا تختۂ مشق چلے آتے ہیں، مبہم دینی اصطلاحات کے جال میں بھی بسہولت

پھنس جاتے ہیں، خواہ وہ کتنا ہی فرسودہ ہو۔ پنڈت جواہر لال نہرو تمام مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ متحد ہو جائیں اور اس چیز کے ظہور میں تاخیر پیدا کریں جسے وہ ہندوستانی قومیت سمجھتے ہیں اس طنز آمیز مشورے میں فرض کر لیا گیا ہے کہ احمدیت ایک اصلاحی تحریک ہے۔ پنڈت جی کو علم نہیں کہ ہندوستان میں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے احمدیت میں انتہائی اہمیت کے مذہبی اور سیاسی مسائل مضمر ہیں۔ میں پہلے واضح کر چکا ہوں کہ اسلام کے مذہبی فکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کے اندر موجودہ سیاسی غلامی کے لیے الہامی بنیادیں مہیا کرنا ہے۔ خالص مذہبی مسائل کو چھوڑ دیجئے صرف سیاسی مسائل کی بنا پر بھی پنڈت جی ایسے شخص کے لیے قطعاً زیبا نہیں کہ وہ مسلمانان ہند کو رجعتی قدامت پسندی سے متہم کریں۔ اگر وہ احمدیت کی حقیقی حیثیت سے آگاہ ہوتے تو مجھے کوئی شبہ نہیں کہ ایک مذہبی تحریک کے متعلق مسلمانان ہند کی روش کو مستحق ستائش سمجھتے جو ہندوستان کے مصائب و آلام کے لیے ربانی الہام کی مدعی ہے۔

خوانندگان کرام پر واضح ہو چکا ہو گا کہ آج ہندوستان میں اسلام کے رخسار روشن پر احمدیت کی جو زردی نظر آ رہی ہے وہ اس ملک میں مسلمانوں کے مذہبی فکر کی تاریخ کا کوئی ناگہانی مظہر نہیں۔ جن تصورات نے بالآخر اس تحریک کی شکل اختیار کی وہ بانیٔ احمدیت کی پیدائش سے بھی بہت پہلے مذہبی مباحث میں نمایاں ہو چکے تھے میرا یہ مطلب بھی نہیں کہ بانیٔ احمدیت اور اس کے رفیقوں نے سوچ سمجھ کر اپنا پروگرام تیار کیا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ تحریک احمدیت کے بانی نے ضرور کوئی آواز سنی ہو گی، لیکن یہ آواز خدائے حیات و قدرت کی طرف سے آئی یا عوام کے روحانی افلاس سے اٹھی، اس کا انحصار پیدا کردہ تحریک کی حیثیت اور یہ آواز سننے والوں کے فکر و جذبہ کی نوعیت پر ہے۔ خوانندگان کرام کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میں استعاروں میں بات کر رہا ہوں۔ قوموں کی تاریخ حیات یہی بتاتی ہے کہ جب کسی گروہ کی زندگی میں مد کے بعد جزر پیدا ہوتا ہے تو انحطاط بجائے خود الہام کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ شاعر، فلسفی، اولیاء اور مدبر سب اس سے متاثر ہوتے ہیں اور داعیوں کی ایسی جماعت بن جاتے ہیں جو سحر آفریں نحو یا منطق کی قوت سے زندگی کی تمام زشت و مکروہ چیزوں کو عظمت و شان کا لباس پہنانے کے لیے وقف ہو جاتے ہیں۔ یہ داعی نادانستہ ولولہ ناامیدی کو درخشاں صورت میں پیش کرتے ہیں، کردار و عمل کی روایتی اقدار کی جڑ کھوکھلی کر دیتے ہیں، اس طرح ان لوگوں کی روحانی قوت و ہمت تباہ کر ڈالتے ہیں جو ان کے حلقۂ سحر میں آ جاتے ہیں۔ اس قوم کے عزم کی فرسودہ حالت کا صرف تصور کر لینا کافی ہے جو اصحاب سند کی بنا پر سیاسی ماحول کو آخری و قطعی چیز تسلیم کر لیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تمام کردار جنہوں نے احمدیت کے ڈرامے میں حصہ لیا، زوال و

انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح حربے تھے۔ اسی قسم کا ڈرامہ ایران میں بھی کھیلا گیا لیکن وہاں وہ مذہبی اور سیاسی مسائل پیش نہ آئے جو احمدیت نے ہندوستان میں اسلام کے لیے پیدا کر دیئے۔ روس نے بابیت کے لیے رواداری کا انتظام کر دیا اور بابیوں کو اجازت دی کہ عشق آباد میں اپنا پہلا تبلیغی مرکز قائم کر لیں۔ احمدیوں کیلئے انگلستان نے ایسی ہی رواداری کا اظہار کیا اور انھیں ووکنگ میں اپنا پہلا تبلیغی مرکز قائم کر لینے کی اجازت دیدی۔ اس سوال کا فیصلہ مشکل ہے کہ روس اور انگلستان نے یہ رواداری سامراجی مصلحت کی بنا پر اختیار کی یا یہ ان ملکوں کی خالص وسعتِ قلب کا نتیجہ تھی۔ البتہ اتنا قطعی طور پر واضح ہے کہ اس رواداری نے ایشیا میں اسلام کے لیے مشکل مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اسلام کی ہیئتِ ترکیبی کے باب میں جو میرا تصور ہے اس کے پیشِ نظر میرے دل میں خفیف سا بھی شبہ نہیں کہ اسلام کے لیے اس طرح جو مشکلات پیدا کی گئی ہیں ان سے وہ زیادہ پاک و صاف ہو کر نکلے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہندوستان میں حالات نے نیا رُخ اختیار کر لیا ہے۔ جمہوریت کی نئی روح ملک کے اندر پھیل رہی ہے۔ یہ یقیناً احمدیوں کی آنکھیں کھول دے گی اور انہیں یقین دلا دے گی کہ انھوں نے دین میں جو نئی چیزیں پیدا کیں وہ بالکل بے سود ہیں۔

اسلام قرونِ وسطیٰ کے تصوف کا احیاء بھی برداشت نہ کریگا، جس نے اس کے پیرووں سے صحت مندانہ وجدانات چھین لیے اور ان کے بدلے میں محض مبہم افکار دے دیئے۔ اس تصوف نے گزشتہ صدیوں میں اسلام کے بہترین دل و دماغ اپنے اندر جذب کر لیے اور ملک داری کے معاملات اوسط درجے کے آدمیوں پر چھوڑ دیئے۔ دورِ حاضر کا اسلام اس تجربے کے اعادے کا روادار نہیں ہو سکتا اور یہ بھی برداشت نہیں ہو سکتا کہ پنجاب کا تجربہ دہرایا جائے یعنی مسلمانوں کو نصف صدی تک اُن دینی مسائل میں الجھائے رکھے جن کا زندگی سے کوئی بھی تعلق نہ تھا۔ اسلام تازہ فکر و تجربہ کی وسیع روشنی میں پہنچ چکا ہے۔ کوئی ولی یا مدعی نبوت اسے قرونِ وسطیٰ کے تصوف کے کُہر میں واپس نہیں لے جا سکتا۔

اب میں پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں پنڈت جی کے مقالات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اسلام یا انیسویں صدی کے اندر اس کی مذہبی تاریخ سے مطلق کوئی آگاہی نہیں اور نہ انھیں نے وہ سب کچھ پڑھا ہے جو میں ان کے سوالات پر لکھ چکا ہوں۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ سب کچھ دہراؤں جو پہلے لکھ چکا ہوں نہ یہاں انیسویں صدی میں اسلام کی مذہبی تاریخ بیان کر سکتا ہوں، جس کے بغیر دنیائے اسلام کی موجودہ حالت کا اندازہ کرنا غیر ممکن ہے۔ ترکی اور دورِ حاضر کے اسلام پر

سیکڑوں کتابیں اور مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ میں ان میں سے بیشتر پڑھ چکا ہوں اور اغلب ہے اور پڑھنے والوں کی نظر سے بھی گزر چکے ہوں۔ میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کتابوں اور مقالوں کے مصنفوں میں سے ایک بھی نہیں، جس نے اس محلول کی نوعیت کبھی ہو یا اس علت کے بارے میں صحیح اندازہ کیا ہو جس سے یہ محلول رونما ہوا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انیسویں صدی میں ایشیا کے اندر اسلامی فکر کی بڑی بڑی لہروں کا تذکرہ اختصاراً کر دیا جائے۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا سیاسی زوال آخری حد پر پہنچ چکا تھا لیکن اسلام کی داخلی روحِ حیات کی بڑی شہادت اس واقعے کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی کہ اسے صاف اندازہ ہو گیا، دنیا میں اس کا اصل موقف کیا ہے۔ انیسویں صدی کے اندر سرسید احمد خاں ہندوستان میں، سید جمال الدین افغانی افغانستان میں اور مفتی عالم جان روس میں پیدا ہوئے۔ غالباً یہ اصحاب محمد بن عبدالوہاب سے متاثر ہوئے، جن کی ولادت ۱۷۰۳ء میں نجد کے اندر ہوئی۔[1] یہی محمد بن عبدالوہاب اس تحریک کے بانی تھے، جسے عموماً وہابی تحریک کہا جاتا ہے اور جسے بجا طور پر دورِ حاضر کے اسلام میں زندگی کی پہلی دھڑکن سمجھنا چاہیے۔ سرسید احمد خاں کا اثر بحیثیت عمومی ہندوستان میں محدود رہا تاہم اغلب ہے کہ دورِ حاضر کے مسلمانوں میں وہ پہلے فرد ہوں، جنھوں نے آنے والے دور کے مثبت کردار کی ایک جھلک پائی۔ سرسید کی تجویز تھی کہ مسلمانوں کی بیماریوں کا علاج جدید حاضر کی تعلیم ہے۔ مفتی عالم جان نے روس میں یہی مسلک اختیار کیا لیکن سرسید کی حقیقی عظمت کا راز یہ ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان تھے، جنھوں نے اسلام کو نئے نقطۂ نگاہ سے پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ ہم ان کے مذہبی نظریات سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ انھی کی حساس روح تھی جو دورِ حاضر کے تقاضوں کی بنا پر سب سے پہلے مصروفِ عمل ہوئی۔

مسلمانانِ ہند کی انتہائی قدامت پرستی زندگی کے حقائق پر گرفت کھو چکی تھی، وہ سرسید احمد خاں کی مذہبی روش کی حقیقی حیثیت کا اندازہ نہ کر سکے۔ شمال مغربی ہندوستان ملک کے باقی حصوں کے مقابلے میں

---

[1] مستند روایات کے مطابق شیخ محمد بن عبدالوہاب ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) میں بمقام عیینہ (نجد) پیدا ہوئے اور وفات ایک روایت کے مطابق ۲۹ شوال ۱۲۰۶ھ (۲۰ جون ۱۷۹۲ء) کو، دوسری روایت کے مطابق اواخر ذی قعدہ ۱۲۰۶ھ (جولائی ۱۷۹۲ء) میں ہوئی۔

زیادہ پسماندہ تھا اور یہاں پیروں کا تسلط بھی زیادہ تھا۔ سرسید کی تحریک سے پہلے یہ احمدیت کی تحریک شروع ہو چکی احمدیت سامی و آریائی تصوف کا ایک عجیب ملغوبہ تھی جس کے نزدیک مذہبی احیاء کا مطلب یہ نہ تھا کہ فرد کی داخلی زندگی قدیم اسلامی صوفیت کے اصول کے مطابق پاک ہو جائے بلکہ اس نے "مسیح موعود" کی خوشخبری سے عوام کی کیفیتِ انتظار کے لیے اطمینان کا سامان بہم پہنچا دیا۔ پھر اس مسیح موعود کا وظیفہ بھی یہ نہ تھا کہ فرد موجودہ دورِ ضعف و انحطاط سے نجات حاصل کرے۔ صرف یہ تھا کہ اپنی خودی کو غلامانہ حیثیت میں اس انحطاط کے حوالے کر دے۔ اس ردِ عمل میں ایک نہایت نازک تضاد موجود رہے۔ یعنی تحریکِ احمدیت نے اسلام کا ضبط و نظم تو قائم رکھا، لیکن اس عزیمت کو تباہ کر دیا جسے تقویت پہنچانا اس ضبط و نظم کا مقصد تھا۔

مولانا سید جمال الدین افغانی مختلف وضع کے انسان تھے۔ قدرت کے طور طریقے عجیب ہیں۔ جس فرد کو مذہبی فکر و عمل کے اعتبار سے ہمارے عہد میں سب پر سبقت حاصل تھی، وہ افغانستان میں پیدا ہوا۔ سید جمال الدین دنیا کی تقریباً تمام اسلامی زبانوں میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ انہیں خدا نے مسحور کن فصاحت و بلاغت سے مشرف فرمایا تھا۔ ان کی بے چین روح مختلف اسلامی ملکوں میں منتقل ہوتی رہی۔ ایران، مصر اور ترکی میں انہوں نے بعض نہایت ممتاز آدمیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ ہمارے عہد کے سب سے بڑے علمائے دین مثلاً مفتی محمد عبدہ اور نوجوانوں میں سے بعض لوگ جو آگے چل کر سیاسی لیڈر بنے مثلاً زغلول پاشا مصری، انہیں کے شاگرد تھے۔ انہوں نے لکھا بہت کم، مذاکرات سے بہت زیادہ کام لیا۔ اس ذریعے سے ان تمام افراد کو چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنا دیا جو ان کے دائرہ ربط و تعلق میں آ گئے۔ انہوں نے کبھی نبی یا مجدد ہونے کا دعویٰ نہ کیا، لیکن ہمارے عہد کا کوئی بھی فرد نہیں جس نے سید سے بڑھ کر مسلمانوں کے روح و قلب میں جوش و ولولہ پیدا کیا ہو۔ سید کی روح اب تک دنیائے اسلام میں کارفرما ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی کارفرمائی کہاں تک پہنچے گی۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ ان عظیم القدر مسلمانوں کا مقصد و نصب العین کیا تھا؟ جواب یہ ہے کہ انہوں نے دنیائے اسلام میں تین بڑی قوتوں کو کارفرما دیکھا اور تمام تر توجہات انہیں قوتوں کے خلاف بغاوت پیدا کرنے پر مرتکز کر دیں۔

۱۔ ملائیت

علماء ہمیشہ اسلام کے لیے بہت بڑی قوت کا سرچشمہ رہے لیکن رفتہ رفتہ خصوصاً تباہیِ بغداد کے وقت سے

انھوں نے جو درجہ قدامت پسندی اختیار کر لی اور اجتہاد (قانونی مسائل کے متعلق آزادانہ فیصلے کا حق) کی آزادی بھی دینے پر راضی نہ ہوئے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مسلم داعیانِ اصلاح کے لیے تحریک و عمل کا سرچشمہ تھی، دراصل علماء کے اسی جمود کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ غرض انیسویں صدی کے مسلم داعیانِ اصلاح کا اولین مقصد یہ تھا کہ عقائد کی تجدید کی جائے اور روز افزوں تجربات کی روشنی میں قانون کی نئی تعبیر کے لیے آزادی دلائی جائے۔

۲۔ تصوف

مسلم عوام پر ایسا تصوف مسلط تھا جس نے حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ لوگوں کی عمل قوت کمزور کی جا رہی تھی اور ان میں گوناگوں اوہام پرستوں کا دور دورہ تھا۔ تصوف روحانی تعلیم کی ایک ایسی قوت تھی جس کا درجہ بہت بلند تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ گرتے ہوئے عوام کی بے خبری و خوش اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ رہ گیا۔ تدریجاً اور غیر مرئی طریق پر مسلمانوں کی حریت کمزور ہو گئی اور ان میں اتنی تن آسانی آ گئی کہ شریعتِ اسلام کے پختہ نظم و ضبط سے بچاؤ کے پہلو پیدا کرنے کی کوششوں میں لگ گئے۔ انیسویں صدی کے داعیانِ اصلاح نے اس تصوف کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ دنیائے حاضر کی تیز روشنی میں چلیں۔ یہ داعیانِ اصلاح مادہ پرست نہ تھے، ان کا نصب العین یہ تھا کہ مسلمانوں کی آنکھیں کھل جائیں۔ وہ روحِ اسلام سے آشنا ہو جائیں جس کا مقصد دعوتِ مادی دنیا سے گریز نہیں بلکہ اس کی تسخیر تھا۔

۳۔ مسلم ملوک

ان کی نظریں صرف اپنے خاندانی مفاد پر جمی ہوئی تھیں اور وہ جب تک اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے اپنے ملک زیادہ قیمت پیش کرنے والوں کے ہاتھ فروخت کر دینے میں بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ دنیائے اسلام میں اس صورتِ حال کے خلاف بغاوت کے لیے مسلم عوام کو تیار کر دینا سید جمال الدین افغانی کا خاص مشن تھا۔

ان داعیانِ اصلاح نے دنیائے اسلام کے فکری مسائل میں جو انقلاب پیدا کیا اس کی تفصیل بیان یہاں ممکن نہیں، لیکن ایک امر واضح ہے انھوں نے بڑی حد تک کارپردازوں کے دوسرے گروہ کے لیے زمین ہموار کر دی، مثلاً زغلول پاشا، مصطفیٰ کمال اور رضا شاہ۔ داعیانِ اصلاح نے تعبیرات پیش کیں، استدلال سے کام لیا اور ضروری چیزیں کھول کر بیان کر دیں۔ جو لوگ ان کے بعد برسرِ کار آئے، وہ اگرچہ رسمی علوم میں فروتر تھے تاہم وہ اپنے

صحت مند رجحانات پر اعتماد کرتے ہوئے حوصلہ مندانہ روشن فضا میں پہنچ گئے اور وقت ضرورت جبر سے کام لیکر بھی زندگی کے نئے حالات کے تقاضے پورے کر دیئے۔ ایسے آدمیوں سے غلطیاں ہو سکتی تھیں، لیکن قوموں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بعض غلطیوں سے بھی اچھے نتیجے حاصل ہوئے۔ یہ لوگ منطق سے کام نہیں لیتے بلکہ ان کے اندر زندگی خود جدوجہد سے اپنے مسائل حل کر لیتی ہے۔

یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ سرسید احمد خاں، سید جمال الدین افغانی اور آخر الذکر کے سیکڑوں مرید اور شاگرد جو اسلامی ملکوں میں پھیلے ہوئے تھے، مغربیت مآب مسلمان نہ تھے۔ انہوں نے قدیم دبستانوں کے حلقوں کے روبرو زانوئے ادب تہ کیا اور اسی ذہنی و روحانی فضا میں سانس لیتے رہے جس کی از سر نو تشکیل کے لیے وہ آگے چل کر کوشاں رہے۔ جدید افکار کا دباؤ تسلیم کیا جا سکتا ہے مگر جو سرگزشت اختصاراً بیان کی جا چکی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی میں جو انقلاب پیدا ہوا اور اغلب ہے وہ بزود یا بدیر دوسرے اسلامی ملکوں میں برپا ہو، بڑی حد تک اندرونی قوتوں ہی کا آفریدہ ہے۔ دور حاضر کی دنیا ئے اسلام پر سطحی نظر رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس دنیا میں موجودہ بحران تمام تر بیرونی قوتوں کا رہین منت ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا اور خصوصاً ترکی نے اسلام چھوڑ دیا ہے؟ پنڈت جواہر لال نہرو سمجھتے ہیں کہ ترکی اب اسلامی ملک نہیں رہا۔ انہیں یہ اندازہ نہیں کہ کسی فرد یا قوم کے مسلمان نہ ہونے کا مسئلہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے خالص فقہی مسئلہ ہے اور اس کا فیصلہ اسلام کے بنیادی اصول کے مطابق ہونا چاہیئے۔ جب تک کوئی شخص اسلام کے دو بنیادی اصول۔ خدا ایک ہے (لا الہ الا اللہ) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری رسول ہیں (محمد رسول اللہ) کا قائل ہے تو اسے کٹر ملا بھی دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کر سکتا، اگرچہ وہ شریعت اور آیات قرآنی کی جو تعبیرات پیش کر رہا ہے، وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں۔

شاید پنڈت جواہر لال نہرو کے ذہن میں وہ مفروضہ یا حقیقی بدعات ہیں جو اتاترک نے جاری کیں۔
آیئے ہم تھوڑی دیر کے لیے ان کا جائزہ بھی لے لیں۔ کیا ترکی میں عام مادی نقطۂ نگاہ کا نشو و ارتقا ہے جو اسلام کے منافی نظر آتا ہے؟ مسلمان ترک دنیا میں خاصا وقت صرف کر چکے اب وقت آگیا ہے کہ وہ حقائق پر نظر ڈالیں۔ مادیت مذہب کے خلاف کوئی اچھا حربہ نہیں، لیکن چیلے اور صوفیوں اور ملاؤں کے خلاف یہ خاص موثر ہے جو مسلمانوں کو دانستہ فریب دیتے ہیں تاکہ ان کی بے خبری اور خوش اعتقادی سے فائدہ اٹھا سکیں۔ روح اسلام

مادّے کے ساتھ ربط و ضبط سے ہرگز مخالف نہیں۔ خود قرآن مجید کا ارشاد ہے: "دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول جا"[1]۔ گزشتہ چند صدیوں میں دنیائے اسلام کی تاریخ کے پیشِ نظر ایک غیر مسلم کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ مادی نقطۂ نگاہ کی ترقی خود شناسی کی ایک شکل ہے۔

پھر کیا قدیم لباس کا ترک اور لاطینی رسم الخط کا نفاذ اسلام کے منافی ہے؟ اسلام کسی خاص ملک کا مذہب نہیں۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس کی کوئی خاص زبان اور کوئی خاص لباس نہیں بلکہ ترکی زبان میں قرآن کی تلاوت بھی ایسی چیز نہیں کہ اسلامی تاریخ میں اس کا نمونہ موجود نہ ہو۔ شخصاً میں اسے اندازے کی شدید غلطی سمجھتا ہوں۔ جن لوگوں نے دورِ حاضر میں عربی زبان و ادب کا مطالعہ کیا، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ صرف ایک ہی غیر یورپی زبان ہے جس کا مستقبل یقینی و مستقر ہے اور وہ عربی زبان ہے۔ اطلاعات موصول ہو چکی ہیں کہ خود ترکوں نے بھی ترکی زبان میں قرآن کی تلاوت ترک کر دی۔

کیا تعددِ ازدواج کی تنسیخ اور علماء کے لیے اجازت نامے کا حصول اسلام کے منافی سمجھا جاتا ہے؟ شریعت اسلام کے مطابق اسلامی مملکت کے امیر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اگر شرعی "اجازت" سے کسی وقت خاص حالات میں معاشرتی خرابی پیدا ہوتی نظر آئے تو انہیں منسوخ کر دے۔ باقی رہا علماء کے لیے اجازت نامے کا لائسنس لینے کا معاملہ تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے اختیار حاصل ہو جائے تو یقیناً اسے اسلامی ہند میں جاری کر دوں۔ قصہ گو ملا ہی عام مسلمانوں کی حماقت کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ انہیں قوم کی مذہبی زندگی سے خارج کر کے اتاترک نے وہ کارنامہ انجام دیا جس سے ابنِ تیمیہ یا شاہ ولی اللہ کا دل خوش ہو جاتا۔ مشکوٰۃ میں رسول اللہ (صلعم) کی ایک حدیث بیان کی گئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اسلامی مملکت کا امیر اور اس کے مقرر کردہ فرد یا افراد ہی لوگوں میں وعظ کہنے کے حقدار ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ اتاترک اس حدیث سے آگاہ تھا یا نہیں تھا لیکن یہ امر

---

[1] یہ سورۂ قصص کی آیت نمبر ۷۷ کا ایک ٹکڑا ہے۔ قارون کے ذکر میں فرمایا گیا ہے: "وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ" یعنی اللہ نے جو تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر کما لے اور دنیا میں اپنا حصہ نہ بھول اور بھلائی کر، جیسے اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی۔

تعجب انگیز ہے کہ اسلامی ضمیر کی روشنی نے اس اہم مسئلے کے متعلق اس کے دائرہ عمل کو منور کر دیا۔

سوئٹزرلینڈ کا ضابطہ قوانین جس میں قانونِ میراث بھی شامل ہے اختیار کرنا یقیناً ایک بہت بڑی غلطی ہے جو محض نوجوان کے جوشِ اصلاح میں سرزد ہوئی اور اس حد تک قابلِ معافی بھی جا سکتی ہے کہ قوم بہت آگے جانے کا زبردست جذبہ رکھتی ہے۔ جب مدت تک ملائیت کی بیڑیوں میں زندگی بسر کر چکنے کے بعد رہائی نصیب ہوتی ہے تو آزادی کی خوشی بعض اوقات کسی قوم کو عمل کے نا آزمودہ راستوں پر لے جاتی ہے۔ لیکن ترکی اور باقی اسلامی دنیا کو ابھی تک اسلامی قانونِ میراث کے ان اقتصادی پہلوؤں کا صحیح اندازہ کرنا ہے جو تاحال بروئے کار نہیں آئے اور یہ قانونِ میراث ایسا ہے جس کے متعلق وان کریمر[۱] نے کہا تھا: "یہ اسلامی شریعت کی صد درجہ بے مثال شاخ ہے"۔

کیا خلافت کی تنسیخ یا مذہب و حکومت کی علیحدگی کو منافی اسلام قرار دیا جا سکتا ہے؟ اسلام بروح و اصل کے اعتبار سے سامراجی نہیں۔ خلافت بنی امیہ کے وقت سے عملاً ایک قسم کی سلطنت بن چکی تھی۔ اس کی تنسیخ کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ روحِ اسلام نے اتاترک کے ذریعے سے کارفرمائی کی۔ خلافت کے معاملے میں ترکوں کے اجتہاد کو سمجھنے کے لیے ہمیں ابنِ خلدون کی رہنمائی پر نظر رکھنی چاہیے جو اسلام کا بہت بڑا فلسفی مورخ تھا اور اسے دورِ حاضر کی تاریخ نگاری کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ میرے لیے بہتر طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی کتاب "فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید" سے یہاں ایک اقتباس پیش کر دوں:

"ابنِ خلدون اپنی مشہور کتاب "مقدمہ" میں اسلامی خلافت کے متعلق تین مختلف نظریے پیش کرتا ہے (۱) عالمی امامت ایک ربانی ادارہ ہے، لہٰذا اس کے قیام سے مفر نہیں (۲) اس کا تعلق محض وقتی مصلحت سے ہے (۳) ایسے ادارے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آخری تعبیر خوارج نے اختیار کر لی جو اسلام کا ابتدائی جمہوری گروہ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جدید ترکی نے پہلی تعبیر چھوڑ کر دوسری تعبیر اختیار کر لی ہے، یعنی معتزلہ کا نظریہ جو عالمی امامت کو محض وقتی مصلحت سمجھتے تھے۔ ترکوں کا استدلال یہ ہے کہ ہمیں اپنے سیاسی فکر و نظر میں گزشتہ سیاسی تجربات کے مطابق عمل پیرا ہونا چاہیے۔ گزشتہ سیاسی تجربہ غیر مشتبہ طور پر واضح ہے کہ عالمی امامت

---

[۱] VON KREMER

کا تصور عملاً ناکام ہو چکا ہے۔ اس پر کاربند ہونا صرف اس وقت ممکن تھا جب مسلمانوں کی سلطنت متحد تھی۔ پھر اس سلطنت کا شیرازہ بکھرا اور خود مختار ریاستیں پیدا ہو گئیں۔ اب یہ تصور قابلِ عمل نہیں رہا اور یہ دورِ حاضر کی اسلامی تنظیم میں زندہ عامل کے طور پر کام نہیں دے سکتا۔"

مذہب و حکومت کی علیحدگی بھی اسلام میں کوئی غیر مانوس تصور نہیں۔ امام کی "غیبت کبریٰ" کے عقیدے کے مطابق شیعہ ایران میں ایک لحاظ سے بہت پہلے یہ علیحدگی عمل میں آ چکی ہے۔ لیکن مذہبی و سیاسی وظائف کی تقسیم کے متعلق اسلامی تصور کو کلیسا اور مملکت کی علیحدگی کے یورپی تصور سے خلط ملط نہ کرنا چاہیے۔ اسلام نے صرف وظائف کی تقسیم کی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں رفتہ رفتہ شیخ الاسلام اور وزراء کے مناصب پیدا ہو گئے۔ یورپ میں یہ علیحدگی روح و مادہ کی مابعد الطبیعی ثنویت پر مبنی ہے۔ مسیحیت ابتدا میں راہبوں کا ایک نظام تھی جسے معاملاتِ دنیا سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسلام ابتدا ہی سے ایک سول معاشرہ تھا جس کے سول قوانین تھے اگرچہ اصلاً ان کے متعلق الہامی ہونے کا عقیدہ تھا۔ مابعد الطبیعی ثنویت نے جس پر یورپی تصور مبنی ہے، مغربی قوموں کے لیے نہایت تلخ ثمرات پیدا کئے۔ مدت ہوئی امریکہ میں ایک کتاب تصنیف کی گئی تھی جس کا نام تھا "اگر مسیح شکاگو آئے"[1] اس کتاب پر تبصرہ کرتا ہوا ایک امریکی مصنف لکھتا ہے:

"مسٹر سٹیڈ[2] کی کتاب سے جو سبق حاصل کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ عالمِ انسانیت جن برائیوں کے ہاتھوں مصیبت میں پڑا ہوا ہے ان کا انسداد صرف مذہبی جذبات کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے، لیکن انسداد کا ضروری کام بڑی حد تک مملکت کے حوالے کر دیا گیا ہے پھر مملکت کا نظم و نسق ان سیاسی مشینوں کو سونپ دیا گیا ہے جو خرابی اور بداطواری کا سرچشمہ ہیں۔ ایسی مشینیں ان برائیوں کے انسداد کے لیے نہ صرف آمادہ ہی نہیں بلکہ نااہل بھی ہیں۔ بے شمار انسانوں کو نکبت و فلاکت سے اور مملکت کو ذلت و پستی سے بچانے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں کہ نظامِ عامہ کے متعلق شہریوں میں مذہبی بیداری پیدا کی جائے۔"

---

[1] IF CHRIST CAME TO CHICAGO

[2] STEAD

بہرحال مسلمانوں کے سیاسی تجربے کی تاریخ میں مذہب و مملکت کی علیحدگی صرف وظائف تک محدود تھی اصل تصورات سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا اسلامی ملکوں میں مذہب و مملکت کی علیحدگی کا مطلب یہ ہے کہ قانون سازی کے متعلق مسلمانوں کی سرگرمیاں عوام کے ضمیر سے آزاد ہو گئیں جس نے صدیوں سے اسلامی روحانیت کی آغوش میں تربیت پائی ہے اور پھولا پھلا ہے۔ صرف تجربہ ہی بتا سکے گا کہ دورِ حاضر کے ترکی میں یہ تصور کون سی عملی شکل اختیار کرتا ہے۔ ہم صرف دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اس سے وہ برائیاں پیدا نہ ہوں جو اس نے یورپ اور امریکہ میں پیدا کیں۔

میں نے ترکوں کی نئی اصلاحات پر اختصاراً جو بحث کی اس میں روئے سخن پنڈت جواہر لال سے زیادہ عام مسلمان خواندگانِ کرام کی طرف تھا۔ جس نئی چیز کا ذکر پنڈت جی نے بطور خاص کیا ہے یہ ہے کہ ترکوں اور ایرانیوں نے نسلی اور قومی نصب العین اختیار کر لیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ سمجھ رہے ہیں ایسے نصب العین اختیار کر لینے کا مطلب یہ ہوا کہ ترکی اور ایران اسلام سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ تاریخ کا طالب علم خوب جانتا ہے کہ اسلام کا ظہور ایسے زمانے میں ہوا تھا جب انسانوں کے درمیان اتحاد کے پرانے اصول مثلاً خونی رشتہ داری اور ملوکیت ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ اسلام نے انسانوں کے درمیان اتحاد کی بنیاد خون اور ہڈیوں پر نہیں بلکہ انسانی قلوب پر رکھی۔ عالم انسانیت کے نام اس کا عمرانی پیغام یہ ہے: "نسلی تمیز ختم کر دو ورنہ خانہ جنگیوں میں تباہ ہو جاؤ گے"۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ اسلام فطرت کے نسل ساز منصوبوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا اور وہ اپنے خاص اداروں کے ذریعے سے ایک ایسا نقطۂ نگاہ پیدا کرتا ہے جو فطرت کی نسل ساز قوتوں کا انسداد کرتا رہے گا۔ گزشتہ ایک ہزار سال کے اندر اس نے انسانی تربیت کے سلسلے میں ایسا کام انجام دیا جو مسیحیت اور بدھ مت کے دو ہزار سالہ کام سے بھی بدرجہا زیادہ اہم تھا۔ یہ واقعہ ایک معجزے سے کم نہیں کہ ہندوستان کا مسلمان مراکش پہنچتا ہے تو نسل اور زبان کے اختلاف کے باوجود اسے کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ بایں ہمہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام سرے سے نسل کا مخالف ہے۔ تاریخ سے ظاہر ہے کہ عمرانی اصلاحات کے سلسلے میں اسلام نسلی تعصب کو بتدریج مٹانے کا قائل ہے اور وہ ایسا راستہ اختیار کرتا ہے جس میں مزاحمت کا کم سے کم امکان ہو۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے: "ہم نے تمہیں نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ اور اصل یہ تقسیم کوئی ذریعۂ امتیاز نہیں، اور خدا کے نزدیک امتیاز و شرف اسی کے لیے ہے جو سب سے زیادہ متقی یعنی زندگی میں سب سے زیادہ پاکیزہ ہے"۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نسل کا مسئلہ بہت وسیع ہے اور انسانوں

(تفصیل اگلے صفحہ پر)

میں سے عصبیت کو ختم کرنے کے لیے بہت زیادہ وقت درکار ہے۔ البتہ اسلام نے اس مسئلے کے متعلق ایسا طریقہ اختیار کیا کہ رفتہ رفتہ تعصبات وامتیازات مٹادے اور خود نسل سازی عامل نہ بنے۔ یہی معقول اور قابل عمل طریقہ ہو سکتا ہے۔ سر آرتھر کیتھ[1] کی چھوٹی سی کتاب "مسئلہ نسل"[2] ایک نہایت عمدہ ٹکڑا ہے۔ جسے اقتباساً یہاں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

"اور اب انسان پر یہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے کہ فطرت کا ابتدائی مقصد —— نسل سازی —— دور جدید کی اقتصادی دنیا کی ضرورتوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا اور انسان اپنے دل سے پوچھ رہا ہے: مجھے کیا کرنا چاہیے؟ جس نسل سازی پر فطرت اب تک کاربند رہی کیا اسے ختم کر دوں اور دائمی امن حاصل کروں یا کیا فطرت کو کھلا چھوڑ دوں کہ وہ اپنے پرانے راستے پر بڑھتی چلی جائے جس کا لازمی نتیجہ صرف ایک ہو گا یعنی جنگ۔ انسان کو چنانچہ دو میں سے ایک طریقہ چن لینا چاہیے، بیچ میں چلنا ممکن ہی نہیں۔"

غرض ظاہر ہے کہ اگر اتاترک کا محرک تورانیوں کا اتحاد ہے تو وہ روح اسلام کے خلاف اتنا نہیں جارہا جتنا روح زمانہ کے خلاف جا رہا ہے۔ اگر وہ نسلوں کی مطلقیت کا معتقد ہے تو دور حاضر کی روح سے شکست کھائے گا جو روح اسلام کے عین پہلو بہ پہلو جاری ہے۔ شخصاً میں نہیں سمجھتا کہ اتاترک تورانی اتحاد کے جذبے سے متاثر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سلافی اتحاد، جرمنیت کے اتحاد اور اینگلو سیکسن اتحاد کے نعروں کا صرف ایک سیاسی جواب ہے۔

جو کچھ میں اوپر لکھ چکا ہوں، اس کا مطلب ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا جائے تو یہ جان لینا مشکل نہیں کہ

(بقیہ صفحہ سابقہ)

لہ سورۃ حجرات آیت نمبر ۱۳ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝

---

[1] SIR ARTHUR KEITH

[2] THE PROBLEMS OF RACE

قومی نصب العین کے متعلق اسلام کی روش کیا ہے اگر قومیت کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ ہر شخص کو وطن سے محبت ہوتی ہے بلکہ وہ اس کی عزت کے لیے جان بھی دے سکتا ہے تو یہ قومیت مسلمانوں کے ایمان کا جز ہے۔ اسلام سے قومیت کا تصادم اُس وقت ہوتا ہے جب وہ ایک سیاسی تصور کا کردار اختیار کر لیتی ہے اور انسانوں کے اتحاد کا ایک اصول ہونے کی مدعی بن جاتی ہے۔ اس طرح مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام محض ایک نجی عقیدے کے طور پر پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں اس کے لیے زندہ عامل کی حیثیت باقی نہ رہے۔ ترکی، ایران مصر اور دوسرے اسلامی ملکوں میں ایسا مسئلہ پیش ہی نہیں آ سکتا۔ ان ملکوں میں مسلمانوں کو بہت بڑی اکثریت حاصل ہے اور وہاں کی اقلیتیں ——— یہودی، عیسائی، اور زرتشتی ——— شریعت اسلام کے مطابق "اہل کتاب" یا "شبہ اہل کتاب" ہیں اور شریعت اسلام نے ان کے ساتھ عمرانی روابط قائم کر لینے کی آزادی دیدی ہے ان میں ازدواجی تعلقات بھی شامل ہیں۔ مسلمانوں کے لیے قومیت صرف ان ملکوں میں ایک مسئلہ بنتی ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور قومیت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی مستقل ہستی بالکل مٹ جائے۔ مسلم اکثریت والے ملکوں میں اسلام قومیت کو گوارا کر لیتا ہے، کیونکہ ان ملکوں میں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہیں، لیکن اسلامی اقلیت والے ملکوں میں تہذیبی وحدت کے طور پر مسلمانوں کے لیے خود مختاری کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے۔ دونوں صورتوں سے اسلام کو پوری مطابقت ہے۔

سطور بالا میں دنیائے اسلام کی امروزہ حالت کا صحیح نقشہ صراحتاً پیش کر دیا گیا ہے۔ اگر اسے ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا جائے تو واضح ہو جائیگا کہ اسلامی اتحاد کے احساسات و حقائق کسی خارجی یا داخلی قوت سے قطعاً متزلزل نہیں ہوتے۔ میں پہلے کھول کر بیان کر چکا ہوں کہ اسلامی اتحاد اسلام کے دو بنیادی عقیدوں پر مشتمل ہے ان میں پانچ مشہور ارکان اسلام کا اضافہ کر لینا چاہیئے۔ یہ اسلامی اتحاد کے اساسی اجزاء ہیں اور یہ اتحاد رسول اللہ (صلعم) کے عہد مبارک سے زمانۂ حال تک قائم رہا ہے۔ پچھلے دنوں اس میں ایران کے بہائیوں نے اور ہندوستان کے احمدی قادیانیوں نے خلل پیدا کیا ہے۔ یہی اتحاد دنیائے اسلام میں عملاً یکساں روحانی فضا پیدا کرنے کا ضامن ہے۔ اسی کی بدولت اسلامی ملکوں میں سیاسی اتحاد کے لیے صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مسلم ملکوں کا اتحاد ایک عالمی مملکت کی صورت میں بھی اختیار کر سکتا ہے جسے نصب العین سمجھنا چاہیئے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلم ملکوں کی ایک جمعیت بن جائے یا متعدد خود مختار مملکتیں ایسے میثاق اور معاہدے کر لیں جو خالص سیاسی اور اقتصادی مصلحتوں پر مبنی ہوں۔ رفتار زمانہ سے اس سادہ مذہب کے تصوراتی نظام کے تعلق کی یہ کیفیت ہے

اس تعلق کی گہرائی کا اندازہ قرآن مجید کی خاص آیات ہی کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں اس کی تفصیل ممکن نہیں کیونکہ اس معاملے سے انحراف کرنا پڑے گا جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ سیاسی اعتبار سے ملّی اتحاد صرف اس وقت معرض زوال ہوتا ہے جب اسلامی مملکتیں ایک دوسرے سے جنگ کرتی ہیں اور مذہبی اعتبار سے اس وقت معرض زوال کی نوبت آتی ہے جب مسلمان بنیادی عقیدوں اور ارکان شریعت سے انحراف کریں۔ اس ابدی اتحاد کے مفاد کا تقاضہ یہ ہے اپنے حلقے کے اندر کسی باغی گروہ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ البتہ اس حلقے سے باہر ایسے گروہ کے ساتھ رواداری کا وہی برتاؤ کیا جائے گا جو دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے مرعی رکھا جاتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فی الوقت اسلام ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے یہ سیاسی اتحاد کی ایک صورت سے منتقل ہو کر دوسری صورت کی طرف جا رہا ہے جس کا تعین ابھی تک تاریخ کی قوتوں نے نہیں کیا۔ دنیائے حاضرہ میں واقعات ایسی تیزی سے پیش آ رہے ہیں کہ کوئی پیشین گوئی کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اگر سیاسی اعتبار سے دنیائے اسلام متحد ہو گئی تو غیر مسلموں کے متعلق اس کی روش کیا ہوگی؟ اس سوال کا جواب صرف تاریخ ہی دے سکتی ہے۔ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اسلام یورپ اور ایشیا کے بین درمیان واقع ہے اور یہ زندگی کے متعلق مشرق و مغرب کے نقطہ نگاہ کا امتزاج ہے۔ اس کو مشرق و مغرب کے درمیان ایک قسم کا واسطہ بننا چاہیے۔ لیکن اگر اہل یورپ کی حماقتوں نے مسلمانوں سے مصالحت ناممکن بنا دی تو نتیجہ کیا ہوگا؟ یورپ میں آج کل روز بروز جو حالات پیش آ رہے ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ اسلام کے متعلق یورپ کی روش میں بنیادی تبدیلی ہو جائے۔ ہم صرف یہی دعا کر سکتے ہیں کہ سامراجی حرص یا اقتصادی استحصال کے تقاضے سیاسی بصیرت پر پردہ نہ ڈال دیں۔

جس حد تک ہندوستان کا تعلق ہے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے مسلمان کسی ایسے سیاسی نظریہ کے روبرو سرِ تسلیم خم نہ کریں گے جو ان کی مستقل تہذیبی حیثیت کو تباہ کر دے۔ مستقل تہذیبی حیثیت کے متعلق اطمینان ہو جائے تو مذہب اور حب وطن کے تقاضوں میں ہم آہنگی کرنے کے لیے ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

میں ہز ہائی نس آغا خاں کے متعلق بھی ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے آغا خاں کو کیوں حملے کا نشانہ بنایا۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ وہ بظاہر اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ اسماعیلیوں کی فقہی تاویلات کتنی ہی غلط کیوں نہ ہوں اسلام کے بنیادی اصولوں پر ان کا ایمان ہے۔ بلاشبہ وہ دائمی امامت پر اعتقاد رکھتے ہیں لیکن ان کے نزدیک

امام ربانی الہام کا حامل نہیں ہوتا، بلکہ صرف شریعت کا شارح ہوتا ہے۔ کل ہی کی بات ہے (ملاحظہ ہو مشائخ الٰہ آباد ۳۰ مارچ ۱۹۳۵ء) ہز ہائی نس آغا خان نے اپنے پیروؤں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"شہادت وہ کر اللہ ایک ہے (اشہد ان لا الٰہ الا اللہ) شہادت دو محمد اللہ کے رسول ہیں (اشہد ان محمد رسول اللہ)۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ کعبہ سب کا قبلہ ہے۔ تم مسلمان ہو اور مسلمانوں کے ساتھ تمہیں رہنا چاہیئے۔ مسلمانوں کو سلام (السلام علیکم) کہہ کر کرو اپنے بچوں کے نام اسلامی رکھو۔ مسجدوں میں مسلمانوں کے ساتھ با جماعت نماز ادا کرو۔ روزے پابندی سے رکھو۔ اپنی شادیاں اسلامی قانون نکاح کے مطابق کرو۔ تمام مسلمانوں کیساتھ بھائی بھائی جیسا سلوک روا رکھو۔"

اب پنڈت جواہر لال نہرو فیصلہ فرمائیں کہ آیا آغا خان اسلامی اتحاد کی نمائندگی کر رہے ہیں یا نہیں؟

علامہ کے ان دو بیانوں نے قادیانیت کو مسلمانوں کی ذہنی فضا سے نکال باہر کیا اور قادیانی قلعہ مسمار ہو گیا۔ علامہ ان بیانوں کے بعد کچھ دن کم تین سال زندہ رہے اگر پاکستان بن جانے تک زندہ رہتے تو اغلب تھا کہ مرزائی امت آغاز ہی میں اقلیت کا درجہ پا جاتی۔ ظفر اللہ خان وزیر خارجہ نہ ہوتا اور قادیانی پاکستان میں اقتدار حاصل نہ کرتے جو مختلف الاصل سازشوں کا محرک ہوا۔ پاکستان میں نہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت چلتی نہ مسلمانوں کا خون ارزاں ہوتا، نہ مارشل لاء لگتا، نہ ملک عسکری چنگل میں جاتا نہ دولخت ہوتا۔ نہ قادیانیت عرب ملکوں میں مسر نیت کا نقش ہوتی۔ نہ عالمی سامراج اس سے گٹھ بندھن کرتا اور نہ عالمی سامراج کا آلہ کار ہونے کی حیثیت میں اسے کوئی حوصلہ ہوتا۔

علامہ اقبال کی رحلت کے بعد ملکی سیاست کے رجعتی مسلمانوں اور سرکاری دولت کے لادین فرزندوں نے قادیانیت کی طرفداری کا ڈول ڈالا۔ جب پاکستان بنا تو ظفر اللہ خان قادیانیت کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہو گیا قائداعظم کی وفات کے بعد سرکاری افسروں کی عیاشی اور بعض وزراء کی لادینی رنگ لائی۔ ان خرابیوں کی بدولت مرزائی مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ کئی ایک دانشوروں نے تو تشکیک کا ایندھن بیکہ سرکاری مسلک کی اعانت کا نادیہ نکالا لیکن کسی میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ مرزائیوں کو مسلمان کہنے کے لیے عوام سے ہمکلام ہو

لہ STAR

وہ ان محاسبین کے خلاف گل کترنے یا زہر اگلنے جو قادیانیت کا تعاقب کرتے اور قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ گردانتے تھے۔

سب سے افسوسناک پہلو یہ تھا کہ جو لوگ نظم و نثر کے میدانوں میں علامہ اقبال کے وارث کہلا رہے تھے وہ ان کے سوانح و افکار کو اپنی ملکیت قرار دیتے انہوں نے ایک ذرہ استشہاد کے سوا اس باب میں علامہ اقبال سے فرار کیا بلکہ یہ صحیح تر ہے کہ غداری کی۔ علامہ اقبال کا عشق ختم المرسلین عام مسلمانوں کے دل میں راسخ ہو چکا تھا اور محض حیثیت الجماعت وہ قادیانیوں کے اسلام پر صاد کرنے کو تیار نہ تھے۔

تحریک راست اقدام

۱۹۵۳ء کی تحریک راست اقدام مرزائیت کے خلاف سب سے بڑی تحریک تھی۔ اس سے پہلے مرزائیت کی پیدائش سے لے کر کسی دور میں اتنا زبردست مظاہرہ کبھی نہ ہوا تھا۔ یہی تحریک تھی جس میں:

(۱) مسلمانوں کے تمام فرقوں نے متحد العمل ہو کر احتجاج کیا۔

(۲) حکومت نے مسلمانوں کی متفقہ آواز کو ٹھکرا کر اس سے ٹکر لی۔

(۳) پنجاب میں پولیس کا نظام شل ہو گیا۔ صوبائی سیکرٹریٹ کا ماتحت عملہ خوفناک حکومتی تشدد کے خلاف تحریک میں احتجاجاً شامل ہو گیا۔ اس کے علاوہ لاہور میں ریلوے، ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے عملہ نے بھی ہڑتال کی۔

(۴) اکثر اضلاع کی انتظامیہ بے بس ہو گئی۔

(۵) حکومت نے پاکستان کی بہادر فوج کو اپنی ہی قوم کے خلاف استعمال کیا۔

(۶) فوج نے مارشل لاء کی شدت کو بہ جبت استعمال کیا۔

(۷) ان علماء کو جو تحریک میں شامل تھے، ایک منتقمانہ ذہن کے ساتھ بہیمانہ سلوک کا مستحق گردانا گیا۔

(۸) مسلمانوں کی ایک ڈار جیل میں بند کر دی گئی۔ بہت سے مسلمان، پولیس اور فوج نے سرِ عام شہید کیے۔

(۹) بعض پولیس افسر جو گنہگار راتیں گذارنے کے عادی تھے انہوں نے مسلمانوں کو سر عام گولیوں سے بھون ڈالا اور ان کی لاشوں کے ساتھ انتہائی وحشیانہ سلوک کیا۔

(۱۰) مرزائیوں نے اپنی جیپوں اور کاروں میں سوار ہو کر بے گناہ مسلمانوں کو شہید کیا۔

(۱۱) مرزائیوں کو ہر عنوان سے تحفظ دیا گیا۔

(۱۲) سب سے المناک تحقیقاتی عدالت کا وہ ڈرامہ تھا جو پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر کی صدارت میں کھیلا گیا۔ اس کے کل ۱۱۷ اجلاس ہوئے جن میں جسٹس منیر نے علماء کا استخفاف کیا اور جب ۴۰۰ صفحات پر مشتمل انگریزی میں رپورٹ تیار کی تو وہ اسلام کے نام پر نام نہاد مملکت کے ایک صوبائی چیف جسٹس کی اسلام کے خلاف شرمناک دستاویز تھی۔

اس تحریک کا آغاز کیونکر ہوا، احرار کے باب میں بیان ہو چکا ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود عالمی اقتدار کی شہ پر اقتدار کا خواہاں نہ ہوتا، مرزائی افسر اپنے عقائد کی آبادی میں منہمک نہ ہوتے، سر ظفر اللہ خان وزارت خارجہ کی مسند پر فروکش ہو کر مختلف عہدوں پر قادیانیوں کی بھرتی نہ کرتا اور سفارت خانوں میں قادیانی امت دوہری خدمات کے لیے مامور نہ ہوتی تو نہ مختلف مکاتیب فکر کے علماء متحد و مشتعل ہوتے اور نہ مسلمانوں میں تحریک اس شباب کو پہنچتی۔ اس تحریک کے پھیلاؤ کا واحد سبب یہ تھا کہ مرزائی خطرہ واضح ہو چکا تھا۔ خواجہ ناظم الدین سیدھے سادے مسلمان تھے۔ انہوں نے مجلس عمل کے وفود سے صاف صاف کہا اور تحقیقاتی عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے بھی اعتراف کیا کہ وہ مجلس عمل کے مطالبات تسلیم کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے کیونکہ خارجی دباؤ قادیانیوں کے حق میں تھا اور امریکہ ظفر اللہ خان کی علیحدگی پر پاکستان کی غذائی ضروریات کے لیے گندم دینے کو تیار نہ تھا۔ صرف یہی چیز ظاہر کرتی ہے اور یہ اس وقت کے وزیر اعظم کا بیان تھا کہ مرزائی رسوخ کا حال کیا تھا اور ظفر اللہ خان نے استعماری طاقتوں کو اپنے لیے کیونکر ڈھال رکھا تھا۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس کے مطالبات احرار کے باب میں درج کیے جا چکے ہیں۔

۱۔ قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے۔

۲۔ سر ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ سے سبکدوش کر دیا جائے۔

۳۔ مرزائی افسروں کو کلیدی اسامیوں سے ہٹایا جائے۔

۴۔ ربوہ کی بقیہ اراضی پر مہاجرین کو آباد کیا جائے۔

جب خواجہ صاحب نے مندرجہ بالا عذر کے تحت ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو ان پارٹیوں نے ایک مجلس عمل قائم کی اور اس غرض کے واسطے اقدام کا فیصلہ کیا کہ

۱۔ خواجہ ناظم الدین مطالبات تسلیم نہ کرنے کے عذر پر مستعفی ہو جائیں۔

۲۔ مرزائیوں کا کامل مقاطعہ کیا جائے۔

تمام پارٹیوں سے پندرہ ارکان کی ایک مجلس عمل قائم کی جائے جو راست اقدام کی انچارج ہو اور راست اقدام یہ تھا کہ پانچ رضاکار مطالبات کے جھنڈے اٹھا کر وزیر اعظم کی کوٹھی پر جائیں اور پُرامن رہ کر لگاتار مظاہرہ کریں۔ اسی قسم کا مظاہرہ گورنر جنرل ہاؤس پر کیا جائے عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ رضاکاروں کے ساتھ بالکل نہ جائیں۔ مولانا ابوالحسنات کو پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا۔ خواجہ ناظم الدین سے آخری وفد ۲۲ فروری کو ملا۔ خواجہ صاحب نے دو ٹوک جواب دیدیا تو ۲۶ فروری کو اس صورت حال پر غور کرنے کے لیے کراچی میں مجلس عمل کا ایک اجلاس ہوا، اس میں راست اقدام کا فیصلہ کیا گیا، لیکن اسی شب یعنی ۲۶، ۲۷ فروری کی درمیانی رات کو حکومت نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالحسنات قادری، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا لال حسین اختر اور سید مظفر علی شمسی کو بعض دوسرے رفقاء سمیت کراچی میں گرفتار کر لیا۔ ہر تحریک کا خاصہ ہے کہ جب اس کے راہنما اس طرح گرفتار کر لیے جاتے ہیں تو عوام بھڑک اٹھتے ہیں اور ان کا احتجاج ہمہ گیر ہو جاتا ہے۔ ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی، پنجاب آگ بگولا ہو گیا۔ تمام صوبہ میں تحریک کے نمایاں راہنما اور معروف کارکن بھی اسی رات پکڑ لیے گئے۔ لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، راولپنڈی، لائل پور اور منٹگمری میں تحریک کا طوفان برپا ہو گیا۔ راقم نے لاہور کے احتجاجی جلوس خود دیکھے ان کا جوش و خروش بے پناہ تھا لیکن سب پُرامن تھے وہ دہلی دروازہ سے نکلتے اور نیلا گنبد روڈ سے گورنمنٹ ہاؤس کی طرف جاتے پولیس انہیں اسمبلی ہال کے چوک میں روکتی اور گرفتاریاں کرتی۔ آخر پولیس نے اپنے وحشیانہ تشدد کا آغاز کیا اور مختلف اکابر کی گرفتاریوں کے بعد ان جلوسوں پر حملہ آور ہو گئی جو اس غرض سے قائم تھے۔ مولانا اختر علی خاں، ایڈیٹر زمیندار تحریک سے نکل جانا چاہتے تھے، لیکن عوام کے دباؤ میں آ کر گرفتار ہو گئے۔ حضرت مولانا احمد علی نے ایک جلوس کی راہنمائی کی۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس کا انداز یہ تھا کہ وہ رضاکاروں کو پکڑتی اور ٹرکوں پر سوار کر کے کہیں دور جا کر چھوڑ دیتی۔ ۴ مارچ کو افسروں نے ایک میٹنگ کر کے اپنی امداد کے لیے فوج کو درخواست کی اسی رات دفعہ ۱۴۴ لگا کر جلوس وغیرہ نکالنے کی ممانعت کر دی۔ ادھر ۴ مارچ کو جناح باغ میں فوج پہنچ گئی اس کے ساتھ بارڈر پولیس بھی آ گئی، لیکن اندرون شہر کا علاقہ دفعہ ۱۴۴ سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ ادھر نا کل میں ۱۴ آدمی دفعہ ۱۴۴

کی خلاف ورزی میں پکڑے گئے۔ ادھر ٹولنٹن مارکیٹ مال روڈ پر ایک جلوس لاٹھی چارج سے منتشر کیا گیا۔ ایک ہجوم منٹگمری روڈ سے چیرنگ کراس کی طرف جا رہا تھا اس کو پولیس نے گولی چلا کر منتشر کیا۔ لاہور کی مسجد وزیر خان میں مولانا عبدالستار نیازی نے تحریک کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا۔ کئی جگہ پولیس اور عوام میں مڈبھیڑ ہوئی۔ ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس نے راقم سے بیان کیا کہ ایک ایسی تحریک جو پُرامن ہو لیکن پولیس اس کو ختم کرنے سے قاصر ہو تو اس صورت میں پولیس خود تشدد اٹھا کر اپنے تشدد کا راستہ نکالتی ہے، یہی اس تحریک میں ہوا۔ دن بھر پولیس اور عوام میں کئی جگہ تصادم ہوا۔ سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سٹی کوتوالی کو مسجد وزیر خان سے باہر اہانت قرآن کے الزام میں لوگوں نے قتل کر دیا۔ اس کے جسم پر پولیس رپورٹ کے مطابق ۵۲ زخم تھے۔ ان کے علاوہ بعض پولیس افسر زخمی ہوئے ان سے ریوالور کے علاوہ بندوقیں چھین لی گئیں۔ کئی جگہ گولی چلائی گئی اور ان سے جانی نقصان ہوا۔ اسی رات کرفیو نافذ کر دیا گیا لیکن رات بھر شہر میں ہنگامہ جاری رہا۔ ۵ مارچ کو اندرون شہر پولیس سے آزاد ہو گیا کوئی پولیس افسر شہر میں داخل ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ نتیجۃً لاہور شہر انتظامیہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جہاں پولیس کو موقع ملتا وہ گولی چلاتی اور جہاں عوام کا بس چلتا وہ توڑ پھوڑ کرتے۔ ایک جیپ میں قادیانیوں نے راہ چلتے اکا دکا مسلمانوں پر فائر کیا۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے ایک آدھ قادیانی کو مار دیا۔ کچھ اومنی بسیں جلا دیں، اسی طرح دو پوسٹ آفس لٹ گئے، پھر انہیں جلا دیا گیا۔ غرض پولیس کے بے پناہ تشدد نے عوام کو اس درجہ برافروختہ کیا کہ پورا شہر الاؤ کی طرح بھڑک اٹھا۔ پولیس عضو معطل ہو کر رہ گئی۔ اس صورت حال کے پیش نظر گورنر نے بعض عوامی نمائندوں کو بلا کر مشورہ کیا۔ اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی تھے۔ انھوں نے امن عامہ کی بحالی کے لیے جو مسودہ تیار کیا وہ مسودہ گورنر اور وزیراعلیٰ نے منظور نہ کیا۔ وہ مطالبات کی حمایت میں تھا کہ حکومت ان پر غور کرے گی لیکن حکومت کسی حال میں ان پر غور کرنے کو تیار نہ تھی۔ ۶ مارچ سیکرٹریٹ کے عملہ کی ہڑتال کا دوسرا دن تھا۔ اس روز ریلوے ملازمین کے ایک حصہ نے بھی ہڑتال کر دی۔ پولیس نے بیان کیا کہ وہ ایک ٹرین کو تباہ کر رہا ہے۔ سب سے زیادہ نقصان گوالمنڈی کے علاقہ میں ہوا کہ وہاں ایک قادیانی اے۔ ایس۔ آئی عبدالکریم نے بعض آدمیوں کو ہلاک کیا۔ ملک خان بہادر سپرنٹنڈنٹ پولیس کشمیری نے بھی دو آدمی بلاوجہ شہید کر ڈالے۔ اسی رات گورنر نے فوج کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ مارشل لاء لگانے پر غور کیا چھ مارچ کو صورت حالات بالکل بے قابو ہو گئی۔ سیکرٹریٹ کے عملہ نے یکجا ہو کر مظاہرہ کیا کہ فائرنگ بند کرو۔ تمام اعلیٰ افسروں نے انہیں سمجھانا چاہا لیکن وہ بدستور مظاہرہ کرتے رہے۔ گورنر ہاؤس کی بجلی کاٹ دی گئی۔ فون ناکارہ کر دیئے گئے۔ ادھر انارکلی کی بعض دکانیں آگ کی نذر ہونے لگیں۔ لاہور سٹی کوتوالی کا محاصرہ کر لیا گیا۔ جیل، ٹیلی گراف آفس اور

ٹیلی فون ایکسچینج کے ملازموں نے ہڑتال کر دی۔ ریلوے کے ملازموں نے انجن شیڈ پر قبضہ کر لیا۔ لاہور اور شیخوپورہ کے درمیان ریلوے کی پٹری اکھاڑ دی گئی۔ کئی جگہ ٹیلیفون کے تار توڑ دیئے گئے۔ جب صورت حالات اس انتہا کو پہنچ گئی کہ پورا نظام حکومت معطل ہو گیا تو ڈیڑھ بجے دن مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اس دوران میں مسلم لیگ کی شہری و قصباتی شاخوں نے مجلس عمل کے مطالبات کی حمایت میں قراردادیں منظور کیں اور مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اس سلسلہ میں تاخیر نہ کرے جب فوج نے مارشل لاء کے تحت اہل لاہور کو اپنے خوفناک عمل سے رنگنا شروع کیا تو میاں ممتاز دولتانہ نے ۶ مارچ کو ۵ مارچ کا جاری کردہ بیان واپس لے لیا۔ اس بیان میں انہوں نے عوام کو تسلی دیتے ہوئے تحریک ختم نبوت کے رہنماؤں سے فی الفور گفتگو شروع کرنے کا وعدہ کیا اور اس امر کا یقین دلایا تھا کہ ان کے وزراء مرکزی حکومت کے سامنے مجلس عمل کے مطالبات پیش کر کے انہیں تسلیم کرنے کی سفارش کریں گے۔ میاں صاحب نے مرکزی حکومت کی تہدیدی ہدایت پر یہ بیان واپس لیا۔ ادھر اُدھر سے فوج نے بے شمار لوگ گرفتار کر لئے حتیٰ کہ مولانا مودودی کو بھی پکڑ کے جیل میں ڈال دیا۔ ان گرفتار شدگان کی سماعت کے لیے فوجی عدالتیں قائم کیں۔ الغرض ایک فوج نے اپنی ہی قوم سے اس طرح کا سلوک کیا جو فاتح اقوام، مفتوح اقوام سے جنگ کے بعد کرتی ہیں۔ لاہور کے علاوہ سیالکوٹ میں بھی رہنماؤں کی گرفتاری سے عوام مشتعل ہو گئے۔ ابتداء انتظامیہ نے کی کہ احتجاجی مظاہرے کو منتشر کرنے کے لیے [illegible] دن پولیس کے علاوہ فوج استعمال کی۔ مولانا محمد علی کاندھلوی کی گرفتاری کے بعد دارالعلوم شہابیہ کے اندر پولیس داخل ہو گئی اور مجمع کو بزور منتشر کرنا چاہا۔ عوام نے مزاحمت کی، پولیس گولی چلاتی رہی، عوام دارالعلوم کی عمارت سے خشت باری کرتے رہے۔ خوب ہنگامہ ہوا۔ پولیس کی لاریاں جلا دی گئیں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی جیپ کو نذر آتش کیا گیا۔ حتیٰ کہ میونسپل فائر بریگیڈ کو بھی جلا دیا گیا۔ یہ سب کچھ دارالعلوم اور اس کے گرد و پیش پولیس کے گولی چلانے کا ردعمل تھا۔ اس کے نتیجہ میں ایک اے۔ ایس۔ آئی کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا گیا۔ جب حالات ہاتھ سے نکل گئے تو ضلعی انتظامیہ نے فوج بلوائی، اس نے گولی چلانی شروع کی تو پہلے راؤنڈ ہی میں چار آدمی شہید اور دس مجروح ہوئے۔ پولیس کے حوصلے بالکل پست ہو گئے تھے فوج نے گرفتاریوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اکثر علماء نے مختلف مسجدوں میں مورچہ لگا لیا۔ کئی روزہ کشمکش کے بعد ۱۰ مارچ کو حالات معمول پر آ گئے۔ گوجرانوالہ میں مولانا محمد اسمٰعیل کی گرفتاری سے ہنگامہ شروع ہو گیا۔ وہاں مولانا عبدالواحد بھی تحریک کے رہنما تھے۔ ان کے علاوہ وزیر آباد میں مولانا عبدالغفور ہزاروی اور کامریڈ عبدالکریم راہنمائی کر رہے تھے۔ حافظ آباد میں مولانا ابوالحسن، مولانا فضل احمد اور مولانا محمد یحییٰ منتظم تھے۔ حکیم عبدالرحمٰن کو گوجرانوالہ کا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا۔ کوئی ساڑھے چار ہزار رضاکار ضلع میں بھرتی ہو گئے۔ پولیس نے رضاکاروں کو کراچی جانے والی گاڑی

سے آزانا چاہا تو مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس کے بعد ہنگامے شروع ہوگئے۔ حکام نے اپنی امداد کے لیے فوج طلب کرلی۔ تحریک کے تمام راہنما گرفتار ہوگئے۔ مزید برآں مندرجہ ذیل مقامات پر تحریک کا زور شور تھا:

۱۔ کامونکے: حافظ عبدالشکور اور جناب لطیف احمد چشتی مقامی راہنما تھے۔

۲۔ گکھڑ: میر محمد بشیر صدر گکھڑ مسلم لیگ نے چند کارکنوں کے ساتھ اپنے تئیں گرفتاری کے لیے پیش کیا۔

۳۔ نوشہرہ ورکاں: ڈاکٹر محمد اشرف نے قیادت کی۔

۴۔ سوہدرہ: مولانا عبدالمجید (اہلحدیث) نے اہتمام کیا۔

راولپنڈی بھی اس تحریک کا اہم مرکز تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے قادیانی مسئلہ پر اپنی پرجوش تقریروں سے عوام کو بیدار و متحد کر دیا تھا۔ مولانا غلام اللہ خاں کو حکومت نے ۲۸ فروری کی شب کو راولپنڈی میں گرفتار کر لیا۔ اس پر دھڑا دھڑ جلسے شروع ہو گئے جلوس نکلنے لگے۔ خود خفیہ ایجنسی کی رپورٹ کے مطابق سب سے بڑا احتجاجی جلسہ جس کی نظیر ماضی میں نہ تھی، حضرت قبلہ سید غلام محی الدین شاہ پیر گولڑہ شریف کے زیر صدارت لیاقت باغ میں منعقد ہوا۔ پولیس نے اپنا حربہ استعمال کیا تو کھلم کھلا ٹکراؤ ہو گیا۔ آخر مارچ کے تیسرے ہفتہ صورت حالات پر قابو پایا گیا۔ کئی ایک علماء گرفتار کیے گئے۔ جامع مسجد میں تحریک کا مرکز قائم ہو گیا۔ ایک ہزار ۲۰۰ رضاکار گرفتار کیے گئے۔ ہزارہ سے دو ہزار پٹھان مارچ کرتے ہوئے راولپنڈی کی طرف آ رہے تھے۔ انتظامیہ بدحواس ہو گئی۔ ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس حضرت پیر گولڑہ شریف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی منت سماجت کی کہ ان دو ہزار پٹھانوں کو واپس کر دیں۔ دونوں افسر اشکبار ہو گئے۔ پیر صاحب قبلہ نے ان پٹھانوں کو واپس کیا کہ ہزارہ میں انتظار کریں۔ ادھر لائل پور تحریک کا ایک بڑا مرکز تھا۔ مولوی عبیداللہ احرار اور غازی محمد حسین ۲۰ فروری ہی کو گرفتار کر لئے گئے۔ لیکن پورے ضلع میں کئی سو کارکن مصروف جہد تھے۔ تمام شہر زعماء کی گرفتاری سے نعل در آتش تھا۔ عوام کے جوش و جذبہ کا یہ عالم تھا کہ پولیس کے حواس جواب دے گئے۔ آخر تمام علاقہ بند کر دیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے یہاں بھی فوج طلب کر لی۔ گرفتاریوں کا تانتا بندھ گیا۔ کئی مسلم لیگی راہنما اور بعض ایم۔ ایل۔ اے گرفتاری کے لیے پیش ہو گئے۔ پولیس کے طرز عمل سے لائل پور کے حالات ۶ مارچ کو نہایت درجہ خراب ہو گئے۔ شیخ بشیر احمد صدر ضلع مسلم لیگ سمیت ۱۰۰ اشخاص گرفتار کیے گئے۔ ان کی گرفتاری کے خلاف دس ہزار افراد نے احتجاجی جلوس نکالا۔ ضلع کچہری میں تصادم ہو گیا۔ ریلوے اسٹیشن پر مظاہرہ ہونے لگا پولیس نے گولی چلا کر چار آدمی

شہید اور چار آدمی سخت زخمی کر دیے گئے۔ اس کے بعد کرفیو لگا دیا گیا۔ اگلے روز شہدا کی نمازِ جنازہ ادا کرنے کے لیے پچاس ہزار افراد پر مشتمل ایک جلوس نکلا تو اس جلوس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فوج بلوا کر گولی چلا دی۔ تین آدمی شہید اور ایک زخمی ہوا۔ ہجوم نے اندرونی ٹرانسمیشن سسٹم کاٹ دیا۔ اگلے روز ۶ مارچ کو کرفیو توڑتے ہوئے زراعتی کالج کے طلبہ نے ایک بہت بڑا جلوس نکالا۔ عوام کرفیو کی دھجیاں بکھیرتے رہے۔ تمام ضلع میں تحریک پھیل گئی۔ سب سے اہم رول مولانا تاج محمود نے ادا کیا کہ ایک مسجد میں مورچہ لگا کے بیٹھ گئے اور انتظامیہ کے نظام کو معطل کر دیا۔ وہ شل ہو کے رہ گئی۔ منٹگمری (ساہیوال) میں تحریک کے منتظم و راہنما مولانا محمد عبداللہ، مولانا حبیب اللہ اور مولانا لطف اللہ (جامعہ رشیدیہ) کے علاوہ مولانا بشیر احمد رضوانی اور مفتی ضیاء الحسن لدھیانوی تھے۔ انہوں نے منٹگمری میں ۲ ہزار، اوکاڑہ میں ڈیڑھ ہزار، عارف والا میں سات سو اور پاکپتن میں دو سو رضاکار بھرتی کیے۔ انتظامیہ نے ۴۸، ۴۸ گھنٹے کا کرفیو لگا کر حالات پر قابو پایا۔ حقیقت یہ ہے کہ پورا صوبہ ایک طرف تھا، دوسری طرف خسرو و قیصر اور قادیانی ظفر اللہ تھا جس نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتا، لاء اینڈ آرڈر کے چہرے کا غازہ بنا لیا تھا۔

پیچھے ذکر آ چکا ہے کہ ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس نے خود راقم سے بیان کیا تھا کہ ہر روز کے مظاہروں کو سمیٹنے کے لیے تشدد کی بنیاد اٹھا کر تحریک ختم کی جائے گی۔ چنانچہ حکام نے اپنے سفید پوش اہل کاروں کی معرفت پولیس پر پتھراؤ کرایا، اس طرح لاہور میں فائرنگ کی بنیاد رکھی۔ بعض منچلے قادیانی اپنی جیپوں میں سوار ہو کر مسلمانوں پر گولیاں داغتے اور انہیں شہید کرتے رہے۔ راقم نے لاہور میں [illegible] مال روڈ پر اپنی آنکھوں دیکھا کہ ۱۵ سے ۲۰ سال کی عمر کے نوجوانوں کا ایک مختصر سا جلوس کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے جا رہا تھا، وہ ایک بے ضمیر سپرنٹنڈنٹ پولیس ڈی۔ سی۔ آئی ملک حبیب اللہ کے حکم پر کسی وارننگ کے بغیر فائرنگ کا ہدف بنا، آٹھ دس نوجوان شہید ہو گئے۔ ان کی لاشوں کو ملک صاحب نے اپنے ماتحتوں سے ٹرکوں میں اس طرح پھنکوایا جس طرح جانور شکار کیے جاتے ہیں۔ یہ نظارہ انتہائی دردناک تھا۔ لاہور چھاؤنی میں ایک قادیانی افسر نے گولیوں کی بوچھاڑ کی لیکن گولی کھانے والوں نے انتہائی استقامت اور کردار کی پختگی کا ثبوت دیا۔ ایک نوجوان ملٹری ہسپتال میں زخموں سے چور چور بے ہوش پڑا تھا۔ جب اسے قدرے ہوش آیا تو اس نے پہلا سوال سرجن سے یہ کیا کہ میرے چہرے پر کسی خوف یا اضمحلال کے نشان تو نہیں ہیں۔ جب اسے کہا گیا کہ نہیں تو اس کا چہرہ وفورِ مسرت سے تمتما اٹھا۔ جن لوگوں کو علما سمیت گرفتار کر کے لاہور کے شاہی قلعہ میں تفتیش کے لیے بھیجا گیا ان کے ساتھ پولیس نے اخلاق باختگی کا سلوک کیا۔ ایک انتہائی ذلیل ڈی۔ ایس۔ پی کو ان پر مامور کیا۔ وہ علماء کو اس قدر فحش گالیاں دیتا اور عریاں نعرے کستا تھا کہ ع

خود خوفِ خدا تھرّا رہا تھا

پولیس کا تو شعار ہی شرفاء پر مشقِ ناز رہا ہے، لیکن فوج نے ہر اس شخص کو ذلیل کیا جس پر یہ گمان کیا گیا کہ وہ تحریک ختمِ نبوت سے کوئی سا تعلق رکھتا ہے۔

ایک مارشل لاء پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں نے امرتسر، لاہور اور گوجرانوالہ میں لگایا تھا ایک مارشل لاء آزادی کے اس زمانہ میں لگا کہ جن لوگوں نے پہلا مارشل لاء دیکھا تھا وہ اس مارشل لاء کو زیادہ بھیانک بتاتے تھے میجر جنرل اعظم خاں اس احساس سے خالی الذہن تھے کہ وہ اپنے اقتدار و اختیار کی شقاوت کا استعمال اپنی ہی قوم پر کر رہے ہیں۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا عبدالستار نیازی کو فوج نے پکڑا۔ ایک فوجی عدالت نے ان کے مقدمہ کی سماعت کی اور ان کو سزائے موت سنا دی۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی سنٹرل جیل لاہور میں پھانسی کی کوٹھڑی میں تھے۔ ان سے بیٹے ملنے گئے تو انہوں نے کہا، اس حکومت سے کوئی اپیل نہ کرنا، پھانسی پا جاؤں تو انہی کپڑوں میں دفنا دینا۔ ان سے چند قدم آگے دوسری کوٹھڑی میں مولانا عبدالستار نیازی تھے۔ وہ مولانا مودودی کے ملاقاتیوں کو للکار کر کہتے "اس بزدل حکومت میں یہ جرأت نہیں کہ مجھے پھانسی پر لٹکا سکے۔ بھلا مولانا کو پھانسی کے تختہ پر کیسے لٹکا سکتی ہے؟ کسی حالت میں وہ مولانا کو پھانسی دینے کا حوصلہ نہیں کر سکے گی۔ وہ اپنی موت سے ڈرتی ہے۔" آخر مارشل لاء کچھ عرصہ بعد ختم ہو گیا، لیکن عوام کے دلوں میں اپنی ہی فوج کے خلاف ایک تلخی پیدا کر گیا۔ اس تلخی کا ازالہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہوا جب بہادر فوج نے بھارتی سیناؤں کے دانت کھٹے کئے۔ مسٹر ممتاز دولتانہ کو ایک ہی ماہ کے اندر اندر وزارت اعلیٰ سے محروم ہونا پڑا۔ ان کی جگہ ملک فیروز خاں نون آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی مولانا احمد علی کو رہا کر دیا۔ اور مارشل لاء کے تمام فیصلہ ماخوذین چھوڑ دیئے۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا عبدالستار نیازی کی سزائیں عمر قید میں تبدیل کر دی گئیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقاء کو جسٹس ایس۔ اے رحمٰن نے ۲۰ فروری ۱۹۵۴ء کو میاں محمود علی قصوری بار ایٹ لاء کی دائر کردہ رٹ سنتے ہی رہا کر دیا اور وہ رفقاء سمیت سنٹرل جیل لاہور سے باہر آ گئے۔

ایک اندازے کے مطابق ایک ہزار مسلمان اس تحریک میں شہید کئے گئے، کس قدر مجروح ہوئے معلوم نہ ہو سکا لیکن گرفتار شدگان کے متعلق پندرہ ہزار کا اندازہ لگایا گیا۔

اس تحریک اور حکومتی تشدد نے کئی چیزوں کو جنم دیا۔

(۱) اپنی ہی قوم سے وحشیانہ سلوک کیا گیا جس سے نوکر شاہی کو سیاست کا چسکا پڑ گیا۔ اور اس نے حکومت کا

خواب دیکھنا شروع کیے ۔

(۱) جمہوریت کا خاتمہ شروع ہوگیا۔ ملک غلام محمد نے میاں ممتاز دولتانہ کو خواجہ ناظم الدین سے برخاست کرایا۔ پھر ماہ بعد خواجہ ناظم الدین کو برخاست کر دیا اور دستور ساز اسمبلی توڑ ڈالی۔

(۲) مولوی تمیز الدین سپیکر دستور ساز اسمبلی نے برخاستگی کے خلاف رٹ کی لیکن جسٹس منیر نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے ملک غلام محمد کے فعل کو جائز قرار دیکر ایک غیر قانونی اقدام کی توثیق کی نتیجۃً عدالتی وقار مجروح ہوگیا اور ملک سازشوں کی ایک نئی ڈگر پہ آگیا۔

(۳) فوجی جرنیلوں کا مزاج سیاسی ہوگیا اور وہ ملک پر حکمرانی کے خواب دیکھنے لگے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے خود نوشت سوانح حیات جس سے اس میلان کی نشاندہی ہوتی ہے ۔

(۵) جس جماعت نے ملک بنایا تھا یعنی مسلم لیگ وہ نوکر شاہی کی داشتہ ہوگئی ۔

(۶) عوام اور حکومت متناسب نہیں تو متصادم ادارے ہوگئے ۔

اس تحریک کا سب سے بڑا المیہ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ تھی گورنر پنجاب نے تحقیقاتی عدالت کو آرڈیننس نمبر ۳ ۱۹۵۳ء کی ہدایات و شرائط کے مطابق قائم کیا تھا جسٹس محمد منیر اس کے صدر اور جسٹس محمد رستم کیانی ممبر تھے کمیشن کی تجویز کردہ ترمیموں کے بعد فسادات پنجاب سے متعلق تحقیقات عامہ ایکٹ ۱۹۵۴ء بن گیا۔ یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو تحقیقات کا آغاز ہوا۔ کل ایک سو ستر ہ اجلاس ہوئے جن میں ایک سو بارہ اجلاس شہادتوں کے لیے مخصوص رہے ۔ کمیشن نے ۱۰ اپریل ۱۹۵۴ء کو اپنا کام ختم کیا اور انگریزی میں تین سو اٹھاسی صفحات کی ایک رپورٹ لکھی ، اس کا اردو ترجمہ سرکاری اہتمام میں کرایا گیا جو محکمہ تعلقات عامہ نے اسی سائز کے چار سو چھتیس صفحات میں شائع کیا ، اس تحقیقات میں جو ادارے شامل کئے گئے وہ حسب ذیل ہیں :

۱۔ حکومت پنجاب	۲۔ صوبہ مسلم لیگ
۳۔ مجلس احرار	۴۔ مجلس عمل (مقرر کردہ مجلس ختم نبوت پنجاب)
۵۔ جماعت اسلامی	۶۔ صدر انجمن احمدیہ ربوہ

۷۔ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور

میاں ممتاز دولتانہ نے ایک درخواست میں استدعا کی کہ انہیں بھی ایک فریق بنایا جائے ، اس پر عدالت نے انہیں ایک فریق قرار دیدیا اور ہدایت کی کہ وہ ایک تحریری بیان داخل کریں ، تمام فریقوں نے حکومت پنجاب اور

جو بانیٔ مسلم لیگ کے سوا تفصیلی بیانات داخل کیے۔ اس رپورٹ کو کئی ایک ذیلی عنوانات کے تحت چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ جسٹس ایم۔ آر کیانی مرحوم نے راقم سے کہا تھا کہ وہ اس کتاب کی اشاعت سے پریشان و پشیمان ہیں۔ اس میں جو حصہ اسلام کے خلاف ہے اور حق تعالیٰ اور قرآن سے متعلق برے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ جسٹس منیر کے قلم سے ہیں۔" اس رپورٹ کا غالب حصہ یک طرفہ آلائشوں کا حامل ہے اور کسی لحاظ سے بھی پوری رپورٹ کسی جج کی تحریر یا تجزیہ نہیں۔ بلکہ ایک ایسے اخبار کا اداریہ ہے جو کف در دہان قلم سے تبصرہ کرنے کا عادی ہو۔ ڈاکٹر جاوید اقبال خلف الرشید علامہ اقبال نے اپنی ایک نظریاتی کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جو اسلام کے خلاف خود مسلمان ججوں کے قلم سے نکلی ہے۔ اس کی اشاعت روک لی جائے اس کتاب کا ضبط کیا جانا ہی بہتر ہے۔ آج تک نفسِ اسلام کے خلاف دنیائے اسلام میں ایسی دستاویز شائع نہیں ہوئی۔ یہ سب سے بڑی تحریر ہے جس میں دو مسلمان ججوں نے مسلمانوں کی رسوائی کا سامان کیا ہے۔ اس رپورٹ کا مرجانا یقینی تھا ورنہ یہ رپورٹ جلد ہی مر گئی بعض یورپی مصنفوں نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے جوابی تبصرے نے جو اردو کے علاوہ انگریزی اور عربی میں شائع کیا گیا۔ اس رپورٹ کی چتا تیار کی جس میں اس کا وجود بھسم ہو گیا جسٹس منیر احرار کے پیدائشی مخالف تھے اس لیے انھوں نے اپنی طبیعت کا تمام زہر ان کے خلاف اگلا۔ وہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے لیکن احرار کے خلاف تمام برے الفاظ پر اعتماد کیا اور خود جس قدر بھدے الفاظ ہو سکتے تھے ایک جج کی روایات کو پس پشت ڈال کر ان کے خلاف استعمال کیے۔ حتیٰ کہ سی۔ آئی۔ ڈی کے بے ضمیر افسروں کی یادداشتوں سے ماخوذ کردہ الفاظ کو بطور استدلال نقل کیا جن میں احرار پر غداری کا بیہودہ الزام دھرا گیا اور ان کے راہنماؤں کو ہدفِ ملامت بنایا گیا۔ جسٹس منیر کو یہ جرأت تو نہ ہوئی کہ وہ قادیانیت کا دفاع کرتے یا ان کے مسلمان ہونے کا فتویٰ صادر فرماتے، لیکن انھوں نے قادیانیوں کو مختلف واسطوں سے تحفظ دیا اور بزعم خویش یہ ثابت کرنا چاہا کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار ایک مظلوم جماعت ہیں۔ تمام رپورٹ غیر عدالتی اسلوب سے لکھی گئی لیکن شروع سے آخر تک ججوں نے اپنے تئیں عدالت کے حصار میں محفوظ رکھا۔ خود راقم الحروف کو توہینِ عدالت کے جرم میں طلب کر لیا۔ راقم نے اپنے اخبار میں ایک شذرہ بعنوان "ملا کو گالی دو" لکھا جو خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کے ایک کتابچہ "ملا اور اقبال" کا جواب تھا۔ جسٹس منیر اس شذرے سے بہت جز بز ہوئے۔ راقم نے جواب دیا کہ اس شذرہ کا اس عدالت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور نہ اسلام صاحبِ مجوزہ سے ہو گیا ہے۔ احقر نے اسلام کا دفاع کیا ہے اور اگر اسلام کا دفاع کرنا جرم ہے تو احقر کو اپنے جرم کا اعتراف ہے۔ جسٹس منیر راقم کی صاف گوئی سے ٹھنڈے پڑ گئے اور تندہ

تاریخ ڈال کر اس سارے معاملہ خود ہی ختم کر دیا۔ جن علماء کو شہادت کے لیے طلب کیا گیا ان کو نہ صرف تضحیک و استہزا
کا نشانہ بنایا گیا بلکہ مسلمان کی تعریف کیا ہے؟ کا سوال اٹھا کر اسلام پر چھینٹے اڑائے گئے۔ اور ساری رپورٹ
سنڈاس کا پلندہ ہو گئی۔ اس کے برعکس علماء نے اپنی ثقاہت کو قائم رکھا اور طیش میں نہ آئے۔ اگر کوئی عالم دین یا
متعلقہ راہنما جسٹس منیر کے احمقانہ سوالات کا منہ توڑ جواب دیتا تو یہ ممکن تھا اس قسم کی گستاخانہ رپورٹ تیار نہ ہوتی۔
لیکن علماء کی شرافت نے جسٹس منیر کے ویسے چھوٹ کر دیے اور وہ علماء کے خلاف مسلسل نشتر زنی کرتے رہے۔
اس رپورٹ کے مؤلفین سے کہیں زیادہ حکومت کے اعضاء سیانے تھے جنہوں نے اپنا معاملہ اس بیان پر ختم کر دیا
کہ حکومت کا اس بارے میں کوئی نقطۂ نگاہ نہیں۔ اس رپورٹ کو علماء کے خلاف ایک اجتماعی مقدمہ COLLECTIVE
TRAIL کی خصوصیت حاصل ہو گئی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے مشرقی پاکستان کے حالات پر ایک
تجزیاتی رپورٹ قلمبند کی تو اس میں لکھا کہ ہندو اور کمیونسٹ دماغ منیر رپورٹ سے خصوصی فائدہ اٹھا رہے ہیں
اس وقت دنیا میں کوئی ایسی دوسری دستاویز موجود نہیں جو مشرق و مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس
قدر غلط فہمیاں پھیلانے کا موجب ثابت ہوئی ہو۔

ادھر ثقہ حلقوں میں یہ بات گردش کرتی رہی کہ مرزا بشیر الدین محمود نے سی۔ آئی۔ ڈی کی بہت سی نفسی
کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے ہاتھ میں رکھا اور احرار سے متعلق اس قسم کی متعفن رپورٹیں لکھوائیں جو
انسانی دماغ کی معصیت کا نمونہ تھیں۔ جسٹس منیر نے اپنے ذوق کے باعث ان رپورٹوں پر انحصار کیا اور انہیں
حدیث کا درجہ دے کر اپنے قلم کی لکد کوب کا راستہ ہموار کیا۔ ان کے نزدیک ساری تحریک "احرار احمدی نزاع"
تھی اور احرار نے پاکستان دشمنی کے تحت تمام ہنگامہ بپا کرایا تھا۔ جن شہروں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور
ان کے رفقاء کی گرفتاری کے بعد تحریک کے حق میں زبردست مظاہرے ہوئے ان تمام شہروں کا ذکر اوپر آ چکا ہے
جسٹس منیر نے ہر شہر کے مظاہرے کی تفصیلات دیکر یہ ضرور لکھا کہ ان شہروں میں احرار فلاں فلاں وجوہ کے باعث
طاقتور تھے اور جو مظاہرے ہو رہے تھے وہ احرار کی بدولت تھے۔ المختصر شروع سے آخر تک جسٹس منیر کے ذہن
میں جو چیز سوار رہی وہ احرار کا وجود تھا۔ انہیں اس ساری تحریک میں احرار ہی احرار نظر آ رہے تھے کہ احرار
نے پاکستان کو خراب و برباد کرنے کے لیے اس تحریک کا ڈول ڈالا اور ان کا منشاء و مقصد یہ تھا کہ پاکستان کیونکر
تباہ ہوتا ہے۔ ممکن تھا جسٹس منیر احرار پر اس صفائی سے حملہ آور نہ ہوتے اگر ختم نبوت کے مسئلہ میں تمام جماعتیں ایک ہو کر
اپنا مقدمہ لڑتیں اور اپنی جماعتی صفائی پیش کرنے کی بجائے متحدہ دفاع کرتیں۔ جسٹس منیر نے مرزا بشیر الدین محمود اور

سر ظفر اللہ خاں کی نگہداری کے فرائض نہایت ہوشیاری سے انجام دیتے۔ لیکن اس ذہنی تمرد کے باوجود کہ وہ چیف جسٹس کی مسند پر متمکن تھے۔ انہیں یہ حوصلہ نہ ہوا کہ مرزائیوں کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کریں۔ اعوان پر طاعن و مطاعن کے باوجود تسلیم کیا کہ تحریک پھر کسی وقت کروٹ لے سکتی ہے۔

بلاشبہ اُس وقت تحریک پسپا ہو گئی۔ خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد لادین عناصر کا حوصلہ بڑھ گیا۔ ملک غلام محمد نے "انقلاب" کیا تو سردار عبدالرب نشتر کو بھی ان کے اسلامی ذہن کی پاداش میں کابینہ سے حذف کر دیا۔ میاں مشتاق احمد گورمانی وزیر داخلہ تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کی شدید علالت کے پیش نظر راقم انہیں مولانا اختر علی خاں کی رہائی پر آمادہ کر رہا تھا کہ ان کے دولت کدہ پر سکندر مرزا آ گئے۔ مرزا ان دنوں ڈیفنس سیکرٹری تھے انہیں معلوم ہوا کہ مولانا اختر علی خاں کی رہائی کا مسئلہ ہے تو بھڑک اٹھے فرمایا کہ وہ رہا نہیں ہو سکتے راقم نے عرض کیا کہ اُن کے والد بیمار ہیں۔ کہنے لگے کہ وہ خود تو بیمار نہیں؟ راقم نے کہا ان کے والد کی عظیم خدمات ہیں اسی کے پیش نظر اختر علی خاں کو رہا کر دیا جائے۔ سکندر مرزا نے باپ اور بیٹے دونوں کو گالی لڑھکا دی اور کہا "دونوں کو مرنے دو"۔ راقم نے مرزا صاحب کو ٹوکا کہ ابھی پچھلے ہفتے آپ کا بیٹا ہوائی حادثہ میں موت کی نذر ہو گیا ہے۔ اس قسم کے الفاظ آپ کو نہ بولنا چاہئیں۔ گورمانی صاحب نے راقم کے تیور دیکھ کر صحبت ختم کر دی، لیکن مرزا صاحب نے فرمایا یہ کابینہ کی غلطی ہے کہ اُس نے ان مُلّاؤں کو چانس نہیں دیا۔ ہمارے مشورہ کے مطابق پندرہ بیس علماء کو دار پر کھینچ دیا جاتا یا گولی سے اُڑا دیا جاتا تو اس قسم کے جھمیلوں سے ہمیشہ کے لیے نجات ہو جاتی جس شب دولتانہ وزارت برخاست کی گئی اس رات گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں سکندر مرزا کا ایک ہی بول تھا۔ "مجھے یہ نہ بتاؤ فلاں جگہ ہنگامہ فرو ہو گیا یا فلاں جگہ مظاہرہ ختم کر دیا گیا۔ مجھے یہ بتاؤ وہاں کتنی لاشیں بچھائی ہیں۔ کوئی گولی بیکار تو نہیں گئی؟" عبدالرب نشتر راقم کے بہترین دوست تھے ان سے اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی تو فرمایا "جن لوگوں نے شیدائیان ختم نبوت کو شہید کیا اور اُن کے خون سے ہولی کھیلی ہے میں اندرونِ خانہ کے رازدار کی حیثیت سے جانتا ہوں کہ اُن پر کیا بیت رہی ہے اور وہ کن عقوبات و مصائب کا شکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب کا اطمینان سلب کر لیا اور ان کی روحوں کو سرطان میں مبتلا کر دیا ہے۔"

اس تحریک کی پسپائی کے بعد ملک سیاسی توانائی سے محروم ہو گیا اور جمہوریت فالج کا شکار ہو گئی ایک طرف عالمی استعمار کی مداخلت بڑھ گئی دوسری طرف محلاتی سازشوں کا سلسلہ چل نکلا۔ جن لوگوں نے قائداعظم کے دست راست کی حیثیت سے پاکستان کی تحریک میں حصہ لیا تھا وہ ایوان حکومت سے خارج ہونے لگے اس زمانہ ہی سے

مرزائیوں نے عالمی استعمار کے مہرے کی حیثیت سے مہرہ بازی شروع کی اور مختلف محکموں میں حصول اقتدار کا منصوبہ تیار کیا۔ ایوب خان برسر اقتدار آگئے تو قادیانی کئی واسطوں سے ان کے مزاج میں دخیل ہوگئے۔ انھوں نے فوج میں بڑی سے بڑی جگہ پیدا کی۔ اقتصادی زندگی کو ہاتھ میں لینا شروع کیا۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ مرزا غلام احمد کا پوتا ایم۔ ایم احمد مرکزی حکومت میں فنانس سیکرٹری ہوگیا۔ پھر پلاننگ کمیشن کی سربراہی حاصل کی اور اقتصادی منصوبوں کا اجارہ دار ہوا۔ جوں جوں ایوب خان کی ہوا اکھڑتی گئی توں توں انھیں قادیانی قرب کی ضرورت پڑتی گئی۔ ایک طرف حکومت پاکستان کے مختلف شعبوں میں سی۔ آئی۔ اے کا ہاتھ کارفرما تھا دوسری طرف سیاسی ہلچل کا آغاز ہو چکا تھا۔ مرزائی ایک طرف ایوب خان کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے دوسری طرف سی۔ آئی۔ اے کے حسب منشاء شطرنج کھیلتے۔ ایوب خان کے ساتھیوں میں نواب کالاباغ گورنر پنجاب قادیانیوں کے مخالف تھے۔ بالآخر قادیانی انھیں نکلوانے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ گئے تو قادیانی ایوب خان کی مونچھ کا بال ہوگئے۔ انھوں نے حکومت سے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت اخبارات کے نام اس امر کا سرکلر جاری کرایا کہ اشارۃً و کنایۃً یا تفصیلاً و اجمالاً کسی طرح بھی قادیانی فرقہ پر مخفی و جلی تنقید نہ کی جائے کسی نے خلاف ورزی کی تو وہ قانون کے مطابق مستوجب سزا ہوگا۔ ہفت روزہ "چٹان" نے عرب ممالک کی اس دو سطری خبر پر الحمد للہ کا عنوان جمایا کہ "وہاں اس فرقہ کی سرگرمیوں کا احتساب کیا جا رہا ہے ہم بھی ان پر نگاہ رکھیں۔" اس مختصر نوٹ پر چٹان پریس ضبط کر لیا گیا اور راقم کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر کے پنجاب سے باہر نظر بند کر دیا گیا۔ اس سلسلہ کی تفصیلات ایک علیحدہ باب میں آئیں گی لیکن ۱۹۵۳ء کی تحریک کے پسپا ہونے کا نتیجہ تھا کہ صدر ایوب کی حکومت نے ایڈووکیٹ جنرل کی معرفت لاہور ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ کو پاکستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ اس امر کا بیان دیا کہ قادیانی مسلمان ہیں۔ اس سے پہلے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی۔

ممکن تھا حکومت کو حوصلہ نہ ہوتا لیکن جس بری طرح ۱۹۵۳ء کی تحریک کو کچلا گیا تھا اس نے کئی برس کے لیے مسلمانوں کے جذبات کو منجمد کر دیا تھا۔ اس دوران میں کئی سانحات ہوتے رہے ایوب خان کے مارشل لاء کی عمر دراز ہوگئی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری جو اس تحریک کی روح رواں تھے اپنے اللہ کے ہاں چلے گئے۔ ان کے جانشین قاضی احسان احمد شجاع آبادی تھے اور ان کا موضوع ہی قادیانیت تھا، لیکن ان کا پیمانۂ عمر بھی لبریز ہوگیا۔ مولانا سید ابوالحسنات بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ بعض دوسرے راہنما عملی سیاست میں کھو گئے۔ جن علماء نے اس مسئلہ کو اپنے خطبات میں مقامی طور پر زندہ رکھا وہ ختم نبوت کے مطالب پر وعظ کرتے یا قلم اٹھاتے

انہیں اس امر کا اندازہ ہی نہ تھا کہ مرزائی ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے پرورش پا رہے اور پروان چڑھ رہے ہیں۔ اس موضوع پر آئندہ صفحات میں گفتگو ہو گی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کی تحریک کا کہ اس کا مآل و ماحصل کیا تھا اور اس پر کیا بیتی؟

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی گرفتاری سے پہلے "قادیانی مسئلہ" کے نام سے ایک پمفلٹ میں پوری کہانی بیان کی۔ یہی پمفلٹ ان کی گرفتاری اور سزائے موت کا باعث ہوا۔ اپنے مقدمہ میں مولانا نے تین جامع بیان داخل کیے۔ ان بیانوں کے بعد منیر انکوائری رپورٹ چھپ کر سامنے آئی تو اس پر جماعت نے ایک مبسوط تبصرہ کیا اور ان خامیوں کی نشاندہی کی جو اس رپورٹ میں واضح طور پر موجود تھیں۔ اس کی روداد ایک علیحدہ باب میں درج ہے۔

سب سے بڑی بات جو اس تحریک میں پسپائی کے بعد پیدا ہوئی وہ مجلس ختم نبوت کا قیام تھا۔ اس کا صدر دفتر ملتان میں قائم کیا گیا۔ شاہ جی اس مجلس کے پہلے صدر منتخب کیے گئے۔ مولانا محمد علی جالندھری ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ مولانا قاضی احسان احمد مجلس کے مرکزی سفیر تھے۔ ان کے علاوہ درجنوں کے لگ بھگ سفیر مقرر کیے گئے جو وقتاً فوقتاً مختلف صوبوں اور ضلعوں کے دورے کرتے رہتے۔ ادھر تحریک کی اندوہناک پسپائی سے لوگوں میں مایوسی کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ کئی لوگ ان شہداء کے متعلق جو اس تحریک ناموس ختم نبوت پر قربان ہو چکے تھے یہ سوال کرتے کہ ان کے خون کا ذمہ دار کون ہے؟ شاہ جی نے لاہور کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے جواب دیا کہ:

"جو لوگ تحریک ختم نبوت میں جان نثار شہید ہوئے ان کے خون کا جوابدہ میں ہوں۔ وہ عشق رسالت میں مارے گئے۔ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ان میں جذبۂ شہادت میں نے پھونکا تھا۔ جو لوگ ان کے خون سے دامن بچانا چاہتے اور ہمارے ساتھ رہ کر اب کنی کترا رہے ہیں، ان سے کہتا ہوں کہ میں حشر کے دن بھی ان کے خون کا ذمہ دار ہوں گا۔ وہ عشق نبوت میں اسلامی سلطنت کے باغی خانوں کی بھینٹ ہو گئے، لیکن ختم نبوت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی سات ہزار حافظ قرآن اس مسئلہ کی خاطر شہید کرا دیئے تھے۔"

شاہ جی تحریک کی پسپائی سے نہایت رنجیدہ و ملول تھے۔ ان کا دل بجھ چکا تھا۔ فرماتے غلام احمد کی نبوت کے لیے تحفظ ہے، لیکن محمد کی ختم نبوت کیلئے تحفظ نہیں۔ عموماً اشکبار ہو جاتے۔ اس زمانہ میں ایک دن تقریر کرنے کے لیے اٹھے تو عمر بھر کی روایت کے برعکس نہ خطبہ مسنونہ پڑھا، نہ زیر لب درود کیا، فرمایا:

"مسٹر پریذیڈنٹ، لیڈیز اینڈ جنٹلمین!" لوگوں نے قہقہہ لگایا اور ششدر رہ گئے۔

"شاہ جی یہ کیا؟"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ اُردن کی تماشہ گاہ میں

خواجہ ناظم الدین کی حکومت نے تحریک راست اقدام ۱۹۵۳ء کو جس بے رحمی سے کچلا اس کی بہیمانہ روداد اجمالی طور پر پچھلے باب میں آچکی ہے، چونکہ ملک کے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین تھے اس لیے ان کے زمانۂ اقتدار میں فدایانِ ختم نبوت سے جو سلوک کیا گیا اور راست اقدام کی تحریک کو جس وحشیانہ انداز میں کچلا گیا اس کی نشاندہی کے لیے خواجہ صاحب کے عہد وزارت کا تعین لازم ہے۔ ورنہ خواجہ صاحب شاید اس قدر مجرم نہ تھے جن لوگوں نے اس تحریک کو حکومت کے بل پر تہس نہس کیا اور مارشل لاء کے مورچوں میں بیٹھ کر شیدایانِ خاتم النبیینؐ پر گولیاں چلوائیں ان میں کچھ تو وزارت کے لادین ارکان تھے، چوہدری ظفر اللہ خاں کے آقایانِ ولی نعمت کا دباؤ تھا اور خواجہ صاحب ہی کی روایت کے مطابق امریکی حکومت نے اپنا حمایتی وزن قادیانی امت کے پلڑے میں ڈال رکھا تھا۔ خواجہ صاحب نے منیر انکوائری کمیٹی کے سامنے اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ ظفر اللہ خاں وزارت سے الگ کیے جاتے تو پاکستان امریکی گندم کی امداد سے محروم ہو جاتا جس کی ان دنوں قلت کے باعث پاکستان کو سخت ضرورت تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب قادیانی امت نے امریکہ کی صیہونی خواہشوں سے گٹھ جوڑ کیا اور عرب ملکوں میں اسرائیل کی خاطر جاسوسی کے فرائض انجام دینے کا معاہدہ کیا۔ خواجہ صاحب نے امریکی گندم کے متعلق جو کچھ کہا وہ غلط نہ تھا۔ اس وقت امریکہ کی وزارت خارجہ اور غیر ممالک کی امداد کا شعبہ یہودیوں کے ہاتھ میں تھا اور وہ امریکہ کی

پُراسرار خدمات بجالانے کے لیے قادیانی امت کو تلاش کر چکے تھے۔ ادھر اتفاق سے پاکستان کی سیاسی زندگی میں بیوروکریسی کا اقتدار قائم ہو چکا تھا اور بعض نمایاں عہدوں پر اس قماش کے اشخاص فائز تھے جن کا خمیر برطانوی استعمار کی مٹی میں گوندھا گیا تھا۔ مثلاً ملک کے ڈیفنس سیکرٹری میجر جنرل اسکندر مرزا بنگال کے روایتی غدار میر جعفر کی اولاد تھے۔ جب تک انگریز رہے ان کی سیاسی خدمات بجا لانے میں اپنا جوڑ نہیں رکھتے تھے۔

خواجہ صاحب کے زمانۂ وزارت تک مرکزی افسروں میں تھے، لیکن ملک کے عوام بالکل نہ جانتے تھے کہ حکومت کے دوائر میں وہ کوئی سیاسی طاقت رکھتے ہیں۔ ملک غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برخاست کیا تو اس کے ساتھ ہی اسکندر مرزا مطلعِ سیاست پر نمودار ہو گئے۔ انہیں پہلے مشرقی پاکستان میں گورنر بنایا گیا۔ پھر مرکزی حکومت میں وزیر داخلہ ہو گئے۔ اس کے بعد ملک غلام محمد کی مجنونانہ علالت سے فائدہ اٹھا کر گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ جب چودھری محمد علی نے پاکستان کا آئین تیار کیا تو ملک کے صدر بن گئے۔ پھر کئی ایک وزارتوں سے کھیلتے رہے۔ آخر مارشل لاء نافذ کیا، لیکن اسی کے ہاتھوں مارے گئے اور ملک سے جلا وطن ہو کر انگلستان چلے گئے وہاں لندن کے ایک ہوٹل میں کچھ عرصہ ملازمت کی۔ آخر کار موت کا بلاوا آ گیا اور مر کے ایران میں دفن ہوئے۔

اسکندر مرزا مستقل طور پر لادین تھے! انہیں علمائے دین سے سخت نفرت تھی اور ہر ایسے ادارے کو فنا کر دینے کے حق میں تھے جس کی اساس یا مزاج میں مذہب ہو۔ انہیں اس امر کا سخت افسوس تھا کہ تحریک ختم نبوت میں مارشل لاء کو وسیع نہیں کیا گیا اور مُلاؤں کو تختۂ دار پر کھینچا گیا۔ یہ بات راقم نے ان کے ہونٹوں سے خود سنی وہ میاں مشتاق احمد گورمانی وزیر داخلہ کے بنگلہ پر تشریف لاتے۔ تعارف ہوا تو جہاں انہوں نے کئی اور غلیظ باتیں کیں وہاں یہ گلہ بھی کیا کہ وزارت نے ان کی بات نہیں مانی۔ اگر پاکستان کے مُلاؤں کو اس تحریک کی فضا میں پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تو ملک ہمیشہ کے لیے ان سے پاک ہو جاتا۔ اسکندر مرزا کے علاوہ ملک غلام محمد بھی علماء سے عداوت میں پیش پیش تھے۔ کچھ اور چہرے بھی تھے جن کا معاملہ اب اللہ کے سپرد ہے۔ ان تمام چہروں کا ذکر کرتے ہوئے سردار عبدالرب نشتر نے راقم سے کہا تھا کہ جن لوگوں نے تحریک ختم نبوت میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی اور ختم نبوت کے مسئلہ کو اپنے اقتدار کی مسند پر قربان کیا میں جانتا ہوں کہ ان کے شب و روز کی ویرانی کا عالم کیا ہے اور ان دماغ و دل پر کیا بیت رہی ہے۔ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

تحریک راست اقدام کا عظیم المیہ یہ تھا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو مارشل لاء کے تحت خود ساختہ جرم میں موت کی سزا دی گئی۔ دلچسپ امر یہ تھا کہ ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء کو مجلس عمل کے متعدد رہنما کراچی میں گرفتار کیے گئے

انہیں سندھ کی مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔ ادھر حکومت نے عوام کے جوش ایمان سے بدحواس ہو کر لاہور میں ۶ مارچ
کو مارشل لاء نافذ کر دیا جس کے بائیس روز بعد ۲۸ مارچ کو مرکزی حکومت کے لادین عناصر نے گٹھ جوڑ کر کے
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو فوج کی معرفت مارشل لاء کے تحت گرفتار کر لیا اور لاہور کے شاہی قلعہ میں رکھا۔ وہاں
مولانا سے تحریک ختم نبوت کی داستان پوچھی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ پانچ چھ روز روزانہ اوسطاً تین گھنٹے صرف ہوتے
اس کے بعد ۴۵ روز تک میں قلعہ میں رہا جب ایک مقدمہ تصنیف کر لیا گیا تو مجھے لاہور سنٹرل جیل بھیج دیا۔ ملک
غلام محمد گورنر جنرل پاکستان ۳ مئی کو لاہور آئے۔ ان کے ساتھ اسکندر مرزا بھی تھا۔ یہاں انہوں نے اس وقت کے بعض
اعلیٰ فوجی افسروں سے بات چیت کی۔ پھر ۵ مئی کو واپس چلے گئے اور ۵ مئی کو اس امر کا آرڈیننس جاری کیا کہ مارشل لاء
کی عدالتیں مارشل لاء کے نفاذ سے قبل سرزد ہونے والے جرائم کی بھی سماعت کر سکتی ہیں۔ اور ان عدالتوں کے فیصلوں
کے خلاف ملک کی کسی عدالت میں کوئی اپیل نہیں ہو سکتی۔ مولانا کا مقدمہ چار پانچ دن چلایا ۸ مئی کو ختم ہو گیا اور
۱۱ مئی کی رات کو اندھے ضابطے کے تحت انہیں سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔ اس فیصلے سے تمام دنیائے اسلام میں رنج و
غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ پاکستان میں ہر چہرہ غمزدہ ہو گیا اور حکومت کو تین دن میں پتہ چل گیا کہ اس فیصلے کے نتائج
کیا ہوں گے۔ اور موت ان ارباب حکومت کے پیچھے بھی ہے جن کی ذہنی بیماری اس سزا کا باعث ہوئی ہے۔ چنانچہ
۱۴ مئی کو موت کی سزا عمر قید میں بدل دی گئی۔

مولانا کے خلاف مارشل لاء کے ضابطہ نمبر ۸ اور تعزیرات کی دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ یہ جرم یہ تھا
کہ انہوں نے قادیانی مسئلہ نامی پمفلٹ لکھا جو مارشل لاء سے ایک دو روز پہلے چھپ چکا تھا اور مارشل لاء کے پورے
زمانہ میں شائع ہوتا رہا اور کبھی ایک دن کے لیے بھی اس پر کوئی پابندی عائد نہ کی گئی اس پمفلٹ کا مضمون یہ تھا کہ اصل
مسئلہ کیا ہے؟ اس بارے میں کوئی کیا غلط فہمی نہ رہے اور لوگ کس طریقے کے مسئلہ پر ہنگامے کا شکار نہ ہوں۔ اس
اس پمفلٹ میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو حکومت کی پریشانی کے لیے کسی تشویش کا باعث ہوئی۔ لیکن حکومت ایک ارادہ کر چکی تھی
اس کی تکمیل کے لیے اس نے پمفلٹ کی آڑ لی اور مولانا کو سزائے موت سنا دی۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی کے روزنامہ
"تسنیم" کو ماخوذ کیا اور اس کے ایڈیٹر کو اس جرم میں تین سال قید بامشقت کی سزا دی۔ تماشہ یہ تھا کہ مولانا مودودی کا
کے جن بیانوں کو حکومت نے بغاوت پھیلانے کے مترادف قرار دیا وہ "تسنیم" کے علاوہ لاہور و کراچی کے دوسرے
اخبارات میں بھی شائع ہو چکے تھے۔ پھر جس پمفلٹ کی اشاعت پر مولانا مودودی کو سزائے موت کا مستوجب گردانا گیا
اس کے متعلق نہ مارشل لاء کی پوری مدت میں فوجی حکام نے کوئی پابندی لگائی اور نہ مرکزی یا کسی صوبائی حکومت نے

قابلِ تعزیر سمجھا - آج تک وہ پمفلٹ مسلسل فروخت ہو رہا ہے اور مئی ۱۹۷۳ء تک اردو، انگریزی، سندھی، گجراتی اور بنگلہ میں ڈیڑھ لاکھ سے زائد شائع ہو کر لاکھوں افراد کی نظر سے گزر چکا تھا۔

مولانا کا جرم دراصل یہ تھا کہ ۱۹۵۳ء تک وہ اسلامی دستور کی تحریک کو عامۃ المسلمین کے رگ و ریشے میں اتار چکے تھے اور سیکولر ذہن مقتدرین کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھا۔ انہوں نے "قادیانی مسئلہ" کے جرم میں مولانا کو سزائے موت سنا کر اس خطرے کا تدارک کرنا چاہا، لیکن سزائے موت دینے کا حوصلہ نہ کر سکے کہ انہیں اپنی موت بھی نظر آ رہی تھی، البتہ اس مارشل لاء کے بعد ملک سے جمہوری روح ختم ہو گئی۔ مارشل لاء نے اس طرح بال و پر پیدا کئے کہ ملک کا مقدر ہی مارشل لاء ہو گیا۔ اگر اس وقت کے سیاسی حکمران مارشل لاء کی مشق نہ کرتے تو ملک اس حال کو نہ پہنچتا جس حال کو بعد میں پہنچا۔ اور نہ جمہوری سیاست ہی اس طرح پامال ہوتی۔ اس مارشل لاء نے دو بڑی خرابیاں پیدا کیں۔ ایک خرابی یہ کہ فوج کے جرنیلوں کو حصولِ اقتدار کا چسکا لگ گیا۔ دوسری خرابی یہ کہ سیاستدان پٹ گئے۔ ملک غلام محمد اور اسکندر مرزا تو جلد ہی نا مقبول ہو گئے، لیکن ایوب خان اور یحییٰ خان نے ملک کو جو تحفے دیئے وہ اس کے جمہوری وجود اور قومی سالمیت کے لیے سوہان ہو گئے۔ ملک دو لخت ہو گیا۔ جمہوریت میں دم ہی نہ رہا۔ مولانا ملک میں اسلامی دستور کی تحریک کے بانی تھے اور اس سلسلہ میں خان لیاقت علی خاں کے زمانہ ہی میں ایک ذہنی فضا پیدا کر چکے تھے۔ اسی فضا ہی کا نتیجہ آئین کے سرآغاز میں قرارداد مقاصد کا چہرہ نما تھا۔ ان کی مساعی مشکورہ کی بدولت اور جنوری ۱۹۵۳ء تک یعنی راست اقدام کی تحریک سے ڈیڑھ ماہ پہلے ملک کے ۳۱ سربرآوردہ علماء نے کراچی میں جمع ہو کر دستوری سفارشات میں کئی ایک ترامیم منظور کرائی تھیں۔ انہی میں ایک ترمیم یہ تھی کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے۔ مولانا کا خیال تھا کہ آئین کی بنیادیں طے ہو جاتیں تو انہی سفارشات کی روشنی میں یہ مسئلہ خود بخود طے ہو جاتا اور اگر اس سے الگ راست اقدام کی تحریک چھیڑ دی گئی تو نہ صرف صورتحال ہی مختلف ہو جائے گی بلکہ ان سفارشات کے تمام کئے کرائے تاراج ہو جانے کا احتمال ہے۔ اس صورت میں حکومت مسئلہ بھی حل نہ کرے گی بلکہ آئین کو اسلامی بنانے کی تحریک بھی سبوتاژ ہو جائے گی۔ جو اس وقت تمام حلقہ ہائے خیال کے برگزیدہ علماء کی متحدہ کوششوں سے آخر ہو چکی ہے۔ لیکن مجلس عمل کے دوسرے زعماء فوری طور پر راست اقدام کے حق میں تھے۔

حکومت کے مرکزی بزرجمہروں نے ۲۸ فروری کی شب کو انہیں پکڑ لیا۔ ان کی گرفتاری سے مسلمانوں میں احتجاج کا ایک طوفان اٹھا۔ اس کے بعد لادین مقتدرین نے جس جس انداز میں گل کھلائے وہ ڈھکے چھپے نہیں۔ پنجاب کو خون میں نہلایا گیا اور ان تمام فدایانِ رسالت کی ذہنی یا جسمانی اذیت بے دین وزراء و حکام کا لازمہ ہو گئی جو ختم نبوت

کے مسئلہ میں متفقہ آواز رکھتے تھے۔ مولانا مودودی کا منشا صرف یہ تھا کہ وہ اس مسئلہ میں اپنے قلم سے مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر کی راہنمائی کر رہے تھے اور قادیانی مسئلہ پمفلٹ لکھ کر انہوں نے مسئلہ کی حقیقی روح کو پیش کیا تھا۔ ان کا اصل جرم دستور کو اسلامی بنانے کی تحریک کا نشوونما و استحکام تھا۔ مسٹر چندریگر گورنر پنجاب نے تحریک ختم نبوت کی بے پناہی سے گھبرا کر ۴ مارچ کو مقامی زعماء کا ایک اجلاس طلب کیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ بھی مدعو کئے گئے اور وہ شریک ہوئے۔ مولانا نے اس اجلاس میں گورنر سے کہا کہ اس وقت دو ہی راستے ہیں۔ ایک راستہ یہ ہے کہ پبلک کو مطمئن کر کے امن قائم کیا جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آج ہی وزیر اعظم پاکستان کی طرف سے اعلان کیا جائے کہ حکومت پبلک کے مطالبات پر گفت و شنید کرنے کے لیے تیار ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ حکومت اپنی طاقت کو استعمال میں لا کر تحریک کو کچل ڈالے ظاہر ہے کہ یہ راستہ طاقت کے مزید کا راستہ ہوگا اور اس سے مسئلہ کا حل نہ ہوگا اور نہ اس سے خوفناک نتائج پیدا ہوں گے۔ اگر حکومت پبلک کو مطمئن کرنا چاہتی ہے تو وہ پہلا راستہ اختیار کرے۔ گورنر نے مولانا سے اتفاق کیا۔ اور گزارش کی کہ وہ باقاعدہ تجویز مرتب کر دیں۔ مولانا نے اسی وقت تحریر لکھ دی۔ پھر گورنر نے اس مسودہ کی تیاری کے لیے کہا جو وزیر اعظم کی طرف سے اعلان کی شکل میں جاری کرنا مقصود تھا۔ مولانا نے وہ بھی تحریر کر دیا۔ گورنر کے علاوہ خلیفہ شجاع الدین اسپیکر پنجاب اسمبلی اور علاؤ الدین صدیقی نے تھوڑی سی ترمیم و اصلاح کے بعد اس پر صاد کیا۔ اس اعلان میں عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ راست اقدام کی تحریک بند کر دیں اور پر امن رویہ اختیار کریں حکومت جلد سے جلد عوام کے معتمد علیہ نمائندے بلا کر اس مسئلہ پر ان سے گفتگو کرے گی اور اس گفتگو کا جو بھی نتیجہ ہوگا وہ حکومت اور عوام کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کے ساتھ شائع کیا جائیگا۔ گورنر نے مولانا سے وعدہ کیا کہ یہ اعلان ۴ اور ۵ مارچ کی درمیانی شب کو نشر کر دیا جائے گا لیکن نشر ہوا اس مضمون سے مختلف ہوا اور ایسی کوئی بھی بات نہ کی گئی جس کا مقصد پبلک مطالبات پر گفتگو کرنا تھا۔ اس سے اگلی صبح ۶ مارچ کو لاہور میں مارشل لاء کا آغاز ہوگیا۔

مولانا ۲۸، ۲۹ مارچ کی شب کو گرفتار کئے گئے جن کی جزوی روداد اوپر آ چکی ہے۔ مولانا نے موت کی سزا سن کر بے نظیر استقامت دکھائی۔ حکومت اس سے لرز گئی۔ آپ نے پہلے ہی دن پھانسی کی کوٹھڑی میں اپنے متعلقین سے کہا کہ میرے لیے کسی عنوان سے کوئی اپیل نہ کرنا اور نہ حکومت سے کوئی استدعا کرنے کی ضرورت ہے جب مجھے پھانسی دیدی جائے تو مجھے انہی کپڑوں میں دفنا دینا اور اپنی زندگی اسی عشق و مقصد کے تحت بسر کرنا جس کے لیے ہم سب کوشاں ہیں اور جو اسلام کو اقتدار میں لانے کا قرآنی نصب العین ہے بزدلانہ حکومت کو اندازہ ہی

رہا تھا کہ جو لوگ اسلام کے لیے جیتے اور اسلام کے لیے مرتے ہیں ان کی سیرت اس طرز کے سانچے میں ڈھلی ہوتی ہے اور وہ انہیں کوئی سی دنیاوی آلائش یا ابتلا زیر نہیں کر سکتے۔ یہ ذکر آ چکا ہے کہ حکومت نے تین چار روز ہی میں موت کی سزا منسوخ کر دی۔ پھر دو سال کے بعد پنجاب ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کی بنا پر مولانا ۱۹۵۵ء میں رہا ہو گئے۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ جسٹس منیر نے مولوی تمیز الدین خاں کے مقدمے میں گورنر جنرل کو وسیع اختیارات کا حامل قرار دے کر یہ فیصلہ کیا کہ مرکزی اسمبلی کے پاس کیے ہوئے وہ تمام قوانین غیر آئینی ہیں جو اس نے دستور ساز مجلس کی حیثیت سے وضع کیے اور جن پر گورنر جنرل کے دستخط نہیں ہوئے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ بہت سے قوانین کے ساتھ وہ انڈیمنٹی ایکٹ بھی غیر آئینی قرار پا گیا۔ جس کے تحت مارشل لاء کی سزائیں بحال رکھی گئی تھیں۔ اس بنا پر پنجاب ہائی کورٹ نے مولانا کی سزا ختم کر دی۔ مولانا کی سزائے موت سے ختم نبوت کا مسئلہ نہ صرف عرب ریاستوں میں ایک عالمگیر اسلامی دینی کی شکل اختیار کر گیا بلکہ یورپ کے کئی ایک ملکوں کی علمی اور سیاسی فضا تک جا پہنچا۔ یعنی ان ملکوں میں مستشرقین کی حد تک یہ بات نمایاں ہو گئی کہ پاکستان میں قادیانی مسئلہ کیا اہمیت رکھتا ہے اور مسلمان اس جماعت کے بارے میں کیا سوچتے اور کیا چاہتے ہیں؟ اگرچہ منیر انکوائری کمیشن اپنی طبعی افتاد کے باعث ایک غلط نام کا روگ تھا، لیکن جماعت اسلامی نے اپنے اندازِ فکر کے مطابق جسٹس منیر کی اڑان گھاتیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ پھر جب منیر رپورٹ چھپ کر سامنے آئی تو اس کا اسلامی پوسٹ مارٹم کیا کہ وہ رپورٹ دینی اور علمی حلقوں میں ایک مضحک کتاب ہو کر رہ گئی۔ اس کتاب کا بنیادی نقص یہ تھا کہ جسٹس منیر نے پاکستان کے بنیادی صوبہ پنجاب کا چیف جسٹس ہونے کی حیثیت میں اپنے قلم کی ایک جنبش سے ایک ایسی داستان مرتب کر دی تھی جس کو خلاف اسلام طاقتوں مثلاً امریکہ و یورپ کے عیسائیوں اور یہودی ریاست اسرائیل کے دانشوروں اور حاکموں اور ہندوستان کے کمیونسٹوں اور عیسائیوں نے خوب خوب استعمال کیا۔ قادیانی مغربی ممالک کے علاوہ افریقی ریاستوں میں اس کا چرچا کرتے رہے اور اس رپورٹ میں مسلمان کی تعریف کے تحت اسلام کا مذاق اڑایا گیا اور علماء کے استخفاف کی آڑ میں قادیانیت کا جواز قائم کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جسٹس منیر کسی اعتبار سے کبھی راسخ العقیدہ مسلمان نہیں رہے۔ وہ سپریم کورٹ کی چیف جسٹسی تک پہنچ گئے لیکن انہوں نے پاکستان میں جمہوریت اور اسلامیت کو سخت نقصان پہنچایا اور یہ ان کا ناقابل معافی جرم تھا۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے تبصرے کے زیر عنوان رپورٹ کا تجزیہ کر کے اس کے مندرجات کا رد کیا اور بیرونی ممالک کے جن حلقوں میں اس کی منفی تعبیریں پھیل گئی تھیں وہاں ان مغالطوں کو ہمیشہ کے لیے زائل کر دیا۔

پہلے سال تبصرہ اردو میں نکلا۔ پھر چند ماہ کے وقفے سے عربی میں اس کی تلخیصات مرتب کی گئیں اور اس طرح

ایک کتابچہ مدون ہو گیا۔ اگلے سال تبصرہ کا انگریزی ترجمہ تیار ہو کر امریکہ، افریقہ اور یورپ کے ملکوں میں تقسیم کیا گیا۔ تمام نامور مستشرقین اور بعض خاص اساتذہ کے علاوہ انگریزی ترجمے کی بے شمار کاپیاں یورپ و امریکہ جرائد و رسائل کو پہنچائی گئیں۔ اس کے علاوہ مغربی ملکوں کی تمام یونیورسٹیوں اور لائبریریوں میں اس کے نسخے ارسال کئے گئے۔ اس کا بنیادی فائدہ یہ ہوا کہ امریکہ، یورپ اور افریقہ میں کسی نامسلمان مصنف و مفکر نے پھر کبھی اس کا حوالہ نہ دیا۔ گویا اس اعتبار سے رپورٹ ساقط الاعتبار ہو گئی۔ جہاں تک مسلمان ممالک کا تعلق تھا وہ اس رپورٹ ہی سے ناواقف تھے اور نہ اسے کسی عنوان سے کوئی سی اہمیت دی گئی۔ پاکستان میں اس رپورٹ کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا گیا۔ اس کے رد میں مولانا نے سب سے پہلے قلم اٹھایا۔ ان کے بعد مختلف اہل قلم نے اس پر طبع آزمائی کی اور رپورٹ کو ملک بھر میں اچھوت بنا دیا۔ ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ پنجاب کے جلسہ ہائے عام میں کئی جگہ نوجوانوں نے رپورٹ کو نذر آتش کیا اور لاکھوں عوام نے تالیاں پیٹ پیٹ کر تحسین کی۔

پاکستان میں اس زمانے کے سیاسی حالات تھے کہ پرانی نسلوں کے تعلیم یافتہ جو بوجوہ اس مسئلہ ہی سے ناواقف تھے۔ یا واقف نہیں ہونا چاہتے تھے یا پھر دین کے مقتضیات کو سیاست کی ضروریات کے تحت دیکھتے تھے اور جو نسلیں تحریک پاکستان میں جوان ہوئی تھیں یعنی جن کی آنکھیں ترکی سیاست کے ہنگاموں میں کھلی تھیں، ان کے ذہنوں میں یہ مسئلہ اترا نہیں رہا تھا مولانا نے "قادیانی مسئلہ" میں تعلیم یافتہ طبقات کو اس سے آگاہ کیا تو خاص قسم کے عبقری و نابغہ بھی مسئلہ کے اور چھور سے واقف ہو گئے۔ اس کتابچہ کا بنگلہ اور انگریزی میں فی الفور ترجمہ کیا گیا جس سے پورے ملک کو مسئلہ کے تمام پہلو معلوم ہو گئے اور حکومت کا چلو دار پروپیگنڈہ باطل ہو کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ منیر انکوائری رپورٹ بالاخانہ کے تہقہوں سے زیادہ اہمیت حاصل نہ کر سکی۔ مولانا نے اس مسئلہ کو علماء کی طرح محض مذہبی حیثیت ہی سے پیش نہ کیا بلکہ قادیانیت کے عمرانی، سیاسی اور معاشی پہلو بیان کئے جس سے دینی اور سیاسی دائرہ کا ہر گوشہ چوکنا ہو گیا۔ جو لوگ اب تک مسئلہ کو ملائیت کی شعبدہ بازی گردانتے تھے۔ ان کی اکثریت چند بیمار ذہنوں کے سوا اس حقیقت سے آگاہ ہو گئی کہ قادیانی پاکستان کے لیے ایک مہیب مسئلہ ہیں اور ان سے ملت اسلامیہ کی وحدت مجروح و مضطرب ہوتی ہے۔ اب تک علماء قادیانیت کے جواب میں مذہبی نوعیت کے مباحث اٹھاتے تھے اور ان کا تمام تر لٹریچر اس طرز پر تھا کہ خاتم کے معنی کیا ہیں؟ حیات و ممات مسیح کا مبحث کیا ہے وغیرہ، خود قادیانی علماء کو حیات و ممات مسیح میں الجھاتے رہے کہ وہ اصل مسئلہ کی طرف نہ آ سکیں۔ یا پھر خاتم النبیین کے معانی میں لسانی اشغلے چھوڑتے رہے اس میں قادیانی امت کا یہ فائدہ تھا کہ وہ مغربی تعلیم کی پیداوار نسلوں اور ملک کے سیاسی فرزندوں

کو سنوالطہ دے سکتے تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں مذہب کے خلاف، مذہب کی معرفت کچھ اس قسم کے شگوفے چھوڑ رکھے یا تھم لگائے تھے کہ تکفیر کا مسئلہ مخصوص دینی فضا سے باہر خواص میں بالخصوص اور عوام میں بالعموم کوئی وزن نہ رکھتا تھا۔ غرض مذہبی فضا کے اس انتشار سے قادیانی اپنے تئیں مسلمانوں میں ظاہری طور پر ملت کا جزو بنکر رہ رہے تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اس کتابچہ نے میرزائیت کی ان بنیادوں کو ہلا ڈالا اور جو لوگ لادینی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے انھوں نے محسوس کیا بلکہ انہیں یقین ہو گیا کہ میرزائیت نظر انداز کرنے کی چیز نہیں۔ اس زمانہ میں مولانا کا متذکرہ پمفلٹ تقریباً ہر فوجی افسر نے مطالعہ کیا کیونکہ حکومت نے مولانا کو سزا دیکر اس خواہش کو پیدا کر دیا تھا کہ آخر یہ مسئلہ کیا ہے؟ علامہ اقبال نے اس مسئلہ پر ایک مفکر کی حیثیت سے قلم اٹھایا اور عالمانہ سطح سے فلسفہ کی زبان میں گفتگو کی تھی علامہ کی موت کے بعد ان کے سجادہ نشینوں اور ان کی تعلیمات پر قلم اٹھانے والوں نے علامہ کی ان تحریروں سے اعتنا ہی نہ کیا، بلکہ خلیفہ عبدالحکیم جیسے بزرگوں نے حکومت کی منشا کے مطابق "اقبال اور ملا" لکھ کر ہرزہ سرائی کی۔ جو لوگ ان تحریروں کی اشاعت کے وقت عالم طفلی میں تھے اور نہ اس مسئلہ کا شعور رکھتے تھے ان کے لیے علامہ اقبال کی مذکورہ تحریریں بے وجود تھیں اور وہ نہیں جانتے تھے کہ مصور پاکستان نے قادیانیت کے بارے میں کیا کہا ہے؟ اور اس مسئلہ میں علامہ کیا چاہتے تھے۔ ادھر علمائے کرام قادیانیت کے جواب میں جو زبان استعمال کرتے تھے وہ عوام کی زبان نہ تھی، ان کی تعلیمات و اصطلاحات عوام کے دماغ سے کہیں بلند تھیں۔ مولانا نے قادیانی پمفلٹ میں سلیس شگفتہ اور سہل و شستہ زبان استعمال کر کے نہ صرف وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا بلکہ ان دماغوں میں یہ مسئلہ اتار دیا جن دماغوں کے دروازے اس مسئلہ کی طرف سے بند تھے۔ بلاشبہ علماء نے اس سلسلہ میں حیرت انگیز کام کیا اور منبر و محراب نے میرزائیت کو عوام کے اذہان میں ثمر آور نہ ہونے دیا لیکن پاکستان میں اس مسئلہ کی پہچان کے لیے مولانا کے قلم نے ایک ایسی خدمت انجام دی کہ قادیانیت کی حیثیت محلاتی سازشوں کے استعاری گماشتے کی رہ گئی، لیکن ملک کی سیاسی دگرانی فضا میں پھیلا گئی۔

حکومت کے جبر و تشدد سے تحریک راست اقدام کا مظاہرۂ احتجاج فوراً ختم ہو گیا۔ ادھر بعض افسروں کی کمزوریوں اور کچھ علماء کی تدبیروں سے اس کا یہ رخ بھی ٹوٹ گیا اور من حیث الجماعت وہی آثار پیدا ہو گئے جو حکومتوں سے ٹکراؤ میں عوامی تحریکوں کے ضعف و اختلال کا باعث ہوتے ہیں، لیکن ایک چیز بہر حال قائم رہی کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاشرہ میں میرزائیت کے لیے کسی موڑ یا مرحلہ پر کوئی سی جگہ پیدا نہ ہو سکی۔ ایک طرف احرار کے رہنماؤں نے

مجلس تحفظ ختم نبوت قائم کر کے اپنے محاذ کو سرگرم کر دیا، دوسری طرف مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے عالم اسلامی میں مرزائیت کے اعمال و افکار کو ننگا کر دیا۔ ادھر پاکستان میں جمہوریت کی ویرانی کا آغاز ہو چکا اور ملک غلام محمد نے جسٹس منیر کی عدالتی تصدیق سے آئینی روایات کو ذبح کر دیا تھا۔ ادھر حکومت بیوروکریسی کی معرفت استعماری طاقتوں کی دست پناہ ہو رہی تھی اور ان طاقتوں کی پاکستان میں اگر کوئی جماعت کا نام قادیانی امت تھا۔ قادیانی امت نے ملک غلام محمد کے زمانہ ہی سے فوج میں اپنی طاقت پیدا کرنے کا ارادہ کیا۔ اسکندر مرزا کے عہد میں اس ارادے کو بال و پر لگے۔ ایوب خاں کے زمانے میں قادیانیت نے عسکری طاقت کے علاوہ سیاسی رسوخ پیدا کیا۔ مرزا غلام احمد کے پوتے اور بشیر الدین محمود کے چہیتے مسٹر ایم۔ ایم احمد نے اولاً سیکرٹری مالیات کا عہدہ سنبھال کر "ثانیاً" اقتصادی منصوبہ بندی کا اختیار پا کر مرزائیت کے لیے معاشی استحکام کی راہیں پیدا کیں۔ ایوب خاں کے عہد میں خلافت ربوہ نے ملک کی فوجی اور اقتصادی زندگی پر اس طریق سے قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا کہ بالواسطہ سیاسی زندگی انہی کی زندگی ہو۔ اس سے پہلے جب ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ ہوئی اور مصر نے ہزیمت اٹھائی تو اس سے عرب ریاستوں کے عسکری وقار کو سخت دھکا لگا۔ ان کی پسپائی کو تمام دنیائے اسلام میں ایک جانگداز المیہ کی طرح محسوس کیا گیا۔ اس جنگ کے فوراً بعد ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں عرب ریاستوں نے پاکستان سے فنی ماہرین طلب کیے۔ پاکستان سے ایک زبردست کھیپ مختلف شعبوں کے بڑے بڑے عہدوں پر روانہ کی گئی۔ اس کھیپ میں زیادہ تر فوجی ماہرین تھے، لیکن جو لوگ یہاں سے گئے ان میں زیادہ تر قادیانی امت کے افراد تھے، انہوں نے سعودی عرب کو ترجیح دی اور وہاں زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہو گئے۔ سب سے خطرناک پہلو یہ تھا کہ سعودی عرب میں قادیانی العقیدہ فوجی افسروں نے اہم جگہیں حاصل کیں۔ اسرائیل کے جارحانہ منصوبوں میں مدینہ منورہ کو فتح کرنے کا پلان بھی شامل رہا ہے۔ اس پلان کو پروان چڑھانے کے لیے قادیانی افسر آلۂ کار ہو سکتے تھے۔ سعودی عرب کے حکمران انتہائی پریشان تھے کہ ان کی فوجی خبریں اسرائیل تک پہنچ کیونکر جاتی ہیں۔ معاملہ بالکل واضح تھا، لیکن سعودی حکومت کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہو رہا تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سعودی حکومت کو اس طرف توجہ دلائی تو ان پر اصل راز کھلا اور حجاز و نجد سے قادیانی امت کا اخراج شروع ہو گیا۔ جن حکومتی شعبوں میں قادیانی گھس آئے تھے، انہیں وہاں سے نکال کر پاکستان رخصت کر دیا گیا۔ بعض اہم محکموں میں قادیانی چھپ چھپا کر رہنا چاہتے تھے، لیکن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی حسب ہدایت واقفانِ حال نے ان سب کے عہدوں کا پتہ لگا کر سعودی حکومت کو مطلع کیا تو انہیں سبکدوش کر کے پاکستان لوٹا دیا گیا اور اس طرح حرمین شریفین قادیانیوں کے اسرائیلی منصوبہ سے محفوظ ہو گئے۔ انہیں دنوں سعودی گورنمنٹ نے مولانا محمد خواست

کی گروہ قادیانیت پر ایک کتاب لکھیں جس سے عرب دنیا کو معلوم ہو کہ قادیانیت کیا ہے اور اس کا وجود کن عناصر کا مرکب ہے؟ مولانا نے "ماھی القادیانیۃ" لکھی جو کویت میں چھپی اور تمام عرب ریاستوں میں بڑے پیمانے پر پھیلا دی گئی۔ مولانا نے فروری ۱۹۶۲ء میں ختم نبوت کے نام سے مسئلہ کی دینی بنیادوں پر قلم اٹھایا اور ایک رسالہ لکھا جو عربی میں ترجمہ ہو کر تمام عرب دنیا میں پھیلا دیا گیا۔ ان دونوں رسائل کا بنیادی فائدہ یہ ہوا کہ عرب ریاستوں میں یہ تصور ختم ہو گیا کہ قادیانی پاکستان کی ملت اسلامیہ کا فرقہ یا گروہ ہیں۔ جب قادیانی فتنہ واضح و آشکار ہو گیا تو سعودی عرب کی حکومت نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک پر اپنی مملکت میں قادیانیوں کا داخلہ بند کر دیا۔ ان کی آمد و رفت پر پابندی لگا دی اور جس کے متعلق یہ شبہ ہوا کہ وہ قادیانی ہے اس کے بارے میں متعلقہ شہادت فراہم نہ ہونے کی صورت میں مولانا کے نائبین سے استفسار کیا جاتا رہا کہ وہ اس کے بارے میں حقیقت حال سے مطلع کریں۔ اس صورت حال سے تل ابیب اور ربوہ دونوں پریشان ہو گئے کیونکہ عرب ریاستوں کی اطلاعات حاصل کرنے کے لیے "مجلس اسرائیل" کے جن باشندوں سے کام لیا جا رہا تھا وہ عرب ریاستوں سے نکالے جا رہے تھے۔ مولانا کے تذکرہ بالا دونوں کتابچوں کا عربی کے علاوہ کئی ایک افریقی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اس طرح قادیانی امت کی حقیقت مختلف افریقی ریاستوں پر آشکار ہو گئی اور اس کا پیدا کردہ طلسم ٹوٹ گیا کہ وہ پاکستان کی نوزائیدہ اسلامی مملکت کے حکمرانوں میں سرخیل ہے اور اس کا مذہب پاکستان کی سب سے بڑی دینی طاقت ہے۔ اس کے بعد جون ۱۹۷۳ء میں جماعت اسلامی نے قادیانی مسئلہ کے نام سے ۵۰۴ صفحے کی ایک کتاب شائع کی جس میں اس مسئلہ کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا۔ اس کتاب کے پانچ باب ہیں اور آخر میں کئی ایک ضمیمے ہیں۔ پہلا باب قادیانی مسئلہ پر ہے، دوسرے باب میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے مقدمے کی روداد ہے، تیسرے باب میں مولانا کے اس بیان کی نقل ہے جو آپ نے جسٹس منیر کی تحقیقاتی عدالت میں تحریراً پیش کیا، چوتھے باب میں تحقیقاتی عدالت میں داخل شدہ دوسرے بیان کا متن ہے۔ پانچواں باب عدالت میں پیش کردہ تیسرا بیان ہے۔ ان تین بیانوں کے بعد ضمیمہ نمبر۱ میں عیسیٰ ابن مریم کے نزول کی احادیث کا بیان ہے۔ ضمیمہ نمبر۲ میں حضرت مہدی کے ظہور سے متعلق احادیث ہیں۔ ضمیمہ نمبر۳ میں قدماء، محدثین اور مفسرین کی نزول عیسیٰ سے متعلق ان تصریحات کا ذکر ہے جو ان کے قلم سے مختلف کتابوں میں نکل چکی ہیں۔ ضمیمہ نمبر۴ ختم نبوت سے متعلق احادیث کا مجموعہ ہے۔ ضمیمہ نمبر۵ میں تیسری صدی ہجری سے تیرہویں صدی ہجری تک کے اکابر مفسرین کے خاتم النبیین سے

متعلق اقوال ہیں۔ ضمیمہ نمبر ۲ میں عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت اور حضور کے بعد دعویداران نبوت کی تکفیر پر علماء امت کے اقوال ہیں۔ ضمیمہ نمبر ۳ میں میرزا غلام احمد کی تحریک کے مختلف مراحل اور مختلف دعاوی کا تذکرہ ہے۔ اس کے ضمیمہ الف میں بنیادی اصولوں سے متعلق علماء کی پیش کردہ ترامیم کا ذکر ہے ضمیمہ ب میں قادیانیت سے متعلق علامہ اقبال کی تحریر کے اقتباسات ہیں۔ ضمیمہ نمبر ۴ میں روزنامہ اسٹیٹسمین کے نام اس مسئلہ سے متعلق علامہ کا خط نقل کیا گیا ہے۔ ضمیمہ نمبر ۵ میں پنڈت نہرو کے سوالات کا جواب ہے۔ ضمیمہ نمبر ۶ میں ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر اور ایڈیشنل سیشن جج راولپنڈی کے دو فیصلوں کی تلخیصات ہیں جن میں قادیانی امت کو دائرہ اسلام سے خارج کیا گیا ہے۔

المختصر مولانا مودودی نے قادیانی امت کے متعلق اس حقیقت ثابتہ کو تمام دنیائے اسلام کے ذہنوں میں راسخ کر دیا کہ مرزا غلام احمد کی اختراعی نبوت کے پیرو کار مسلمانوں سے الگ ایک دوسری امت ہیں اور ان کا وجود پاکستان ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیائے اسلام کے لیے موجب خسران ہے۔

تحریک راست اقدام کے بعد

تحریک راست اقدام ۱۹۵۳ء حکومت کے وحشیانہ تشدد کی بدولت اس اعتبار سے ناکام ہوگئی کہ مجلس عمل کا ایک مطالبہ بھی تسلیم نہ کیا گیا لیکن جہاں تک عام انتظامیہ اور پنجاب پولیس کا تعلق تھا، انہیں عامۃ المسلمین کی اجتماعی قوت نے بے بس کر دیا۔ کئی شہروں میں ڈپٹی کمشنروں کا منہ کالا کیا گیا اور پولیس تھانوں میں چھپ کے بیٹھ گئی لیکن لاہور میں مارشل لاء کے نفاذ سے فوج نے عوام کو اس قدر ہراساں کیا گویا اس کے سامنے کسی دشمن ملک کے شہری ہیں پاکستان کی نوجوان نسلوں کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ ایک آزاد ملک کے شہری اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے جسٹس منیر نے لاہور ہائی کورٹ میں تحقیقاتی عدالت کی مسند پر رونق ہو کر فدایان ختم نبوت کی اس طرح تحقیر کی کہ اس کے اثرات عام مسلمانوں کی ذہنی فضا کے لیے انتہائی ناخوشگوار تھے۔ خود غرض حکومت کی بے رحمی کو فوج نے سہارا دیا اور عدالت نے توثیق کی لیکن تحریک کی ناکامی حکومت کے دائرہ میں محدود ہوئی اور اس سے لادینی عناصر کا مختصر گروہ بھی خوش ہوا یا پھر قادیانیت نے عارضی فتح حاصل کی لیکن عامۃ المسلمین کے ذہنوں میں قادیانیت کے لیے کوئی سی جگہ نہ رہی۔ ایک مستقل بیزاری اور ہمیشہ کی نفرت پیدا ہوگئی۔ اس صورت حال نے جو نتائج پیدا کیے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ:

۱۔ سیاستدان بیوروکریسی کے منہ چڑھ کر رہ گئے۔ پاکستان نوکر شاہی کے تصرفات کا شکار ہو گیا۔

۲۔ فوج نے سول اقتدار کا ذائقہ چکھ کر سارے ملک پر حکمرانی کا خواب دیکھنا شروع کیا۔ اسی کا نتیجہ خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد مسٹر محمد علی بوگرہ کی وزارت میں جنرل محمد ایوب خاں کا شمول تھا۔ اس چیز کا اندازہ ایوب خان کی سوانح عمری سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کا ذہن اس سانچے میں کیونکر ڈھلا اور وہ تین سال ہی میں سارے ملک پر کس طرح حکمران ہو گئے ان کے دس سالہ عہد اقتدار کا خمیر کیا تھا؟

۳۔ ملک میں جمہوریت اور اسلامیت کو زبردست شدید نقصان پہنچا۔ ایک طرف مسلم لیگ بازیچۂ اطفال ہو کر رہ گئی۔ اس کا تاریخی وقار مسلمانوں میں زائل ہو گیا۔ دوسری طرف اسلامی نظام کے طرفداروں کو آزمائش و ابتلا کے ہاتھوں اختلال ضعف پہنچا۔

۴۔ پاکستان کی سیاسی مرکزیت اس سانحہ کے بعد کمزور ہونے لگی۔ ان وجوہ کو زیر بحث لانے کا یہ محل نہیں لیکن مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف جو لہریں اٹھیں وہ اس صورت حال کا قدرتی رد عمل تھیں۔ مشرقی پاکستان کی سیاسی لیڈر شپ کو مغربی پاکستان کی بیوروکریسی سے شدید شکایات پیدا ہو گئیں۔ پہلا صدمہ یہ تھا کہ خواجہ ناظم الدین کو ملک غلام محمد نے بلا استحقاق اور بلا جواز برخاست کیا۔ دوسرا صدمہ یہ تھا کہ مولوی تمیز الدین سپیکر قومی اسمبلی کی رٹ جسٹس منیر نے خارج کر کے آئین کی آبرو خراب کی۔ تیسرا ملال یہ تھا کہ مسٹر محمد علی بوگرہ کو پہلے امریکہ سے درآمد کیا۔ پھر اس سے کام لے کر سبکدوش کر دیا۔ چوتھا حادثہ مسٹر حسین شہید سہروردی سے مغربی پاکستان کی ری پبلیکن پارٹی کا احمقانہ سلوک تھا۔ ان سے استعفیٰ لے کر اسکندر مرزا نے مشرقی پاکستان کو برافروختہ کیا۔ مغربی پاکستان کی بیوروکریٹ لیڈر شپ نے پے در پے مشرقی پاکستان کے زخموں پر نمک چھڑکا۔ مثلاً مولوی اے۔ کے فضل الحق کو صوبائی گورنر بنایا۔ پھر موقوف کر دیا۔ ان کی جگہ اسکندر مرزا کو بھیجا۔ مولوی صاحب پر سیاسی گالیوں کی بوچھاڑ باندھی۔ ضرورت پڑی تو مرکزی وزارت میں لے لیا۔ ضرورت نہ رہی تو رخصت کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی سیاست مغربی پاکستان کے جن بیوروکریٹس کے ہاتھ میں رہی وہ سیاسی اعتبار سے کوئی عوامی خصوصیت نہ رکھتے تھے۔ انہیں اپنے ملک کے عوام کی بہ نسبت استعماری طاقتوں کی پشت پناہی پر بھروسہ تھا۔ اس زمانے میں پاکستان کی سیاسی ابتری شروع ہوئی اور حالات بگڑتے چلے گئے حتیٰ کہ عالمی طاقتوں نے پاکستان کو اپنی شطرنج کا مہرہ بنا لیا۔

۵۔ قادیانی بزرجمہروں نے اسکندر مرزا کے عہد میں اپنے سیاسی مقاصد کی مہم شروع کی۔ اور استعماری طاقتوں سے گٹھ بندھن کے بعد اسرائیل سے معاہدہ کیا کہ وہ ان کے لیے عرب ریاستوں میں خفیہ خدمات انجام دیں گے

اور پاکستان کی سیاسی فضا کو ابھی نہج پر لے آئیں گے جو استعماری طاقتوں کی سیاسی خواہشوں کا منصوبہ ہے۔ چوہدری سر ظفر اللہ خاں کا پاکستان کی وزارت خارجہ سے سبکدوش ہو کر انٹرنیشنل کورٹ کا جج ہونا اسی سلسلے کا ایک شگوفہ تھا۔ ادھر پاکستان میں قادیانیوں نے فوج کے تینوں شعبوں میں پاؤں جمانا شروع کئے۔ مسٹر ایم۔ ایم۔ احمد مرکزی حکومت میں مالیات کے سیکرٹری ہو کر براجمان ہو گئے۔ تو آخرکار اقتصادی منصوبہ بندی اُن کے ہاتھ میں چلی گئی۔ انہوں مشرقی پاکستان کو استعماری پلان کے مطابق اقتصادی ترقی سے محروم رکھا جس سے اس کی ناراضی کو شہ ملی اور مغربی پاکستان سے علیحدگی کا ذہن نشوونما پانے لگا۔ پاکستان کی اٹامک انرجی کا چیئرمین پروفیسر عبدالسلام قادیانی کو مقرر کیا گیا وہ انگلستان میں کیمبرج یونیورسٹی کا پروفیسر لیکن در پردہ سی۔ آئی۔ اے کا آلہ کار تھا۔ اور اب تک استعماری خدمات پر مامور ہے۔

غرض تحریک راست اقدام کے بعد پاکستان سیاسی طور پر ایک کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ہو گیا۔ اس کے بعد شاید ہی کوئی سال جمعیت خاطر کا ہو۔ ہر روز سیاسی شرارتیں جنم لیتیں اور مقتدرین قومی استحکام کو داؤ پر لگا کر قمار بازی کے شغل میں منہمک ہوتے۔ خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمیٰ تحریک ختم نبوت کے خون سے گل گوں ہوئی تو میاں ممتاز دولتانہ کی وزارت کا صفایا کیا گیا۔ اس کے بعد ملک غلام محمد نے بطور گورنر جنرل ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمیٰ کا پتہ کاٹ دیا۔ ادھر اگلے سال ۱۹۵۴ء کے موسم بہار میں مسلم لیگ کو مشرقی پاکستان میں شکست فاش ہوئی۔ اس سے ملکی معاملات کا نقشہ بدل گیا۔ ملک غلام محمد نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو مجلس دستور ساز توڑ دی جسٹس منیر نے اس اقدام کی عدالتی توثیق کی۔ مسٹر محمد علی بوگرہ نے جنرل ایوب خان کو کابینہ میں شریک کیا۔ وہ کمانڈر انچیف بھی رہے اور وزیر دفاع بھی! اس کشاکش میں ملکی حالات کا سفینہ منجدھار میں گھرا رہا۔ ادھر جون ۱۹۵۵ء میں نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات مکمل ہوئے۔ اسی دوران میں ملک غلام محمد کی بیماری بے قابو ہو گئی۔ ان کی جگہ اسکندر مرزا نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ چوہدری محمد علی نے ۱۹۵۶ء کا آئین تیار کیا۔ مسٹر محمد علی بوگرہ کے بعد انہیں وزیر اعظم بنایا گیا۔ لیکن آئین بنانے کے بعد وہ زیادہ عرصہ وزارت عظمیٰ کی مسند پر متمکن نہ رہے۔ کوئی مرکزی شخصیت نہ تھی دوسرے درجے کے سیاستدان آپس میں اس طرح لڑ رہے تھے جس طرح اورنگ زیب کے بعد قلعہ میں مغل شہزادوں کی آپا دھاپی کا دور دورہ تھا۔ چوہدری محمد علی کے استعفیٰ دینے کے بعد ان کی جگہ شہید سہروردی وزیر اعظم ہوئے۔ اسکندر مرزا نے پہلے ان سے نواب مشتاق احمد گورمانی کو پنجاب کی گورنری سے سبکدوش کرایا پھر ری پبلکن پارٹی سے ساز باز کر کے انہیں نکال دیا۔ ان کی جگہ چندریگر آئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ بھی چلے

گئے۔ ملک فیروز خان نون وزیر اعظم ہوئے لیکن ان کا چراغ اسکندر مرزا نے مارشل لاء کی پھونک سے گل کر دیا۔ اسکندر مرزا سازشی طبیعت کے سیمابی انسان تھے۔ انھیں کسی پل چین نہ تھا۔ انھوں نے ایوب خان کی ملی بھگت سے مارشل لاء نافذ کیا۔ پھر چند دن ہی میں ان کے خلاف گٹھ جوڑ کرنے لگے۔ ابھی مارشل لاء کا چوتھا ہفتہ شروع ہوا تھا کہ ایوب خان نے اسکندر مرزا کو جلاوطن کر دیا اور وہ رخت سفر باندھ کر لندن روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد ملک پر جو بیتی وہ سب کے سامنے ہے۔ ایک طویل عرصے کے لیے مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ اس سے پہلے تقریباً ساڑھے پانچ سال کی مدت میں پانچ وزرائے اعظم مقرر ہو چکے تھے۔ ایوب خان نے اپنی سوانح عمری کے چھٹے باب میں لکھا ہے کہ ایک لمبے عرصے سے کراچی میں سیاسی سوانگ کھیلا جا رہا تھا اور بہ قول اسکندر مرزا صورت حال ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ ملک غلام محمد اس سے پہلے ۱۹۵۴ء ہی میں ایوب خان کو ملک کی عنان سونپنے کے لیے تیار تھے اور وہ راضی نہ ہوتے تھے۔ آخر ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو آٹھ بجے شب اسکندر مرزا نے ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کا آئین منسوخ کر ڈالا اور ملک کو مارشل لاء کے حوالے کر دیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں ایک دردناک المیے کا آغاز تھا۔ اسکندر مرزا خود تو صدر ہی رہا۔ ایوب خان کو مارشل لاء کا چیف ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا۔ لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی۔ ابھی تین ہفتے نہ ہوئے تھے کہ اسکندر مرزا اپنے ہی مارشل لاء کا شکار ہو گیا۔ ۲۷ اکتوبر کی شب کو تین جرنیلوں، جنرل اعظم، جنرل برکی اور جنرل شیخ نے اسکندر مرزا کو آدھی رات کے وقت جگا کر سبکدوشی کے کاغذ پر دستخط لیے اور انگلستان روانہ کرنے سے پہلے چار پانچ روز کوئٹہ میں رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں اس سے بعض راز ہائے درون پردہ دریافت کیے گئے اور ان کی دولت کے خفیہ ذخائر سے متعلق پوچھا گیا۔ پھر اس کے بعد لندن بھیج دیا۔

اسکندر مرزا کی صدارت سے علیحدگی اور ملک سے جلاوطنی لازم و ملزوم تھے۔ ایوب خان نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ میں نے انھیں تنبیہ کی تھی کہ وہ عیاری اور چالبازی ختم کر دیں اور آگ سے نہ کھیلیں۔ لیکن مرزا نے مارشل لاء نافذ کرنے کے فوراً بعد اپنا ناٹک شروع کیا۔ اس نے ایئر فورس کے ایئر کموڈور ربّ سے کہا کہ وہ جنرل یحییٰ، جنرل شیر بہادر اور جنرل حمید کو گرفتار کر لے۔ ربّ جھجکا۔ اس نے شیر بہادر کو مطلع کر دیا اور آخر یہی چیزیں اس کی معزولی اور جلاوطنی کا باعث ہوئیں۔ ایوب خان لکھتے ہیں کہ اسکندر مرزا کی بیوی ناہید اس سے لڑتی جھگڑتی اور بار بار کہتی کہ تم نے سخت غلطی کی ہے۔ اب تمھیں چاہیے کہ ایوب خان کو ختم کر دو۔ لیکن اسکندر مرزا خود ختم ہو گیا۔ اس نے زندگی کے باقی دن لندن میں اس طرح گزارے کہ اس کے لیے کسمپرسی کا عالم تھا۔ راقم ۱۹۶۱ء کے وسط میں لندن گیا تو شفیع ہوٹل میں اسکندر مرزا اور ان کی اہلیہ سے ملاقات ہوئی۔ ایک رسمی علیک سلیک کے بعد

راقم نے میرزا سے کہا کہ آپ کو وہ دن یاد ہوگا جب نواب زادہ نصراللہ خان سے آپ نے سیاسی حالات پر بحث کے اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس ملک کا علاج مارشل لاء ہے اور جب تک مارشل لاء نہیں لگے گا اس قوم کا مزاج کبھی درست نہیں ہوگا۔" نواب زادہ صاحب نے جواباً کہا تھا کہ آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ مارشل لاء والے تو بیٹھتے ہی سب سے پہلے آپ کو شکار کریں گے اور آپ کسی طرح بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ اسکندر میرزا نے آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے کہا مجھے یاد ہے! وہ بات جو نصراللہ خاں نے کہی تھی۔

ایوب خان نے مارشل لاء کے بل پر پہلے اکتوبر ۱۹۵۹ء کے آخر میں بنیادی جمہوریتوں کا تجربہ کیا اور ۱۱ جنوری ۱۹۶۰ء کو اس کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا۔ اسی ہزار ممبر منتخب ہوئے جن میں ایوب خان نے ان سے صدارتی ووٹ حاصل کیا، پھر اپنی صدارت کو قانونی شکل دیکر ۱۷ فروری ۱۹۶۰ء کو صدر کا حلف اٹھایا لیکن نظم و نسق مارشل لاء ہی کا رہا۔ آخر آئینی کمیشن کی رپورٹ پر یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو نئے آئین کا اعلان کر دیا گیا جس میں ہر اختیار صدر کی مرضی و منشاء کے تابع تھا۔ اس آئین کے مطابق اپریل میں قومی اسمبلی اور مئی میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ اس طرح اسمبلیوں کا ایک ڈھانچہ ضرور بن گیا لیکن اختیارات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اہم چیز یہ تھی کہ ملک کی سیاسی پارٹیوں کو بحال نہ کیا گیا تھا۔ ایوب خان نے ۱۰ مئی ۱۹۶۲ء کو اعلان کیا کہ قومی اسمبلی مفصل اور طویل بحث کے بعد سیاسی پارٹیوں کے سارے مسئلہ پر نئے سرے سے غور کرے گی۔ چنانچہ ۸ جون ۱۹۶۲ء کو راولپنڈی میں قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا تو اسی روز ساڑھے تین سال آٹھ ماہ کے بعد مارشل لاء اٹھا لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سیاسی پارٹیاں بحال ہو گئیں لیکن ملک کے سیاسی حالات بہر صورت اس حد تک قابو سے باہر تھے کہ ایوب خان اپنی تمام تر مساعی کے باوجود ان پر قابو پانے سے معذور رہے۔ پاکستان کے عوام کا سیاسی شعور فطری طور پر فوجی آمریت اور فوجی اقتدار کے خلاف تھا۔

عوام بنیادی طور پر شہری آزادیوں کے رسیا تھے۔ ایوب خان نے مارشل لاء کی طویل رات میں انہیں سلب رکھا۔ اس کے بعد جو آئین دیا وہ بھی حقوق شہریت کے اعتبار سے محدود تھا اور لوگ اس سے ناخوش تھے۔ ایوب خان خود بیوروکریٹ تھے انہوں نے بیوروکریسی کے ایک طائفہ پر بھروسہ کیا اور ان کے مشوروں سے پوری قوم پر حکمرانی کرنے لگے۔ پاکستان سے عوام کا عشق ابھی قائم تھا۔ اس لیے ایکا ایکی کسی حادثے کا رونما ہونا ممکن نہ تھا۔ لیکن ایک طرف سی۔ آئی۔ اے نے اپنا ہر رنگ زمین دام بچھانا شروع کیا، دوسری طرف پاکستان میں ابھرنے والے عناصر اور کھوٹے سیاستدان ان کی مٹھی میں آتے گئے یا بالفاظ دیگر ملک اندرونی سیاست کی حرارت سے محروم

ہوگیا اور عالمی طاقتوں کی استعماری شہ پر نوزائیدہ سیاست کے روز و شب طلوع و غروب ہوتے۔ اس فضا میں جنوری ۱۹۶۵ء کو صدارتی انتخاب ہوا اور ایوب خان مس جناح کے مقابلہ میں ۶۴ فیصد ووٹ لے کر کامیاب ہوگئے لیکن ملکی عوام ایوب خان کے ساتھ بالکل نہ تھے۔ ملک کے ۸۰ ہزار بی۔ ڈی ممبروں کے اس تناسب کو اقتدار کی کشمکش میں خریدا گیا تھا۔

اس پُراسرار کہانی کی تفصیلات کا تذکرہ ایک دوسری کتاب کا موضوع ہے لیکن ایوب خان نے جب امریکہ کی عالمی سیاست کے مشوروں سے اختلاف کیا تو سی۔ آئی۔ اے کے ہاتھ لمبے ہوگئے۔ اس نے پاکستانی سیاست دانوں کے علاوہ انتظامیہ میں سے کچھ لوگ تلاش کیے۔ انہیں ڈھب پہ لاکر سازش کی چوسر بچھائی۔ سب سے زیادہ اعتماد قادیانی امت پر کیا گیا۔ سر ظفر اللہ خان کی معرفت ربوہ کے محمود میاں مرزا بشیر الدین کو ہاتھ میں لیکر قادیانی امت کو استعمال کرنے کا فیصلہ ہوگیا۔ راقم کو یہ شرف حاصل ہے کہ قادیانی اداروں کا نام لے کر راقم نے سب سے پہلے سنگین حقائق کی چہرہ کشائی کی، اور اس انکشاف کو ایک تحریک بنا دیا کہ پاکستان میں قادیانی آمیز مختلف کلیدی آسامیوں تک پہنچ کر عالمی استعمار کے لیے کیا فرائض انجام دیتے ہیں؟ ایوب خان کا صدارتی انتخاب ختم ہوا تو اس کے چند ماہ بعد کشمیر کی جنگ، اور اس کے جواب میں ہندوستان کی پاکستان پر لشکر کشی، استعماری سیاست کا کرشمہ تھا۔ راقم نے اپنے ایک پمفلٹ "عجمی اسرائیل" میں اس کا انکشاف کیا۔ اپنی بہت سی تقریروں میں ذکر کیا کہ سر ظفر اللہ خان نے امریکہ سے ڈاکٹر جاوید اقبال کی معرفت، صدر ایوب کے نام کیا پیغام بھیجا تھا؟ جنرل اختر حسین ملک قادیانی نے کشمیر میں جنگ کا محاذ کھولنے کے لیے کیا کیا جتن کیے، اس کی روداد نواب کالاباغ نے خود راقم سے بیان کی۔ نواب صاحب نے راقم کو وہ دستی اشتہار بھی دکھایا جو قادیانی امت نے ربوہ کے حسب ہدایت کشمیر میں تقسیم کیا تھا کہ "مسیح موعود" کی پیشگوئی کے مطابق وادی کشمیر کی فتحیابی اس کی جماعت کے ہاتھوں ہوگی۔ وہ ایک مسیح کا مدفن ہے اور دوسرے مسیح کی صداقت کا نشان ہوگا۔ نواب کالاباغ راوی تھے کہ قادیانی امت نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کا ڈول استعماری ہدایت پر ڈالا تھا، خداوند تبارک و تعالیٰ نے ہمیں مصؤن و محفوظ رکھا۔

اس جنگ کے بعد قادیانی امت نے استعماری معاہدوں کے تحت پاکستان میں اپنے منصوبوں کو پروان چڑھانے کی مہم تیز کر دی اور ملک کے حکومت کی شہ رگ کے شعبوں پر قبضہ کرنے کا آغاز کیا۔ مسٹر ایم۔ ایم۔ احمد نے اپنے دادا کے پیروؤں کی اقتصادی ساکھ کو مضبوط کرنے کے لیے قادیانی صنعت کار بنانا شروع کیا۔ میرزا بشیر الدین محمود نے جماعتی روپے کے بل پر ملکی بینکوں میں اپنے مریدوں کے لیے بڑی بڑی ملازمتوں کا انتظام کر

بعض انشورنس کمپنیوں میں امت کے افراد کو جگہ دلوائی۔ ملک کے اکثر روزناموں کو بطور ایجنسی مہیا کیا گیا تاکہ قادیانی امت کے متعلق کوئی منفی خبر نہ چھپے اور اگر ایسی کوئی خبر ملے تو اس کو ملکی استحکام کے خلاف قرار دے کر مسترد کر دیا جائے ان لوگوں کے خلاف پراپیگنڈا کی نیوز کروائی جو قادیانیت کے حریف اور اسلام کے مخلص تھے۔ افسروں کے وفادار عناصر کو ایوب خاں سے قریب تر ہونے دیا اور ان لوگوں کو ان سے قریب رکھا جو قادیانیت کے احتساب کو ملک وقوم کی سالمیت کے خلاف سمجھتے اور اسی مفروضہ پر زندگی گزارتے تھے۔ مرزا بشیرالدین نے ان افسروں کے پیچھے کئی طرح کی رشوتوں کا انتظام کیا جس میں بیگم کالسن اور ڈیال کا تذکرہ شامل تھے۔ اسی دوران مرزائی امت نے عرب ریاستوں کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے آدمی بھجوانا شروع کر دیے جو مرزا بشیرالدین محمود اور ظفراللہ خاں کی ہدایت کے مطابق اسرائیل کو خفیہ معلومات بہم پہنچاتے اور عالمی استعمار کے فرائض سے عہدہ برآ ہوتے تھے۔

مرزائیوں نے ملکی نشر و اشاعت کے ذرائع کو بھی اپنے تصرفات میں ڈھال لیا۔ سب سے خطرناک چیز ملکی فوج میں مرزائی امت کا جوق در جوق بھرتی ہونا اور بڑے بڑے عسکری عہدے حاصل کرنا تھا۔ روزنامہ الفضل فوجی بھرتی کے وہ تمام اشتہارات چھاپتا جس بھرتی کے انچارج قادیانی افسر ہوتے اور وہ ٹکٹ کے نشان پر قادیانی عقیدہ نوجوانوں کا انتخاب کرتے۔ غرض قادیانی امت بری فوج میں لگاتار بھرتی ہوتی گئی اور اسی طرح ایک ایسا CELL قائم کیا جو مرزائی جرنیلوں کی معرفت ربوہ کے ماتحت تھا اور استعماری ضرورت کے وقت ففتھ کالم کا کام دے سکتا تھا لیکن جو چیز انتہائی خطرناک تھی وہ فوج کے بنیادی عہدوں اور جنگ کے اہم محاذوں پر قادیانی جرنیلوں کا تقرر تھا۔ اسی طرح بحریہ میں ربوہ کو ضرورتوں کے ہر فن سے مطلع رکھنے کے لیے قادیانی موجود تھے لیکن اصل خطرہ فضائیہ سے تھا کہ اس پر قادیانیوں نے بھرپور قبضہ کیا اور پاکستانی فضائیہ کے تقریباً سبھی اسٹیشنوں کے انچارج ہو گئے۔ یہ ایک خطرناک چیز تھی اس کا تجربہ سعودی عربیہ کو ہو چکا تھا کہ اسرائیل سے جنگ کے دوران ان کے جہاز کیونکر ناکارہ ہو گئے اور جب کرنل ناصر نے روس سے دوستی کا آغاز کیا تو سعودی عربیہ کے طیاروں کی ایک ٹکڑی اڑ کے قاہرہ پہنچ گئی۔ ایئر مارشل نور خاں اور ایئر مارشل اصغر خاں کے بعد قادیانی ہوابازوں اور مختلف ٹیکنیکس کے مرزائی افسروں کی طاقت کو اور وسعت ہوئی۔ سبب یہ تھا کہ ایوب خاں کے زمانہ ہی میں مارشل ایس۔ ایم۔ اختر جو ایک مشہور قادیانی تھے۔ ایئر فورس کے سربراہ ہو جاتے لیکن ان کی خدمات پی۔ آئی۔ اے کو منتقل کر دی گئیں۔ انہوں نے وہاں چیف کی حیثیت میں قادیانی امت کی اس طرح سرپرستی کی کہ ادنیٰ تا

ایجی ٹیشن شروع ہو گئی۔ راقم نے صدر ایوب کو ذاتی خط لکھے جن میں متعدد تحریریں کیا بعض علماء کو متوجہ کیا اور ان کو تحفظ ختم نبوت کو آگاہ کیا۔ اس احتجاج کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایوب خان نے اپنے صدارتی وجود کو قائم رکھنے کے لیے مارشل ایم۔ ایم۔ اصغر کو سبکدوش کر دیا لیکن ایئر فورس کی اختیاری اکثریت پر قادیانی امت ہی کا قبضہ رہا۔ اس کا سب سے افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اسرائیل سے شکست کھانے کے بعد عرب ریاستوں نے پاکستان سے فضائیہ کا عملہ طلب کیا تو سرکاری طور پر جو لوگ ایئر فورس کی طرف سے بھیجے گئے وہ زیادہ تر قادیانی تھے یا پھر وہ مسلمان تھے جو قادیانی حربہ کا شکار ہو چکے تھے اور فوج کے غیر قادیانی افسروں کو شکار یا رام کرنے کے لیے مرزائی امت نے اپنی دوشیزاؤں کو ان کے نکاح میں دے کر حسب مطلب نتائج پیدا کر لئے تھے۔ ان ناموافق حالات میں بھی قادیانیت کا محاسبہ کم و بیش جاری رہا۔ علماء نے منبر و محراب پر اپنے وعظ جاری رکھے اور مختلف دینی احزاب کے مجلوں نے اپنے استقلال قلم کو رواں دواں رکھا۔ سب سے بڑا فائدہ جو اس تحریک راست اقدام سے پہنچا وہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا باہمی اتحاد تھا۔ قضیہ جو بریلوی دیوبندی نزاع کے نام سے لاینحل تھا اس تحریک کی بدولت مدفون ہو گیا۔ اس طرح اہل حدیث و غیر اہل حدیث، شیعہ و سنی، اور دیوبندی و بریلوی کے تنازعوں کی چنگاریاں بجھ گئیں اس کے حقیقی محرک سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ آپ نے مولانا سید ابوالحسنات قادری کو ساتھ ملا کر اور مجلس عمل کی قیادت سونپ کر ایک شگفتہ زمین تیار کی۔ سید مظفر علی شمسی شیعہ نوجوانوں کے لیڈر تھے اور ذہین شعور سے آراستہ ذہن رکھتے تھے۔ شاہ جی نے ان کی وساطت سے مشہور شیعہ عالم حافظ کفایت حسین کو ساتھ ملا کر قادیانیت کے حصار پر وہ ضربیں لگائیں کہ وحدت اسلامی کی بقاء کا نقشہ کھنچ گیا۔ جب ۱۹۵۳ء میں تحریک راست اقدام چلی تو راقم نے حسین شہید سہروردی کو مسئلہ کے ہر پہلو سے آگاہ کیا۔ مرزا غلام احمد کے دعاوی کی روداد سنائی۔ راقم نے مرزا غلام احمد اور مرزا بشیر الدین کی تحریروں کا انبار پیش کیا۔ سہروردی نے ایک ایک چیز کا مطالعہ کیا اور کہا کہ اس قسم کا شخص اگر مشرقی پاکستان میں ہوتا تو بنگال کا مسلمان چلتے پھرتے اس کو ہمیشہ کی نیند سلا دیتا اور اس کے پیروکار [illegible] شاخوں کی طرح کاٹ دیئے جاتے۔ حیرت ہے کہ پنجاب نے اس کو قبول کیا اور مسلمانوں نے اپنی زمین میں اس کو پنپنے دیا۔ اس طائفہ کا وجود مسلمانوں کے لیے ناسور ہے۔ مسٹر سہروردی نے اس سلسلہ میں خواجہ ناظم الدین کو ان کی کیبنٹ سازش کے تین صفحوں کا ایک طویل خط لکھا جس میں تحریک راست اقدام کی حمایت کے علاوہ مرزا غلام احمد کی امت کو خارج از اسلام قرار دینے کے مطالبہ کی پرزور حمایت کی۔ اس خوبصورت اور مدلل خط کی ایک نقل احقر کو عنایت کی۔ وہ خط راقم کے پاس منیر انکوائری کمیٹی کے آغاز تک محفوظ رہا۔ پھر مولانا سید محمد داؤد غزنوی

کمیٹی کو دکھانے کے لیے لے گئے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ خط کہاں رہ گیا۔ کیونکہ وہ خط کسی مرحلے میں منیر انکوائری کمیٹی کے سامنے پیش نہ کیا گیا۔ کئی سال ہوئے راقم کو اس خط کی ایک دوسری نقل خواجہ عبدالرحیم سے ملی، لیکن اس کے ابتدائی تین صفحے اور آخری دو صفحے غائب تھے۔ شہید سہروردی نے عوامی لیگ کی طرف سے تحریک راست اقدام پر صاد کیا۔ اور لاہور سے باہر جہاں کہیں جلسوں کا انعقاد ممکن تھا اس دینی مسئلہ کی حمایت اور سرکاری تشدد کی مذمت میں زبردست تقریریں کیں۔ راجہ حسن اختر عوامی لیگ کے نمائندہ کی حیثیت سے مسجد وزیر خاں کے جلسہ میں شامل ہونے کے لیے جا رہے تھے کہ سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مشتعل ہجوم کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ راجہ صاحب کو پولیس نے روک کر واپس کر دیا۔ ادھر مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ واضح رہے کہ مسجد وزیر خاں کے مورچہ کی پاداش میں مولانا عبدالستار خاں نیازی، جو ہر مکتب فکر کے چیدہ و تیز طرار جوان تھے مارشل لاء کی عدالت سے پھانسی کے مستحق گردانے گئے انھیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ ہی سزائے موت سنائی گئی۔ پھر ان کے ساتھ حبس دوام میں تبدیل کر دی گئی۔ انھوں نے اپنی رہائی کے بعد ختم نبوت کے تقریری محاذ کو ٹھنڈا نہ ہونے دیا۔ اس سلسلہ میں تحریک و مسئلہ سے متعلق دو تاریخیں کتابچے لکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا عبدالستار نیازی عشق رسالت میں قرن اول کے مسلمانوں کا مزاج رکھتے ہیں۔ انھوں نے باہر آتے ہی مرزائی امت کو للکارنا شروع کیا۔ ایوب خاں کے دور میں اس کی حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ان مسلمانوں کو انگلو مسلمان کا لقب دیا جو قادیانی امت کو مسلمانوں میں شمار کرتے اور عقیدۂ ختم نبوت کی اساس سے ناواقف تھے۔ مولانا عبدالستار نیازی اس دوران میں دو چار دفعہ پکڑے گئے۔ حتیٰ کہ ایوبی غنڈوں اور قادیانی اجیروں نے تنہا پا کر ان پر حملہ بھی کیا۔ مرزائیوں کے حوصلے اتنے بڑھ چکے تھے کہ انھوں نے علامہ کا استخفاف اپنا شعار بنا لیا۔ اور ایوب خاں کو بھی اسی راستہ پر لگا لیا۔ روزنامہ الفضل کے ایک ہم زلف ہفتہ وار نے علامہ اقبال کے خلاف ژاژ خائی کا سلسلہ شروع کیا۔ مرزائی امت کا حوصلہ تھا کہ اس نے پاکستان میں علامہ کے خلاف بدزبانی کا آغاز کیا اور اقبال سے اس مقالے یا مقالوں کا انتقام لینا چاہا جو ان کے قلم سے قادیانیت کے تابوت کی میخ تھے۔ علامہ اقبال کی فکر کے نمک خواروں میں سے کسی کو جواب دینے یا احتجاج کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ تب قادیانی رسوخ کا یہ حال تھا کہ پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے مسند اقبال کے لیے گورنمنٹ کالج کے مشہور قادیانی پروفیسر قاضی محمد اسلم کو مقرر کیا اور کسی احتجاج کی پروا نہ کی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجلس احرار اسلام کے شعبۂ تبلیغ کو مجلس تحفظ ختم نبوت کی شکل دے کر مولانا محمد علی جالندھری کو پہلا ناظم اعلیٰ مقرر کیا اور حسب ذیل علماء اس کے بنیادی ارکان تھے۔

(۱) قاضی احسان احمد شجاع آبادی (۲) مولانا لال حسین اختر (۳) مولانا محمد حیات فاتح قادیان (۴) شریف محمد جالندھری (۵) مولانا تاج محمود (۶) مولانا عبدالرحمٰن میانوی (۷) مولانا شیخ احمد بوریوالہ (۸) مولانا سعید احمد مظفرگڑھ (۹) مولانا محمد شریف بہاولپوری (۱۰) مولانا نذیر حسین پنہ عاقل سندھ (۱۱) مولانا علاؤالدین ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔

ان علماء نے قادیانیت کو مذہبی اعتبار سے کہیں ٹکنے نہ دیا۔ اپنا تنور روشن رکھا۔ تحریک راست اقدام کے بعد مجلس تحفظ ختم نبوت کا وجود انعام الٰہی تھا۔ شاہ جی کی رحلت کے بعد کچھ عرصہ کے لیے مولانا محمد علی جالندھری امیر ہو گئے۔ پھر کام کی وسعت کے پیش نظر مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو امیر مقرر کیا گیا۔ قاضی صاحب حضرت شاہ صاحب کے شاگرد خاص اور قادیانی مسئلہ میں شمشیر برہنہ تھے۔ آپ نے زندگی بھر قادیانیت کا مقابلہ کیا اور اس طرح شکستیں دیں کہ میرزا غلام احمد کے جانشین ان کے نام سے کانپتے تھے۔ قاضی صاحب قادیانیت کے سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا تھے۔ اپنے ساتھ قادیانی لٹریچر کا بستہ رکھتے، وزیر اعظم، وزیروں، گورنر جنرل اور گورنروں کے ہاں پہنچ جاتے۔ انہیں میرزا غلام احمد کی تصنیفات میں سے پوچ تحریریں اور بے نقط گالیاں دکھاتے، وہ کانوں پہ ہاتھ رکھتے اور کہتے کہ اس فاترالعقل نے اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا تھا۔ قاضی صاحب گرانڈ خطیب تھے۔ آپ کا ۱۹۶۶ء میں انتقال ہو گیا۔ مولانا محمد علی شروع دن سے ناظم اعلیٰ تھے۔ قاضی صاحب کی موت کے بعد امیر مقرر کیے گئے۔ مولانا لال حسین اختر ناظم اعلیٰ بنے۔ مولانا محمد علی ایک متدین عالم دین اور ایک معتدل خطیب تھے، ہر بات تول ناپ کر کرتے۔ آپ نے دارالمبلغین قائم کر کے قادیانیت کے لیے ایک ایسا شکنجہ تیار کیا کہ تمام اضلاع میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر قائم ہو گئے۔ کوئی پچاس سے زائد کل وقتی مقرر کیے جو مرکزی دفتر سے معمولی مشاہرہ لے کر اپنے فرائض انجام دیتے۔ اس نظام نے قادیانیت کی سرکوبی نہایت احسن طریق پر کی۔ دارالمبلغین نے سینکڑوں مبلغ و مناظر تیار کیے، انھوں نے پاکستان ہی میں قادیانیت کا پیچھا نہ کیا بلکہ ملک سے باہر افریقی ممالک اور عرب ریاستوں میں جاتے رہے۔ دارالمبلغین میں ہندوستان، برما، ماریشس، فجی آئی لینڈ اور افریقی ممالک کے علماء نے آکر ردّ میرزائیت کی تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنے ممالک میں واپس جا کر قادیانیت کا تعاقب کیا۔ یہ سب مولانا محمد علی جالندھری کی شبانہ روز مساعی کا اعجاز تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تنہا بازو کے بل پہ آپ نے مجلس تحفظ ختم نبوت کو ایک طاقتور تنظیم بنا دیا۔ اس کا مرکزی دفتر ملتان میں خرید کیا۔ جوابی لٹریچر تیار کرتے رہے اور ان تمام مقاصد کے اخراجات مجلس کے ذمہ ہوتے جو مبلغین کے

خلاف قائم کیے جاتے، یا جن علاقوں میں مرزائی مسلمانوں سے انفرادی و اجتماعی سطح پر قانون کے مختلف معرکے رچاتے۔ مثلاً جائیداد کا تنازعہ، شادی بیاہ کے معاملے اور طلاق وغیرہ کا مسئلہ۔ مولانا کا وجود مرزائیوں کے لیے دُرّۂ عمر تھا۔ آپ نے مجلس تحفظ ختم نبوت کے لیے لاکھوں روپے جمع کیے۔ خود بھی مشاہرہ لیتے تھے، لیکن جب ۱۹۵۴ء میں آپ کا انتقال ہوا، تو آپ کی یادداشتوں میں سے ایک تحریر برآمد ہوئی کہ میں نے آج تک مجلس تحفظ ختم نبوت سے بطور مشاہرہ جو رقم حاصل کی ہے۔ وہ فلاں جگہ فلاں صندوق میں بندھی پڑی ہے، وہاں سے لے لی جائے۔ اس اُجلی سیرت کے انسانوں ہی نے مجلس تحفظ ختم نبوت کا چراغ روشن رکھا۔ آپ کے بعد مولانا لال حسین اختر امیر منتخب ہوئے۔ مولانا عبدالرحیم اشعر ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ مولانا لال حسین اختر قادیانیت کے سلسلہ میں گھر کے بھیدی تھے۔ ایک اعلیٰ پایہ کے مقرر، ایک خوش گفتار مبلغ اور ایک معجز بیان مناظر۔ آپ کا نام قادیانیوں کے لیے سوہانِ روح تھا۔ آپ نے تردید مرزائیت کے سلسلہ میں انگلینڈ، جرمنی، امریکہ، فجی آئی لینڈ اور سعودی عرب کا دورہ کیا۔ آپ کی تقریروں اور کوششوں سے ہڈرسفیلڈ (انگلستان) اور فجی آئی لینڈ میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے مقامی دفتر قائم کیے گئے۔ ہڈرسفیلڈ کا دفتر مجلس کی ملکیت ہے۔ ان ملکوں میں آپ مرکزی دفتر سے مختلف زبانوں میں لٹریچر بھیجتے رہے۔ بالآخر ایک حادثہ کا شکار ہو کر ۱۹۷۳ء میں رہگرائے عالم بقا ہو گئے۔ آپ کے بعد مولانا محمد حیات فاتح قادیان کو عارضی طور پر امیر مقرر کیا گیا، لیکن جماعت کی شوریٰ نے جمع ہو کر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کو امیر منتخب کیا اور مولانا محمد شریف جالندھری کو ناظم اعلیٰ۔ ان کے علاوہ، مولانا خان محمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ کندیاں نائب صدر، مولانا عبدالرحیم اشعر ناظم تبلیغ، مولانا عبدالرحمٰن میانوی نائب ناظم اور مولانا غلام محمد بہاولپوری خازن مقرر ہوئے۔

اس ادارہ میں قادیانیت کے کئی فیصلہ کن معرکے ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریک راست اقدام کے بعد جو خلا پیدا ہوا تھا اس کو مجلس تحفظ ختم نبوت کی پُر استقامت مساعی نے پُر کیا اور حکمرانوں کے ناسازگار حالات میں بھی اپنے مشن کو قائم رکھا۔ اس سلسلے میں جن مبلغین کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں: (۱) مولانا محمد حیات فاتح قادیان (۲) مولانا عبدالرحمٰن میانوی (۳) مولانا محمد شریف بہاولپوری (۴) مولانا عبدالرحیم اشعر (۵) مولانا محمد شریف جالندھری (۶) مولانا غلام محمد (۷) مولانا سید منظور احمد شاہ (۸) مولانا قاضی محمد اللہ یار (۹) مولانا محمد انور (۱۰) مولانا عبداللطیف گوجرانوالہ (۱۱) مولانا بشیر احمد سکھر (۱۲) مولانا نذیر احمد بہاولپوری (۱۳) مولانا منظور احمد (۱۴) مولانا نذیر احمد خاں ملتان (۱۵) مولانا اللہ وسایا لائل پور (۱۶) مولانا نور محمد مظفر گڑھ (۱۷) مولانا

عبدالرشید (۱۸) مولانا بشیر احمد مظفر گڑھ (۱۹) مولانا صوفی اللہ دسایا ڈیرہ غازیخاں (۲۰) مولانا محمد علی سعیدی (۲۱) مولانا سید مختار الحسن (۲۲) مولانا عبدالرؤف (۲۳) مولانا کریم بخش ملاپور (۲۴) مولانا ضیاء الدین آزاد، گوجرانوالہ (۲۵) مولانا محمد یوسف لدھیانوی (۲۶) مولانا سید حبیب اللہ (۲۷) مولانا محمد خان سیالکوٹ (۲۸) مولانا خدا بخش ہزارہ (۲۹) مولانا محمد شریف احرار چنیوٹ (۳۰) مولانا عبدالرحمن یعقوب باوا، کراچی (۳۱) مولانا غلام حیدر اسلام آباد (۳۲) حافظ غلام حبیب (۳۳) حافظ عزیز الرحمن خورشید سرگودھا۔

جیسا کہ عرض کیا مجلس تحفظ ختم نبوت دراصل برصغیر کی آزادی سے پہلے مجلس احرار اسلام کا شعبہ تبلیغ تھا۔ اس وقت کے تمام جید علماء قادیانی فتنے کے تعاقب کی مہم میں اس کے ہمنوا تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی روایت کے مطابق علامہ محمد انور شاہ کشمیری نے احرار کو مشورہ دیا تھا کہ اپنی جماعت میں ایک غیر سیاسی شعبہ تبلیغ اسی غرض سے قائم کریں۔ چنانچہ چوہدری افضل حق، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر، ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا محمد حیات اس شعبے کی عاملہ کے ارکان مقرر ہوئے۔ میاں قمر الدین رئیس اچھرہ سرپرست قرار پائے۔ انہوں نے اس غرض سے بے شمار روپیہ صرف کیا۔ سید چراغ شاہ قادیاں میں معاون خصوصی رہے۔ مرزا بشیر الدین محمود نے احرار کے خلاف کئی دفعہ وائسرائے سے واویلا کیا۔ سر ظفر اللہ خاں اپنی والدہ کو لے کر وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن سے فریاد کی، لیکن قادیاں میں احرار کے پاؤں اس مضبوطی سے جم چکے تھے کہ بعض قادیانی امت کی خوشنودی کے لیے کوئی جواز پیدا کیے بغیر احرار کو وہاں سے نکالنا آسان نہ تھا۔ احرار نے قادیاں میں شعبہ تبلیغ کے لیے ذاتی جائیداد خریدی۔ جماعت کا مستقل دفتر بنایا۔ اس کے علاوہ جامع مسجد، مدرسہ اور دارالتبلیغ قائم کیے۔ اس شعبے ہی کے زیر انتظام قادیاں میں دو تاریخی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں ملک کے نامور علماء شریک ہوئے اور پنجاب کے لاکھوں فدایان رسالت نے کانفرنس میں شامل ہو کر مرزائیت کو اس طرح ہراساں کیا کہ کئی ماہ تک مرزا بشیر الدین محمود اپنے مختلف بیانوں میں ٹسوے بہاتے رہے۔ حقیقت یہ ہے مجلس تحفظ ختم نبوت کے جلیل القدر زعماء نے پاکستان بن جانے کے بعد من حیث الجماعت قادیانیت کے عزائم کا نوٹس لیا۔ سر ظفر اللہ کی وزارت خارجہ کے دوائر میں مرزائیت نواز سرگرمیوں کا تعاقب کیا۔ غیر ملکی سفارت خانوں میں مرزا بشیر الدین کے سرکاری ایجنٹوں کی نشاندہی کی اور جس عیاری سے پاکستان میں متروکہ جائیداد پر قادیانی قبضہ جما رہے تھے، اس کا محاسبہ کیا۔ اگر احرار زعماء اس وقت آواز نہ اٹھاتے، تو ظفر اللہ خاں کے بھائی عبداللہ خاں جو وزارت بحالیات میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے، اپنے ہم عقیدہ قادیانیوں کو مرزا بشیر الدین محمود کی ہدایت پر کروڑہا روپیہ کی

جائداد زمین مفت تنظیم کے طور پر تقسیم کر دیتے۔ غرض مجلس تحفظ ختم نبوت کی عظیم الشان خدمات اس عظیم الشان جدوجہد کی تاریخ کا نصف ہے۔

اس زمانے میں جن رسائل و جرائد نے قادیانیت کے محاسبے کو موضوع بنائے رکھا اور اس کے خط و خال پر کڑی نگاہ رکھی۔ ان میں "لولاک" لائل پور، "المنبر" لائل پور، "خدام الدین" لاہور، "ترجمان اسلام" لاہور، "ترجمان اہلحدیث" لاہور، "الاعتصام" لاہور، "شیعہ" لاہور، "صدائے بلوچستان" کوئٹہ اور "چٹان" لاہور سر فہرست ہیں۔ ان ہفت روزہ جرائد کے علاوہ ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک، ماہنامہ "بینات" کراچی، ماہنامہ "البلاغ" کراچی اور ماہنامہ "الرشید" ساہیوال بھی محاسبہ کی تحریک میں نمایاں رہے۔ مولانا کوثر نیازی نے جماعت اسلامی کے دور میں اپنے ہفت روزہ "شہاب" میں قادیانیت کا بھرپور محاسبہ کیا۔ ان کے جواب میں ربوہ نے قلم اٹھایا لیکن جواب آں غزل پا کر سپر انداز ہو گیا — حکیم عبدالرحیم اشرف نے اپنے ہفت روزہ جریدہ "المنبر" کی معرفت قادیانیت کے حصار میں بڑے بڑے شگاف ڈالے۔ جس سے ربوہ کو انتہائی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا لیکن قادیانی فضلاء سے ان کی مدلل تحریروں کا جواب نہ بن پڑا۔ حکیم عبدالرحیم اشرف ایک نامور طبیب، ایک متبحر عالم اور ایک صاف گو صحافی ہیں۔ قدرت نے انہیں ایک زیرک سیاستدان کا ذہن عطا کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی خدمات کا ہر گوشے میں احترام کیا جاتا ہے۔

جس شخص نے علم و عمل کے میدانوں میں والہانہ جرأتوں کے ساتھ قادیانی عزائم کو بے نقاب کیا، وہ مولانا تاج محمود مدیر "لولاک" لائل پور ہیں۔ مولانا تاج محمود تحریک ختم نبوت کے سرگرم رہنما ہیں۔ تمام زندگی ان کا یہی نصب العین رہا اور کبھی اس سے غافل نہ ہوئے۔ انہیں شاہ جی سے فرط ارادت رہی، وہ ذہنی طور پر انہی کے شاگرد ہیں — شاہ جی ان سے بے حد محبت کرتے اور تحریک کے سلسلے میں ان پر ہمیشہ اعتماد فرماتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے علامہ انور شاہ، مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے اکابر امت کی مساعی مشکورہ کے اس پرچم کو جھکنے نہ دیا، جو قادیانیت کے خلاف ملک کے ہر ہر گوشے میں گڑ چکا تھا۔ مولانا نے لولاک کو مجلس تحفظ ختم نبوت کا ترجمان بنا دیا۔ وہ جماعت علماء میں پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے قادیانیت کا سیاسی تجزیہ شروع کیا اور لولاک کے ہر شمارے کو حقائق سربستہ کی چہرہ کشائی کے لیے وقف کر دیا۔

مولانا ایک صاحب فکر صحافی ہی نہیں، ایک خوش بیان خطیب بھی ہیں۔ ہر جمعہ کو ریلوے اسٹیشن لائل پور کی جامع مسجد میں خطبہ دیتے اور آپ کے ہر خطبے کا موضوع قادیانیت کا احتساب ہوتا۔ آپ نے ۱۹۵۳ء کی تحریک راست اقدام میں نہایت جگر داری کا ثبوت دیا اور جانثاری و جاں سپردگی کے اعتبار سے لائل پور

کو تحریک کا دوسرا مرکز بنا دیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا محمد علیؒ جالندھری کے بعد ان کی روایتوں اور حکایتوں کے وارث ہو گئے۔ وہ قادیانیت کے سلسلے میں کسی عنوان سے کوئی سامنا ہارنا تصور نہیں رکھتے۔ اس کا اقرارت ذکر نا ظلم ہوگا کہ آپ نے تحفظ ختم نبوت کی تحریک کو پروان چڑھانے میں اپنی تمام زندگی صرف کی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا وجود نقطۂ اتحاد ہے۔ آپ کے علاوہ جن لوگوں نے تحریک کا چراغ مدھم نہ ہونے دیا اور شعلے کو آب رواں مہیا کرتے، ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے تین بیٹے سید ابوذر بخاری، سید عطاء المحسن اور سید عطاء المہیمن بخاری نمایاں ہیں۔ انہوں نے کڑے سے کڑے وقت میں اپنے باپ کی معجز بیانی کو زندہ رکھا۔ مولانا ابوالحسنات قادریؒ کی بدولت بریلوی علماء کا طبقہ قادیانیت کے محاذ پر ڈٹ گیا اور اپنے مسلسل وعظوں میں عامۃ المسلمین کے ذہنی احتساب کو مستحکم کیا۔ آپ کے فرزند سید خلیل احمد قادری نے ۱۹۵۳ء کی تحریک میں عمر قید کی سزا پائی۔ پھر جب رہا ہوئے تو اس دن سے قادیانیت کا احتساب اپنے بیان و قلم میں شامل کر لیا۔ آپ کے بھتیجے علامہ سید محمود احمد رضوی خلف الرشید مولانا ابوالبرکات قادری نے بھی قادیانیت کے خلاف اپنی قلم و زبان کی روانی و جولانی قائم رکھی۔ آپ اس سلسلے کی آخری تحریک میں مجلس عمل کے جنرل سیکرٹری رہے۔ ایک ادیب و خطیب ہی نہیں بلکہ عالم و محدث بھی ہیں۔ مولانا عبید اللہ انور نے اپنے دیرینہ والد حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیت کو "خدام الدین" میں برقرار رکھا۔ اور ان کی بے مثال جانشینی سے قادیانیت کا محاسبہ کرتے رہے۔ سید مظفر علی شمسی نے اپنے ہفت روزہ "شہید" میں اپنے قلم سے ذوالفقار کا کام لیا۔ ادھر کوئٹہ سے نوائے بلوچستان، شائع ہوتا تھا۔ اس کے نوجوان ایڈیٹر سید اقبال نے پورے صوبے میں قادیانیت کو تہ و بالا کر دیا۔ جب بلوچستان کے عوام کو معلوم ہوا کہ مرزا غلام احمد کے پیروؤں کی دینی ساخت اور سیاسی فطرت ہر دو امت سے منکر رہی ہے تو انہوں نے مرزائیت کو فورٹ سنڈیمن اور قلات ڈویژن سے نکال دیا۔ اس احتساب و انجام سے گھبرا کر مرزائیوں نے کوئٹہ میں پناہ لی، لیکن ان میں کوئی بلوچی نہ تھا۔ اکثر پنجاب سے جا کر آباد ہوئے تھے، جن میں دو چار وکلاء تھے اور چند ایک کاروباری۔ باقی چار پانچ درجن مختلف شعبوں کے سرکاری ملازم۔ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی اندرونی سازش کے باعث مولوی شمس الدین ڈپٹی سپیکر بلوچستان اسمبلی شہید کیے گئے اور یہ فورٹ سنڈیمن سے قادیانیت کے اخراج کا انتقام تھا۔ مولوی شمس الدین کے خون ناحق کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزائیت کے لیے بلوچستان میں رہنا ناممکن ہو گیا۔

جن ماہناموں نے مرزائیت کے خلاف مسلسل جہاد کیا ان کا ذکر اوپر آ چکا ہے، ان سب کی ادارت بڑے بڑے فضلاء کے ہاتھ میں رہی۔ ان کے مضامین علمی اعتبار سے اس پائے کے تھے کہ مرزائیت کے پاس کوئی

بجواب نہ تھا۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر مدینہ یونیورسٹی سے فراغت پاکر لاہور آ گئے تو آپ کے سپرد جماعت اہل حدیث نے اپنی تاریخی مسجد چینیانوالی لاہور کی امامت کی۔ علامہ صاحب ایک فاضل اجل نوجوان ہیں۔ انہیں عربی زبان میں قدرت تامہ حاصل ہے۔ آپ نے جماعت اہل حدیث کے ہفتہ وار اخبار   کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دینا شروع کیے۔ اس کے بعد اپنا ماہنامہ ترجمان الحدیث نکالا۔ اور اس بری طرح قادیانیت کی خبر لی کہ اس کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ علامہ صاحب ایک شعلہ بیان خطیب، معجز رقم ادیب، بالغ نظر صحافی اور بہت سی زبانوں میں ماہر ہونے کے علاوہ فن درس نگاہ کے عالم متبحر ہیں۔ آپ نے قادیانیت کے متعلق پہلے اردو میں ایک مبسوط کتاب لکھی، پھر اس کا انگریزی ایڈیشن شائع کیا۔ آخر رابطہ اسلامی کی خواہش پر عربی زبان میں ایک ضخیم کتاب تیار کی جس کو شاہ فیصل شہید نے بے حد پسند فرمایا اور تمام عرب ریاستوں میں اس کے بے شمار نسخے تقسیم کرائے۔ علامہ صاحب فن خطابت کی نزاکتوں سے کما حقہٗ واقف ہیں اور ایک بلند پایہ خطیب ہیں۔ اس سلسلے میں ایک چیز کا ذکر کرنا بے محل نہ ہو گا۔ کہ بعض عدالتوں نے مرزائیت کے سلسلہ میں اس قسم کے تاریخی فیصلے کیے کہ مرزائیت مسلمانوں کے دینی حصار میں پناہ لینے کے قابل نہ رہی۔ مثلاً مقدمہ بہاولپور میں جسٹس محمد اکبر کا فیصلہ تاریخی سچائی کی علامت ہو گیا۔ اس مقدمے میں علامہ انور شاہ مسلمانوں کی طرف سے پیش ہوتے رہے۔ جب تک مقدمہ زیر سماعت رہا حضرت قبلہ غلام محمد دین پوری قدس سرہٗ ہر پیشی پر خانپور سے بہاولپور آتے۔ دوسرا فیصلہ جس نے مرزائیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی اور تمام مرزائی بلبلا اٹھے وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے مرافعہ میں مسٹر جی۔ ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور کا فیصلہ تھا۔ تیسرا فیصلہ ایک سیشن جج مسٹر محمد اکبر فاروقی نے کیا جس میں ایک مسلمان عورت کے رشتہ دار نکاح کی درخواست منظور کرتے ہوئے قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا۔ چوتھا فیصلہ ایک سینئر سول جج مسٹر محمد رفیق گوریجہ جیکب آباد کا تھا۔ آخری دو فیصلے قیام پاکستان کے بعد ہوئے اور گوریجہ کا فیصلہ ان دنوں صادر ہوا جب مرزائی پیپلز پارٹی کے دامن میں پناہ لیکر بزعم خویش ملک میں حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے۔

مرزائیوں نے ملک غلام محمد کے زمانہ سے لے کر یحییٰ خاں کے دور تک اپنی فصل کو ثمر آور کرنے کے لیے جو کچھ کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) حکومت کے بنیادی محکموں مثلاً فوج، مالیات، نشریات وغیرہ میں بیرونی الف الیل قدم جمانا شروع کیے۔

(۲) استعماری سیاست کی ہر نوع خدمات بجا لانے کا عمل تیز کیا۔

(۳) عرب ریاستوں میں اسرائیل کے معتمد آلۂ کار ہو کر خفیہ خدمات کا بیڑا اٹھایا۔

(۴) پاکستان کے خاندانی بٹوارے کی آبپاشی میں بھرپور کی حکومت کے منفی کردار کو اجاگر کیا۔

(۵) سرحد، بلوچستان، سندھ اور مشرقی پاکستان کی بجائے ان اراضی کو آب رواں مہیا کیا۔

(۶) جن صوبوں کو مرکزی حکومت سے شکایتیں رہیں، ان صوبوں میں قوم کی کارروائی کا جزو لاینفک ہو کر انہیں پاکستان کی تقسیم کے لیے تیار کیا۔

(۷) مرزا بشیر الدین کی ہدایت کے مطابق قادیانی دوشیزاؤں نے بڑے بڑے مسلمان افسروں کی زوجیت میں آکر جماعت کے خلافتی منصوبوں کی نگہداشت کی۔

(۸) لاکھوں روپیہ کا ایک حصہ، پاکستان کے غیر قادیانی حکام، سیاستدانوں اور جرائد کے عمال میں تقسیم کیا جو خلیفہ ربوہ (اور اس کے پاسبان شاطر، سی۔ آئی۔ اے اور اسرائیل) سے ملا۔

(۹) مشرقی پاکستان کے تقسیمی ذہن کو جوان کیا۔

(۱۰) اپنے نوجوانوں کو اسلامی تحریکوں اور اسلامی تنظیموں کے برعکس لادین تحریکوں اور مادی تنظیموں میں داخل کیا۔ ان نوجوانوں نے ایثار پیشہ رہنماؤں کے خلاف عوام کو گمراہ کیا اور مظاہرے و ہنگامے برپا کرے۔

(۱۱) ہر اقتدار کی پرستش کی، لیکن جب اس پر عالم نزع طاری ہوا تو اس کو ڈوبتا دیکھ آئندہ اقتدار کی چوکھٹ پر چلے گئے اور خود سپردگی کا انداز اختیار کیا۔

(۱۲) جنرل انتخابات ۱۹۷۰ء میں تمام اسلامی جماعتوں کے خلاف لادین عناصر کا ہاتھ بٹایا۔ اور پیپلز پارٹی کی پناہ لے کر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا دامن تھاما۔ پاکستان میں شوکت اسلام کے جلوس سے خوفزدہ ہو کر اسرائیل سے روپیہ حاصل کیا اور اس روپے سے اسلام دوستوں کے خلاف ہنگامے برپا کرنے۔ اس زمانہ میں عزت دشمن اور اسلام کش مظاہروں کی دشنام طرازی کا طائفہ قادیانی نوجوانوں پر مشتمل تھا۔ اس کی قیادت ربوہ کے فرستادہ افراد کرتے تھے۔

(۱۳) جب بنگلہ دیش بن گیا، تو اپنے مکانوں پر چراغاں کیا، شیرینی بانٹی اور دلا جوانہ در ربوہ میں رقص کیا۔

(۱۴) مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے برسر اقتدار آتے ہی دو کام شروع کیے۔ اول ان کی فراست کو زیب دیکر اپنا راستہ ہموار کرنا چاہا (۲) کہ استعماری طاقتیں انہیں پاکستان کا دماغ سمجھیں اور ان کی قیمت

بڑھتی رہیں اور اس سلسلہ میں ان کے پیچھے علمی اسرائیل قائم ہو جائے۔ دوم جس کے لیے وہ کوشاں تھے وہ مبلغین یا پارٹی کے ہاتھوں دایاں بازو کی اسلامی شخصیتوں اور فکری تحریکوں کا استیصال تھا، لیکن صورت حال اس طرح پلٹی کہ میرزائیت کا "صیہونی چراغ" جو اسلام کے طاق پر "روشن" تھا، ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

* * *

چٹان نے تحریک پیدا کی

تحریک راست اقدام ۱۹۵۳ء کے اختتام سے لیکر مارشل لاء ۱۹۵۸ء کے آغاز تک میرزائی اپنے سیاسی خاکوں میں رنگ بھرتے اور معاشی منصوبوں کو پروان چڑھاتے رہے۔ اس سلسلہ میں حکومت کی ارتقی بدلتی صورت حال کا نقشہ آ چکا ہے۔ میرزائیوں نے ہر دور کے مطابق اپنی چال قائم رکھی۔ ایوب خاں کا طویل دور ان کے لئے تحفظ کا موجب ہو گیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں عوام کا پانسہ پلٹ کر ہندوستان کی طرف ہو گیا۔ وہ اندرونی دشمن کو بھول گئے۔ ان کی نگاہیں بیرونی دشمن پر جم گئیں۔ میرزائی مطمئن تھے کہ ایوب خاں کا دور ان کا معاون و مددگار رہے اور حکومت کی شطرنج پر انہی کے مہرے چل رہے ہیں۔ انہوں نے خواص کی اکثریت میں پہلے سے ایک ایسا ذہن پیدا کیا کہ ان کے خلاف جو کچھ کہا جاتا ہے وہ ملاؤں کا ادعائی خروش ہے۔ میرزائی خود چاہتے تھے کہ علماء ان پر مذہبی تنقید کرتے رہیں اور وہ حکومت سے ہم آغوش ہو کر اپنے تئیں منظم کرتے جائیں۔ مولانا تاج محمود نے لولاک میں ربوہ کی سیاست کاری پر نقد و نظر کو ملحوظ و مقدم رکھا لیکن میرزائی ایوب خاں کی فضا میں اس قدر مستحکم ہو چکے تھے کہ ایسی ہر تنقید سے خود کو بالا سمجھتے ادھر ڈیفنس آف پاکستان رولز نے انہیں تحفظ دے رکھا تھا۔ نواب کالا باغ نے ماتم کر بنایا تھا کہ میرزائی جرنیلوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کو داؤں پر لگا دیا تھا۔ راقم نے میرزائیت کا ہر حقیقی سیاسی

مطالعہ کیا۔ اس کے سوانح افکار کی پوری روداد معلوم کی۔ پھر ۳۰ اپریل ۱۹۷۴ء کو چنیوٹ (جس سے ربوہ متصل ہے) میں ایک عظیم الشان جلسہ کو خطاب کیا اور ان تمام حقائق کی چہرہ کشائی کی جو اب تک صیغۂ راز میں تھے۔ راقم نے ایوب خان سے عرض کیا کہ "میرزائیت کی تاریخ سیاسی دجالیت کی تاریخ ہے۔ میں ہر چیز اپنی ذمہ داری سے عرض کروں گا اور اگر کوئی بات غلط ہو تو اس کی تصحیح کے لیے ہر لحظہ حاضر ہوں۔ اس جلسہ کے سرکاری رپورٹر کی معرفت گورنر پنجاب اور گورنر پنجاب کی وساطت سے صدر مملکت تک اپنی معروضات پہنچانے کا متمنی ہوں۔ میرزائی پاکستان میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے اور اپنے لیے بھی اسرائیل بنانے کے لیے مغرب کی استعماری طاقتوں کے آلۂ کار ہیں۔ میرزائی نہ صرف یہ کہ پیغمبرِ استعمار کی سیاسی امت ہیں بلکہ بقول اقبالؒ، احمدیت یہودیت کے قریب تر ہے۔ راقم نے انہی دنوں لکھا کہ سر ظفر اللہ خان انگریز کی شخصی یادگار ہیں۔ یہ اس خبر کے تبصرہ کا عنوان تھا۔ جو ۳ نومبر ۱۹۵۸ء کے مشرق میں شائع ہوئی کہ افریقہ میں کیپ ٹاؤن کے ۳۰ ہزار مسلمانوں نے سر ظفر اللہ خان کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔

راقم کی اس تقریر اور چٹان میں مطائباتی و تمثالی اشعار سے میرزائی امت بوکھلا گئی۔ روزنامہ الفضل کے ایڈیٹر روشن دین تنویر نے راقم کو زندیق لکھا۔ اس پر راقم نے میرزا بشیر الدین محمود سے سوال کیا آپ بزعم خویش "مسیح موعود" کے "مصلح موعود" صاحبزادے ہیں۔ آپ کے یا روشن دین تنویر کے پاس کوئی شہادت یا دستاویز ہے تو سامنے لائیے اور ثابت کیجیے کہ آپ سچے ہیں۔ ارشاد ربانی یہ ہے کہ کسی پر اتہام نہ لگاؤ اور ایسا الزام گھڑو جس کا تمہارے پاس ثبوت نہیں۔ میرزا بشیر الدین محمود نے چٹان کے جواب میں الفضل کے صفحہ اول پر اپنے قلم سے مضمون لکھا اور راقم سے معافی مانگی کہ الفضل کے ایڈیٹر نے بلا ثبوت الزام عائد کیا ہے۔ راقم نے اس کے فوراً بعد ربوہ کا "راسپوٹین" کے عنوان سے اداریہ لکھا جس میں میرزا بشیر الدین محمود کی تصویر کھینچی کہ وہ کن معصیتوں کا مجموعہ ہے۔ ربوہ تو مہر بلب ہو گیا لیکن لاہور میں اپنے ایک ہفتہ وار کو میرزا غلام احمد کی سنت کے مطابق گالیاں بکنے پر مامور کر دیا۔ پاکستان میں بیسیوں ہفتہ وار، روزنامے اور ماہنامے قادیانیت پر معترضانہ قلم اٹھاتے اور جید علماء کی ایک قطار اس کی چھتاڑ کرتی۔ لیکن ان سے متعلق قادیانی کبھی حساس نہیں ہوئے۔ بلکہ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کے تماشہ دیکھتے۔ لیکن چٹان کی ہر تحریر اور راقم کی ہر تقریر سے قادیانی امت پر رعشہ طاری

۱۔ ملاحظہ ہو عجمی اسرائیل از شورش کاشمیری

بر جاتا اور بدنامیوں کے دھبے لگا دیتی۔ راقم نے علامہ اقبال کے افکار کی اساس پر مرزائیت کی سیاسی تاریخ کو منضبط کر کے پیش کیا اور اس مقصد کے ان تمام حقائق کو بے نقاب کیا جو عوام کے سامنے نہیں تھے مثلاً اسرائیل میں قادیانی مشن اور اس کے عزائم، کیا مرزائی اسرائیلی ہیں؟ قادیانی مسلمانوں پر عربوں کی شکست پر چراغاں، افریقہ کے مرزائی مشن کا جاسوسی چہرہ، مرزا ناصر احمد کے سفر یورپ کی حقیقی غایت۔

علامہ اقبال نے مرزائیوں کے متعلق اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ میں نے انہیں حضور سرور کائنات کے متعلق بے ادب پایا اور آنحضرتؐ کے بارے میں ان کی زبان سے گستاخانہ کلمات سنے ہیں۔ راقم نے خدام الاحمدیہ ربوہ کے ماہنامہ خالد (جولائی ۱۹۵۹ء) سے مرزا غلام احمد کے چشم و چراغ مرزا رفیع احمد کی تقریر نقل کی۔ اس کا عنوان تھا "ہمارا مقصد یہ ہے کہ بعثت سے چھوٹے چھوٹے محمد پیدا کریں"

حکومت چوکنا ہوتی، لیکن اس کا حال سب سے مغروروں کے تحت جانے رشتوں نہ پاسنے ذہنوں کا تھا۔ اس کے سیکولر ذہن نے یہ بھی ہضم کیا کہ اس وقت سیکولر ذہن ہی حکومت کا مالک ہو گئے تھا۔ راقم حکومت کی پیدا کی ہوئی سیاسی گھٹن اور اس کے حواریوں کی بے ضمیری پر آواز ... نوک جھونک کرتا تو قادیانی گماشتے ایوب خان کو انگیخت کرتے اور کسی نہ کسی کارروائی پر آمادہ کرتے۔ چٹان کے سرکاری اشتہارات تو شروع سے بند تھے جن مستغنی و تجارتی اداروں سے کوئی اشتہار مل رہا تھا، وہ بھی بند کرا دیئے گئے حتیٰ کہ ادارہ چٹان میں ایک مستقل افسر پیدا کیا گیا۔ اس کا مشاہرہ دو سو روپے سے پانچ سو روپے تک پہنچا۔ اس نے حکومت کو چٹان پرنٹنگ پریس کے متعلق لکھوں کی ایک فہرست مہیا کی ۔ ایوب خان کے وزیر خزانہ نے انہیں پیغام دیا کہ چٹان سے ہاتھ اٹھا لیں، جس کسی اخبار یا رسالے نے چٹان پریس میں چھپائی کے لیے درخواست کی وہ نامنظور کی گئی۔ اس سے کہا گیا کہ دوسرے کسی پریس میں انتظام کرلو، لیکن سرکاری دانشوروں کو اندازہ ہی نہ تھا کہ ؎

لوگ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

یا پھر مولانا الطاف حسین حالی کے الفاظ میں ؎

قمری جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے ذوق جرم یہاں ہر سزا کے بعد

ایوب خان اپنی دھن کے انسان تھے، انہیں بالخصوص قادیانی عقائد سے کوئی واسطہ نہ تھا، لیکن وہ سیاست کے ایسے نرغہ میں تھے کہ مرزائی نواز ہوتے گئے۔ ان کا ملٹری سیکرٹری جو ان کے ساتھ رہا وہ بعض روایتوں کے

مطابق قادیانی تھا۔ ایم۔ایم احمد نے ایوب کی بعض خواہشوں اور چاہتوں کے ارد گرد خود سپردگی کا حلقہ باندھ رکھا تھا۔ وہ اقتصادی منصوبہ بندی کا ڈپٹی چیئرمین ہونے کی حیثیت میں ان کے بیٹوں کی مدد کرتا اور اس طرح اپنی جماعت کے لیے تحفظات حاصل کرتا۔ مختصر یہ کہ مرزا غلام احمد کے اُمتی ایوب خاں کی سیاسی ضرورت تھے۔ نواب کالا باغ قادیانیت کو تجربتہً جان چکے تھے۔ ان کے متعلق نجی محفلوں میں سخت سے سخت تنقید کرتے اور سیاسی و مذہبی اعتبار سے انہیں ملک و ملت کے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ ان کے زمانہ میں مرکز کی ہدایت پر چٹان کو بسلسلہ قادیانیت کئی دفعہ وارننگ دی گئی لیکن چٹان ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ہمیشہ منہ توڑ جواب لکھوا دیتا کہ سب کچھ گوارا ہے۔ لیکن مرزائیت سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ اسلام و پاکستان دونوں کے غدار ہیں۔ نواب کالا باغ سبکدوش ہو گئے تو جنرل موسیٰ گورنر ہوئے وہ اس مسئلہ کو بالکل نہ سمجھتے تھے۔ مرزائیوں نے افسرانِ مجاز سے مل بھگت کر کے چٹان کے خلاف سرکاری تنبیہوں کا تانتا لگوا دیا لیکن راقم ہر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا ہوم سیکرٹری کو ٹکا سا جواب دیتا رہا۔ کہ وہ ایک کاز امت کے لیے کسی وارننگ کی زحمت نہ کریں۔ ایڈیٹر چٹان کا فرض ہے کہ اس امت کے اعمال و افکار پر نگاہ رکھے۔ ان کی حرکات شنیعہ سے حکومت کو مطلع کرے اور مسلمانوں کو بتاتا رہے کہ مرزائی کیا ہیں اور کیا نہیں؟ ایک دفعہ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر لاہور نے اس سلسلہ میں راقم کو بلایا تو اتفاق سے مولانا کوثر نیازی بھی کسی سلسلہ میں وہاں تھے۔ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر مرزائیوں کے عہد کی یادگار تھا۔ راقم نے اس درشتی سے جواب دیا کہ وہ راقم کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ راقم نے کہا اگر گورنمنٹ اس قسم کی تنبیہوں سے کیا چاہتی ہے؟ راقم ان تنبیہوں کو ٹکا وقعت نہیں دیتا۔ حکومت بزدلی نہ برتے۔ مقدمہ چلائے تاکہ افسانہ و حقیقت کھل جائیں۔ راقم سے مولانا کوثر نیازی نے کہا کہ اس جرأت کے نمونے قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں تھے۔ ہم اسی لب و لہجہ میں حکومت کو مسئلہ کی اہمیت کا احساس دلا سکتے ہیں۔

راقم نے محسوس کیا اور بھانپ لیا کہ مرزائی فتنہ بے قابو ہو چکا ہے اور ایوب خاں کو سیاسی مغالطہ دے کر ان تمام عناصر کو مروانا چاہتا ہے جو اس کے متعلق عوام میں احتساب قائم کیے ہوتے ہیں۔ مرزائیوں نے صدر ایوب اور گورنر موسیٰ سے مل بھگت کر کے یکم اپریل ۶۵ء کو ہوم سیکرٹری پنجاب کے دستخطوں سے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت تمام ایڈیٹروں، پرنٹروں اور پبلشروں کے نام اس امر کا حکم جاری کروا دیا کہ آئندہ کوئی ایسی تحریر نہ چھاپی جائے جو کسی فرقے کے عقائد و افکار اور الہام و اعمال سے متعلق ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ قادیانی اُمت کی حمایت و حفاظت کے لیے احمقانہ اقدام تھا اور اسلام دشمنی گوئی۔۔
پی وی ۔۔۔۔۔۔۔۔ کا لفظ پہلی دفعہ اشتہار میں شامل کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے انگریزوں نے بھی اپنے کسی
دورِ حکومت میں اس قسم کی حماقت نہ کی تھی لیکن ایوب خان کے عہد میں اس حماقت کا آغاز ہوا حتیٰ کہ اس زمانہ
کے انسپکٹر جنرل پولیس کو بھی تقریریں کرنے کا شوق چرایا۔ اس نے کئی اضلاع میں علماء کو اپنے مخصوص لب و لہجہ
میں دھمکانا شروع کیا۔ راقم نے ۱۱۔ اپریل ۱۹۶۷ء کے شمارے میں "المرشد" کے زیر عنوان ایک مختصر شذرہ لکھا۔
جو نوائے وقت کے ایک مکتوب کی بنا پر تھا کہ اس فرقہ کے متعلق حکومت کو غور کرنا چاہیئے۔ جو عرب ممالک میں
ہمارے خلاف بدگمانی پیدا کرنے کا باعث ہو رہا ہے۔ ان چند الفاظ کے سوا اس شذرہ میں اور کچھ نہ تھا۔ حکومت
جوش میں آگئی۔ اس نے ایک آدھ دن بعد ہی قانون کے پل نکال کر ۲۰۔ اپریل کو نہ صرف پرچہ ضبط کیا بلکہ
"چٹان" کا ڈیکلیریشن منسوخ کر ڈالا اور چٹان پریس بھی ضبط کر لیا۔ اس سلسلہ کا یہ پہلا اقدام تھا۔ راقم نے
انتہائی حقارت سے احکام وصول کئے اور پوری جرأت سے حکومت کے ساتھ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ راقم نے
ان احکامات پر جو فقرے کسے وہ حکومت کے رخسارِ نازک پر زنانے کا طمانچہ تھے۔

راقم نے ۲ مئی کی شب کو جمعیۃ العلمائے اسلام کانفرنس میں مرزائیت کے خلاف معرکہ آرا تقریر کی۔ جو
سوا تین بجے شب تک جاری رہی۔ اگلے روز ۳ مئی کو حکومت نے آغازِ شب کے تھوڑی دیر بعد راقم کو ڈیفنس
آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر لیا۔ سنٹرل جیل ڈیرہ اسماعیل خاں بھجوا دیا اور سی کلاس میں رکھے جانے کا
حکم دیا۔ یہ تمام کہانی راقم کی کتاب موت سے واپسی میں دیکھئے۔ اس کا مختصر سا ذکر پہلے بھی آچکا ہے خلاصہ
یہ ہے کہ:

۱۔ گورنر موسیٰ اثنائے سفر ہی میں راقم کو مروا دینا چاہتے تھے۔

۲۔ ڈیرہ اسماعیل خاں سنٹرل جیل میں راقم کو پھانسی کے دہرے سیل (۔۔۔) میں رکھا گیا۔ جہاں
ساتھ کے (۔۔۔) میں ایک مغلوب الغضب قبائلی تھا۔ اس کی تمام اپیلیں خارج ہو چکی تھیں اور تقریباً ہفتہ
کے بعد پھانسی پانے والا تھا۔ ایوب خان نام کا ایک بے ضمیر شخص جیل کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ
گورنر کے اشارے پر راقم کو مروا دینا چاہتا ہے۔ اس مغلوب الغضب قبائلی کو اس نے یقین دلایا کہ وہ رہا
کر دیا جائیگا اگر اپنے ساتھ والے بدمعاش کو زندگی کے گھاٹ اتار دے۔ جیل کے اندر سے خبر پھیلی۔ ایک تو
ڈیرہ اسماعیل خاں کے زندہ دل لوگوں نے مقامی علماء کی زیر سرکردگی اعلان کر دیا کہ شورش ہمارا مہمان ہے

اگر اسے کوئی ضعف پہنچا تو وہ سپرنٹنڈنٹ کی جان لے کر حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے - دوسرے جیل خانہ کے میڈیکل افسر ڈاکٹر نیازی مسلمان طبیعت کے انسان تھے - انہیں راقم سے رسالت مآب کے صدقے دینی تعلق اخلاص تھا - تیسرے راقم نے ہائی کورٹ کو تار بھجوا دیئے کہ راقم کی زندگی سخت خطرے میں ہے اور حکومت راقم کو ختم کروانا چاہتی ہے - اس پر ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ مشتمل بر جسٹس خان بشیر الدین خان اور جسٹس شیخ شوکت علی نے سختی سے نوٹس لیا -

مولانا صلاح الدین ایڈیٹر "ادبی دنیا" کے فرزند مسٹر وحید الدین ڈیرہ اسماعیل خان میں کمشنر تھے - انہوں نے ایوب خان سپرنٹنڈنٹ جیل کو ڈانٹ کر ٹھیک درست رکھا -

۳- جب ہائی کورٹ کے حکم پر راقم کو سنٹرل جیل کراچی منتقل کیا جانے لگا تو سپرنٹنڈنٹ جیل نے گرد کے کارندوں سے مل جگت گر کے بیٹوں اور کالا باغ کے راستہ میں راقم کو گولی سے اڑا دینے کا تہیہ کیا - اس سپرنٹنڈنٹ جیل کا گھر بنوں ہی میں تھا - سفر کے لیے آدھی رات کا وقت طے کیا گیا اور اس غرض سے ایک قادیانی انسپکٹر یا سب انسپکٹر مقرر ہوا - گورنر موسیٰ فوجی ہونے کے باعث حوصلہ شدہ انسان تھے ان کے زمانہ میں پولیس نے بعض معروف بدمعاشوں کو گولیوں سے بھونا اور بیان یہ کیا تھا کہ وہ فرار ہونے کے لیے پولیس مقابلہ پر اتر آئے تھے - راقم کے متعلق یہی پلان تھا کہ نصف شب کو پولیس وین میں سوار کر کے بنوں کی طرف کے ویرانہ میں گولی مار دی جائے - اور اعلان کیا جائے کہ قیدیوں کی گمنام فائرنگ سے نظربند ہلاک ہو گیا ہے - راقم کو اس راز سے جیل کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے آگاہ کیا - وہ قاضی عطاء اللہ جان شہید (خان وزارت کے وزیر مالیات) کا رشتہ دار تھا - اس کا ایک بھائی سرخپوش تحریک میں رہا اور اسی جیل میں بھوک ہڑتال سے شہید ہوا تھا - اس نے سیاسی پس منظر کی شرافت کے تحت راقم کو سپرنٹنڈنٹ کی بدنیتی سے آگاہ کیا - راقم چوکنا ہو گیا - جب پولیس نصف شب کے لگ بھگ راقم کو لینے آئی تو راقم نے انکار کر دیا - سپرنٹنڈنٹ کی بے عزتی کی اور اس کو دھمکایا کہ اس کے خفیہ ارادوں کی اطلاع میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو دے چکا ہوں - نتیجۃً بخلاصی ہوئی -

۴- راقم کو اگلے روز صبح کے وقت ہوائی جہاز کے ذریعہ ڈیرہ اسماعیل خان سے کراچی بھیجا گیا - کراچی میں جیل کا عملہ اخلاق و شرافت کی قدروں سے واقف تھا اور سپرنٹنڈنٹ جیل ایک پڑھا لکھا خاندانی شخص تھا - اس نے ہر چیز قانون کے مطابق کی -

راقم نے اس جیل میں مختلف مطالبات کے لیے بھوک ہڑتال کرکے حکومت کو اس طرح زچ کیا کہ ایوب خاں اور گورنر موسیٰ اندر خانہ ہل گئے، لیکن کچھ دیر اپنی انا کو پالتے رہے۔

۵۔ گورنر موسیٰ راقم کو ہمیشہ کی نیند سلا دینا چاہتا تھا۔ راقم سول ہسپتال کراچی میں تھا تو اس نے ڈاکٹر امیر محمد خاں ہیلتھ سیکرٹری کی معرفت راقم کے معالج پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد سے کہا کہ شورش کاشمیری کو چلتا کرو، گورنر آپ کی ترقی کا خواہاں ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دیا میں ڈاکٹر ہوں ہم لوگ خدا سے عہد کرتے ہیں۔ ہمارا کام جان بچانا ہے جان لینا نہیں، میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کو خریدنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

مسٹر ایس۔ اے۔ حق (سی۔ ایس۔ پی) سابق چیف سیکرٹری، مغربی پاکستان کے اس بیان کا اقتباس معہ ترجمہ "موت سے واپسی" میں درج ہے (ص ۱۳۱) جس میں انھوں نے گورنر موسیٰ کے اس ارادہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ جسٹس شوکت علی کی ایک دستاویز بھی معہ ترجمہ نقل کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اور ان کے فاضل ساتھی کو راقم کے مقدمہ میں کیونکر تنگ کیا گیا اور کس دباؤ کے تحت صوبہ کی سب سے بڑی عدالت کے دو فاضل ججوں سے کہا جاتا رہا کہ وہ شورش کاشمیری کے مقدمہ کو خارج کردیں۔ جسٹس بشیر الدین نے بھی نوائے وقت میں راقم کی تصنیف موت سے واپسی پر ایک مضمون لکھ کر گورنر کے اس دباؤ کا ذکر کیا۔

۶۔ ایک دوسرے جج نے چٹان کے ڈیکلریشن کی بحالی کا فیصلہ صادر کرتے ہوئے قادیانیت کے مسئلہ پر مرزائی امت کو انسانی اقدار کے مفروضہ پر جو سہارا دیا، وہ قادیانیت نے اپنی حیات مستعار کے لیے استعمال کیا لیکن اس فیصلہ سے عامۃ المسلمین پر اتنا اثر بھی نہ ہوا، جتنا ماش کے دانے پر سفیدی ہوتی ہے۔

۷۔ حکومت نے مرزائیت کی حوصلہ افزائی کے لیے نہ صرف یہ کہ قانون و عدالت کے مسلمات سے روگردانی کی بلکہ اس کی ڈھٹائی کا یہ عالم تھا کہ جب کئی ماہ کی طویل اڈجرنمنٹوں کے بعد کراچی میں راقم کا مقدمہ شروع ہوا تو راجہ سعید اکبر ایڈووکیٹ جنرل نے بنچ کے روبرو بیان دیتے ہوئے کہا کہ مرزائی مسلمانوں میں سے ہیں۔ جسٹس بشیر الدین خاں نے پوچھا، کون کہتا ہے؟

ایڈووکیٹ جنرل نے کہا: ہائی کورٹ کا فیصلہ ہے۔

فاضل جج نے پوچھا: کس ہائی کورٹ کا؟

ایڈووکیٹ جنرل نے کہا: اسی ہائی کورٹ کا۔ پٹھان کے ڈیکلریشن کی اپیل میں۔

جسٹس بشیرالدین نے ماتھے پہ ایک معنی خیز شکن ڈالی اور فرمایا ہم اس فیصلہ کے پابند نہیں۔ ایڈووکیٹ جنرل نے حکومت کو مطلع کیا کہ جج صاحبان کو اپنے ڈھب پر لانا مشکل ہے۔ حکومت نے اس کو عدالت کی توہین کر دینے کے لیے کہا۔ اس نے اگلے روز ۱۸ دسمبر کو سرکاری نمائندے کی حیثیت میں توہین عدالت کا ارتکاب کیا۔ بنچ دستبردار ہو گیا۔ یہ ایڈووکیٹ جنرل کا ایک ایسا گھناؤنا جرم تھا کہ برطانوی عہد سے لے کر اس دن تک اس کا تصور ہی ناممکن تھا۔ تمام عدالت میں سناٹا چھا گیا اگلے روز ملک کے اخباروں نے (سرکاری اجیروں کو چھوڑ کر) اس واقعہ کا نوٹس لیا۔ کئی ایک نے اداریے لکھے، لیکن حکومت کی آنکھ کا پانی مر چکا تھا۔ اس کے کانوں پہ جوں تک نہ رینگی۔ راقم نے ایڈووکیٹ جنرل کا اس شدت سے محاسبہ کیا کہ مفرور ہو گیا۔ حکومت نے شاید اتنی طلاحیاں کبھی نہ سنی ہوں۔ جتنی اس دن ہائی کورٹ کے احاطہ میں گونج رہی تھیں۔

راقم سول ہسپتال کراچی میں زیر علاج تھا۔ عدالت سے لوٹتے ہی احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دی۔ افسروں کا تانتا بندھا کہ بھوک ہڑتال چھوڑ دو حکومت رہا کرنے کو تیار ہے۔ راقم نے کہا حکومت چھوڑ دے، بھوک ہڑتال خود بخود ختم ہو جائے گی۔ آخر آٹھویں دن ۲۵ دسمبر کو حالات کی نزاکت دیکھ کر اور عوامی تحریک کی پروازوں سے سراسیمہ ہو کر حکومت سپرانداز ہو گئی۔ راقم کو ۲۵ دسمبر کو گیارہ بجے صبح رہا کر دیا۔ مرزائیت کا چہرہ اتر گیا۔ ملک کے تمام علماء مشائخ اور رہنما اس سلسلہ میں احتجاج کر رہے تھے۔ راقم کئی روز بعد کراچی سے لاہور روانہ ہوا تو ہر اسٹیشن پہ عوام کے بے پناہ استقبالی ہجوم سے اندازہ ہوا کہ لوگوں کے جذبات کیا تھے اور کیا ہیں؟ راقم کی بھوک ہڑتال نے تمام اضلاع کو سلگا دیا تھا اور قادیانیت کے بارے میں ان کے دیرینہ جذبات جاگ اٹھے تھے۔ ہر اسٹیشن پر راقم کا محض استقبال ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ اس جذبہ و تحریک پر صاد کیا جا رہا تھا جو مسلمانوں کے دل میں اجتماعی طور پر نقش تھا اور وہ قادیانی جماعت کو مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کے لیے متحد العمل تھے۔ یحییٰ خان اقتدار میں آئے تو اپنی روایت کے مطابق مرزائی ان کے ساتھ ہو گئے، لیکن مرزائی پہلے کی طرح ان کے تابع مہمل نہ تھے بلکہ عالمی استعمار اور صیہونی اقتدار کے بل پہ ہاتھ پاؤں پھیلا رہے تھے۔ یحییٰ خان بھی عالمی استعمار کا ایجنٹ تھا

اور قادیانی ہیں؛ دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے کیونکہ دونوں کو ایک ہی مشن سونپا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے کٹوا دیں۔ دونوں نے یہی فرض انجام دیا، لیکن دونوں میں اندر خانہ جھگڑا بھی تھا۔ یحییٰ خاں سمجھتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی جماعت نہیں اور قادیانی بجائے خود ایک جماعت ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ انتخاب کے دوران یحییٰ خاں نے سی۔ آئی۔ ڈی کی معرفت مرزائیوں کے خلاف ہینڈبل چھپوائے، لیکن ان لوگوں کے سپرد کئے انہوں نے راقم کی اطلاع کے مطابق تقسیم کرنے کی بجائے قادیانی زعیموں کے ہاتھ فروخت کر دیئے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ مرزائی اپنے خلیفہ کے ساتھ پیپلز پارٹی کی داشتہ ہو گئے۔ اس سے ان کا ازلی عقیدہ باندھ لیا انہیں یقین تھا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق پیپلز پارٹی کو استعمال کر کے اپنا راستہ صاف کر سکیں گے اور اس کی طاقت کے بل پر اپنے مخالفوں کو ٹھکانے لگا دیں گے۔

وائس ایر مارشل ایم۔ اختر نے جو ایک مشہور قادیانی تھا، تمام پاکستان کو اپنے اس اعلان سے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ اس نے پاکستان ایر سروسز کے نام پر ایک نجی ادارہ قائم کیا ہے جو پاکستان کے تمام دوست ممالک کو ہوا بازی کے تربیتی ادارے قائم کرنے میں مدد دیگا۔ وائس ایر مارشل اختر نے نامہ نگار پریس کو بتایا کہ اس ادارے کی معرفت افرادی قوت کے علاوہ تربیت یافتہ ماہرین بھی مہیا کئے جائیں گے۔ روزنامہ جنگ کراچی نے ۱۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو یہ خبر شائع کی۔ راقم نے ۲۹ مارچ ۱۹۷۱ء کے چٹان میں اس پر ایک طویل اداریہ لکھا، جس میں حکومت کو توجہ دلائی کہ اس ادارہ کو روک دیا جائے، کیونکہ اس قسم کی فوجی تربیت عسکری مفاد کے منافی ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں کہ وائس ایر مارشل ایم۔ ایم۔ اختر عرب ممالک میں قادیانی نوجوانوں کو بھیج کر اسرائیل کی اغراض کے مددگار بننا چاہتے ہیں۔ اس اداریہ کا نتیجہ نکلا کہ ادارہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی مر گیا اور عرب ممالک اپنے سفارت خانوں کی معرفت اس سے چوکنا ہو گئے۔

مسٹر بھٹو نے ۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کو عزیز بھٹی کے مقام شہادت پر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے شہداء کو خراج ادا کرتے ہوئے شاعرانہ ترنگ میں فرمایا کہ لفٹیننٹ جنرل اختر ملک کی یادگار بننی چاہیئے۔ اگر یہ اب نہ ہوا تو جب پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئیگی ان کی یادگار ضرور قائم کرے گی۔

(پاکستان ٹائمز ۹ ستمبر ۷۱ء کالم ۵)

راقم نے ۱۰ ستمبر کے چٹان میں طویل اداریہ لکھا کہ جنرل اختر حسین ملک ایک مرزائی تھے وہ جنگ

بیت کام نہیں آئے بلکہ ترکی میں شاہراہ کے حادثہ سے مرے تھے۔ ان کی نعش کو ترکی سے ربوہ پہنچایا گیا بلکہ مرزا ناصر احمد نے "بہشتی مقبرہ" میں دفن نہ ہونے دیا اور ان کے اعزہ منہ تکتے رہ گئے۔ مسلمان اپنے ملک میں ایک میرزائی کی یادگار قائم نہ ہونے دیں گے۔ آج تو نہیں یہ اعزاز کیوں بخشا جا رہا ہے۔

اس اداریہ سے بعض میرزائی افسر بگڑ گئے اور فون پر اپنے بے تابانہ غصہ کا اظہار کیا۔ پاکستان ٹائمز نے خطوط کے کالموں میں اس قسم کے خط شائع کئے جن میں راقم کو برا بھلا کہا گیا اور جنرل اختر حسین ملک کی شان میں قصیدے لکھے گئے۔ پھر جب مسٹر بھٹو دسمبر ۱۹۷۱ء میں برسر اقتدار آئے تو میرزائیوں نے پیپلز پارٹی کی سیاسی نارسائیوں کو استعمال کیا، بعض وزراء کے اشتراکی ذہن سے فائدہ اٹھایا کئی فوائد حاصل کئے۔ جن جماعتوں سے سرکاری افسر نکالے گئے ان سے قطع نظر کہ وہ خطا کار تھے یا نہیں، لیکن سبکدوش ہونے والوں میں ایک بھی افسر قادیانی نہ تھا۔ دوسرا ایک بڑا ستم یہ ہوا کہ بعض بڑے فوجی عہدوں پر قادیانی پہنچ گئے انہوں نے اپنے ہم عقیدہ افراد کی بھرتی جنداامیان بنالی۔ اس طرح سیکرٹریٹ کے عملے اور نامت فوائد کے علاوہ کئی ایک خود مختار سرکاری اداروں میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ نوبت بایں جا رسید کہ اہم سے اہم محکمہ ان کے تصرف میں آگیا۔ میرزائی اپنے متوقع اقتدار کا چرچا کرنے لگے۔ چٹان نے اپنی مہم تیز کر دی۔ میرزائیت کی سازشی حرکتوں اور اندرونی تیاریوں کا گھر گھر ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔ اپنی آواز کو ہر ہفتہ تیز کیا۔ نتیجۃً ایک زبردست ذہنی تحریک پیدا ہو گئی۔

راقم کا عقیدہ ہے کہ جب خدایان عشق رسالت کی صفیں کمزور پڑ جاتی ہیں تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دستگیری کرتے اور اپنی ختم المرسلینی کا تحفظ فرماتے ہیں۔ پاکستانی فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل ظفر چوہدری سخت گیر طبیعت کے متعصب قادیانی تھے۔ انہوں نے فضائیہ کو اپنے ہم عقیدہ اشخاص کی ملک بنانے کا عزم کر رکھا تھا۔ اس غرض سے وہ سبھی کچھ کرتے۔ مثلاً امریکہ وغیرہ تربیت کے لیے کسی فضائی نوجوان یا افسر کے بھیجنے کا سوال پیدا ہوتا تو قادیانی کا چناؤ کرتے۔ انہی کو فضائیہ کے اہم شعبوں میں لگاتے، عرب ریاستوں میں بھجواتے۔ ایئر مارشل ظفر چوہدری کا نے میرزائی افسروں کی ترقی کا راستہ ہموار کرنے کے لیے بہت سے مسلمان فضائی افسروں کو نام نہاد سازش کے مقدمہ میں پھنسا کر کورٹ مارشل کی بھینٹ چڑھا دیا۔ ان میں وہ نوجوان بھی تھے جنہوں نے ہوا بازی کے جوہر سے معرکے سر کئے تھے۔ ان نوجوانوں کو طویل سماعت کے بعد لمبی لمبی سزائیں دی گئیں۔ انہوں نے سماعت کے دوران عدالت میں

قادیانیت کا پردہ چاک کیا اور ظفر چوہدری کے مذموم ارادوں سے نقاب اٹھائی۔ ایک فضائی افسر نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو تک رسائی حاصل کی اور انہیں ظفر چوہدری کے اغراض خبیثہ سے آگاہ کیا۔ اس کی زیر و زبر روداد سن کر مسٹر بھٹو حیران رہ گئے۔ اسی دوران ظفر چوہدری یا اُن کے کسی ہم عقیدہ نائب نے [illegible] کو ربوہ کے سالانہ جلسہ پر طیاروں کی ایک ٹکڑی کو سلامی دینے کے لیے بھیجا۔ اس ٹکڑی نے مرزا ناصر احمد کو اپنے عسکری انداز میں سلام کیا۔ مولانا تاج محمود کے پاس خبر پہنچی۔ انھوں نے فون پر راقم کو مطلع کیا۔ راقم نے چٹان میں قلم اٹھایا۔ انکوائری ہوئی تو خبر صحیح نکلی۔ حکومت نے ضابطہ کی سرزنش کی۔ ظفر چوہدری ۱۹۷۱ء کی جنگ کے نقصانات بہ پردہ مسٹر ایم۔ ایم عالم کو ملک سے نکال دینا چاہتے تھے تاکہ ان کے بعد قادیانی افسروں کی زنجیر پیوستہ رہے اور اس کے مطابق قادیانی افسر یکے بعد دیگرے ترقی پاتے رہیں۔ جب مسٹر بھٹو ان حقائق سے آگاہ ہو گئے تو ان کی شخصیت متحرک ہو گئی۔ انھوں نے ایئر مارشل ظفر چوہدری کو رخصت کر دیا۔ یہ قادیانی امت کے لیے ایک ایسا صدمہ تھا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے اور ربوہ میں تو زلزلہ پیدا ہو گیا۔ ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حتیٰ کہ فضائیہ کے ہر اسٹیشن میں شیرینی تقسیم کی گئی۔ اُدھر بری و بحری فوج میں بھی قادیانی افسروں کے خواب پراگندہ ہو گئے اور وہ قادیانی جرنیل جو جنرل ٹکا خان کے بعد اپنی سربراہی کا خواب دیکھ رہے تھے اپنی ڈوبتی ہوئی سوچ کے خلاؤں میں چلے گئے۔ قادیانی امت کی پریشانی کا یہ حال تھا کہ اوسان بحال نہیں ہو رہے تھے اور یہ پہلا موقع تھا کہ ان کے بزرجمہر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف زبان درازی پر اُتر آئے۔ انھوں نے عالمی استعمار سے رجوع کیا اور اس دوڑ دھوپ میں لگ گئے کہ ملک کے اندر آئندہ کس جماعت یا شخصیت کے ساتھ مل کر اقتدار کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کئی ایک سیاسی راہنماؤں کو اپنے تعاون کی پیشکش کی لیکن کسی جماعت یا شخصیت کے پاس ایسی زمین نہ تھی جس پر اُن کے پاؤں جم سکیں۔ مرزائیوں نے بیرونی گٹھ جوڑ سے اپنے حوصلہ کو برقرار رکھنے کے لیے کئی ایک جتن کیے۔ بعض سبکدوش جرنیلوں کے ساتھ ربوہ میں انتہائی خفیہ پلان تیار کیا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کرا دیا جائے۔ مسٹر بھٹو کو بھی اطلاع ہو گئی اور ان پر یہ حقیقت کھل گئی کہ مرزائی اور ان کا پاپا (ناصر احمد) کس داؤں پر بیٹھا۔ راقم نے چٹان کے صفحات ان کی سرکوبی کے لیے وقف کر دیئے اور ان کی تمام رازہائے سربستہ کو چاک کرنا شروع کیا۔ جو قادیانی امت کے نہاں خانۂ دماغ میں استعماری و صیہونی طاقتوں کی معرفت پرورش پا رہے تھے۔ راقم نے مرزا ناصر احمد کے سفر افریقہ اور سفر انگلستان کے احوال کا

افشا کر دیا۔ ان کے اندرونی اسرار کو تسلسل سے بیان کیا۔ ربوہ سے اس قسم کے لوگ حاصل کئے جو قادیانی امت، قصر خلافت اور ربوہ کے ہائی کمانڈ کی سرگرمیوں سے بلا ناغہ مطلع کرتے۔ اور ان کی نجات دہندہ کے مختلف گوشوں کی خبر دیتے۔ راقم نے ان احوال و حقائق کا اپنے ایک تجزیاتی پمفلٹ "عجمی اسرائیل" میں کچا چٹھا پیش کیا۔ جو ذیرھ ماہ میں ڈھائی لاکھ فروخت ہو گیا۔ حتیٰ کہ فوج کے بعض افسروں نے خرید کے عسکری نوجوانوں میں تقسیم کیا۔ اس پمفلٹ کا پورا متن ایک اندر گراؤنڈ خطرے کے تجزیہ کے زیر عنوان اپنی طرز کا واحد پمفلٹ تھا ملاحظہ ہو۔

پاکستان خطرے میں ہے داخلی اعتبار سے بھی اور خارجی اعتبار سے بھی یہ اس تاثر کا خلاصہ ہے جو پاکستان میں ہر کوئی کی زبان پر ہے۔ حزب اقتدار اور حزب اختلاف ہر دو مختلف الفاظ دونوں ہی اس کی نشاندہی کرتی ہیں! خود صدر مملکت نے بعض غیر ملکی جرائد کے وقائع نگاروں کو معنی خیز اشارات میں ان خطرات کا ذکر کیا اور ملک میں جتنی بھی سیاسی جماعتیں اپوزیشن سے منسوب ہیں وہ کھلم کھلا ان خطرات کو بیان کرتی ہیں۔ ان میں اختلاف ہے تو خطرے کی نوعیت اور اس کے تعین کا لیکن خطرے کے وجود اور امکان پر سب کو اتفاق ہے اور سبھی اس کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

بظاہر داخلی اور خارجی دونوں خطرات ایک دوسرے سے الگ الگ اور آپس میں کٹے پھٹے ہوتے ہیں، لیکن صورت حال کی اندرونی فضا خارجی اثرات کے تحت اتنی مربوط ہے کہ الگ الگ مہرے بھی ایک ہی شطرنج کے مہرے نظر آ رہے ہیں۔

خطرات کا یہ احساس جواب عوام کے دلوں میں اتر چکا ہے اولاً معاہدہ تاشقند (۱۹۶۶ء) کے فوراً بعد ملک کے خواص کو خطرناک پس پردہ رازوں کی معرفت معلوم ہوا تھا اور لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ پاکستان عالمی طاقتوں کی سیاسی خواہشوں کے نرغہ میں ہے۔ آخر مشرقی پاکستان کے (۱۹۷۱ء) الگ ہو کر بنگلہ دیش بن جانے سے سارا ملک بلکہ ساری دنیا باخبر ہو گئی کہ پاکستان عالمی طاقتوں کی سیاسی خواہشوں کا نمونہ بن چکا ہے اور اب پاکستان میں اضطراب و شورش اور تشتت و انتشار کی جو لہریں دوڑ رہی ہیں وہ تمام تر عالمی طاقتوں کے اسی طرز عمل اور پاکستان کی اندرونی سیاست کے اسی اتار چڑھاؤ کا نتیجہ ہے۔

داخلی طور پر خطرہ کی نوعیت یہ ہے کہ برسر اقتدار پارٹی (پیپلز پارٹی) جو سرحد و بلوچستان میں صوبائی نمائندگی سے محروم ہے اپنی مد مقابل سیاسی جماعت نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کو پاکستان کی مزید تقسیم کے

حالیہ پس منظر میں آلہ کار عراق اور اس کی حمایت کو سبوتاژ کر کے سیاسی تصادم کے پیش نظر امکانات پیدا کر رہی ہے۔ ادھر اس الزام کی نیپ کے حلقے تردید کرتے ہیں، لیکن پروپیگنڈا مشینری (ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات وغیرہ) پیپلز پارٹی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لیے سندھ ایک حد تک اور پنجاب بڑی حد تک نیپ کو پیپلز پارٹی کے الفاظ میں پاکستان دشمن سمجھتے ہوئے جھجکتا نہیں، بلکہ ایسا کرنا اپنی حب الوطنی کا تقاضا خیال کرتا ہے۔ پیپلز پارٹی کے شعلہ بیانوں کا اصل نشانہ خان عبدالولی خان پر گرتا ہے۔ جن کا جرم تو یہ ہے کہ وہ صدر بھٹو کی مخالفت میں شروع دن سے ثابت قدم ہیں، لیکن ان کے خلاف فرد جرم یہ ہے کہ وہ خان عبدالغفار خان کے فرزند ہیں اور خان عبدالغفار خان سرحدی گاندھی ہیں اور آزادی کے آخری لمحے تک انڈین نیشنل کانگرس کے زعما میں سے تھے وغیرہ۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کی مخاصمت کا نقطہ عروج یہ ہے کہ اول الذکر نے مرکزی اقتدار کے بل بوتے پر مؤخر الذکر کی سرحد و بلوچستان میں وزارتیں برخاست کر کے سرحد کو طالع آزماؤں کے سپرد کر دیا اور بلوچستان جو اس وقت عالمی سیاست کے نزدیک اپنے معدنی خزائن اور جغرافیائی سواحل کی وجہ سے نہایت درجہ اہمیت کا علاقہ ہے۔ نواب محمد اکبر بگتی کی گورنری کو سونپ دیا ہے۔ بگتی پنجاب سے اس حد تک بیزار رہے کہ ان کے نزدیک بھارت کے ہاتھوں پنجاب کی شکست ہی میں مغربی پاکستان یا موجودہ پاکستان کی آزادی کا انحصار تھا اور وہ اپنے ان خیالات کو کبھی چھپاتے نہیں تھے۔

پنجاب و سرحد میں موجودہ پیپلز پارٹی کی عوامی طاقت میں حیرت انگیز کمی ہو گئی ہے۔ اب اس کی طاقت کا نام صرف حکومت ہے۔ ایک دوسری حقیقت جو اس بحث میں قابل ذکر ہے وہ پڑھے لکھے طبقے یا نفوس اسلامی ذہن ہے جو پیپلز پارٹی کے خلاف ظاہر کا رجحان رکھتا ہے اور یہ رجحان شروع دن سے ہے۔ صدر بھٹو کسی وجہ سے بھی اس ذہن اور اس طبقے کو کبھی متاثر نہیں کر سکے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ پیپلز پارٹی اقتدار کے بعد اپنے سیاسی تقاضوں اور واضح غلطیوں کے باعث مقبولیت عامہ کے اعتبار سے روز بروز ماند پڑ رہی ہے۔

ملک کی موجودہ صورت کے مطابق بعض خاص عناصر جو صرف اقتدار کے پیچھے اور اقتدار ہی کے رسیا ہیں صدر بھٹو کو مختلف واسطوں سے شکست دینے کے خواہاں ہیں۔ ان کے سامنے حصول اقتدار کے لیے ہر نظریہ جائز ہے۔ ویسے وہ کبھی کسی نظریہ کے نہیں رہے۔ ان کا نظریہ ان کی اپنی ذات ہے۔ اس پر طرہ ان کے ملک میں عجیب و غریب صورت حالات پیدا کر دی ہے۔ ایک لحاظ سے ہم اس صورت حال کو نہ ختم ہونے والی جنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں، یہ لفظ دیگر

صورتحال کو ہم ان الفاظ میں مختصر کر سکتے ہیں کہ ہم اپنے پچیس سالہ دور میں ملک کی تقسیم و شکست کے بعد ایک غیر ذمہ دارانہ طور پر ہیں۔ پاکستان ایک ایسے موڑ پر آ گئے ہیں جہاں پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ٹوٹ رہی ہیں اور اس کا سیاسی استحکام روز بروز کمزور پڑ رہا ہے، جس سے عالمی طاقتوں کی سیاسی خواہشوں کو اب دوام مل رہا ہے۔

خارجی خطرہ عوام محسوس کر رہے اور خواص کو معلوم ہو چکا ہے اس کا پس منظر مختصراً یہ ہے کہ:

۱۔ بھارت نے برطانوی اقتدار کی رخصتی کے وقت پاکستان کو سیاستاً قبول کیا تھا، لیکن ذہناً کبھی قبول نہیں کیا۔

۲۔ پاکستان کو مٹانے اور جھکانے کا خیال بھارت نے شروع دن سے ترک نہیں کیا۔ ابتداً پاکستان کے روپے کی روک، مہاجرین کا بے تحاشا بوجھ، حیدر آباد کا سقوط، کشمیر پر قبضہ، لیاقت نہرو معاہدہ سے انحراف، لیاقت علی کا قتل، ناظم الدین کی سبکدوشی، محمد علی بوگرہ کی بد آمد، سکندر مرزا کی آئین کشی، ایوب خان کا مارشل لاء، ۱۹۶۵ء کی جنگ، ایوب خان کے اقتدار کا خاتمہ، مشرقی پاکستان کی بد امنی، یحییٰ کا اقتدار اور ڈھاکہ کا سقوط۔

ان سب چیزوں میں بھارت برابر کا شریک رہا، کسی میں بالواسطہ اور کسی میں بلاواسطہ۔ مثلاً لیاقت علی کے سانحہ قتل میں ہندوستان شریک نہیں تھا، مگر عالمی طاقتیں پاکستان کو جس نہج پر لانا چاہتی تھیں فی الجملہ ہندوستان کسی نہ کسی طرح ان مخفی خواہشوں میں شریک تھا۔ بالفاظ دیگر پاکستان کے معاملے میں عالمی طاقتوں کے سیاسی نقشے ہندوستان کی مشاورت سے تیار ہوتے رہے اور اب بھی ہندوستان ان نقشوں کے خاکے تیار کرنے میں جزواً یا کاملاً حصہ دار ہے۔

۳۔ عالم اشتراکیت میں روس اور چین کی آویزش سے امریکہ اور روس میں خود بخود ایک ذہنی سمجھوتہ دونوں کی بنیادوں میں دوستانہ خیر خواہی ذہنی ہو گیا۔ امریکہ کے لیے اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ روس اور چین میں ٹھن جانے سے اشتراکیت مغرب سے عملاً دستکش ہو جاتی اور اپنا ایک ہم عقیدہ ریاست، چین، سے متصادم ہو کر نہ صرف خود طاقت کی حیثیت سے تقسیم ہو جائے گی بلکہ عالمی سیاست کا نقشہ ہی پلٹ جائے گا۔ روس نے غنیمت سمجھا کہ اس طرح وہ ایشیا اور افریقہ میں اپنا اثر بڑھا سکے گا۔ عرب دنیا اس کی مٹھی میں ہو گی اور گرم پانی کے جن سمندروں اور کناروں کی اس کو تلاش ہے ان کا راستہ مل جائیگا اور روس کی مدد سے کر بلوچستان میں جیونی تک ایران و افغانستان کی سرحدوں کے بیچوں بیچ زمین کی ایک پٹی اس کے ہاتھ آ جائے گی جو

اقتصادی اعتبار سے ایک عالمی طاقت بننے کے لیے اشد ضروری ہے۔

چین اور ہندوستان کی آویزش جو اس عالمی تصادم ہی کا ایک پارٹ ہے روس اور امریکہ کی ان خواہشوں کے عین مطابق ہے۔ ہندوستان اشتراکی ہو جاتے تو ۶۰ کروڑ چینیوں کے بعد ۵۰ کروڑ کا ملک موشلزم کی گود میں چلا جاتا ہے۔ پھر سامراج کے لیے ایشیا میں کوئی جگہ نہیں رہتی۔ چین کا طوفان اس طرح روکا جا سکتا ہے کہ ہندوستان ——— اشتراکی نہ ہو اور چین سے اس کی دشمنی رہے تاکہ محاذ سید ھا عالمی طاقتوں کی طرف منتقل نہ ہو۔ ہندوستان نے روس اور امریکہ سے ہمیشہ یہی کہا کہ مضبوط ہندوستان چین کا مقابلہ اسی صورت میں کر سکتا ہے جب اس کے دو شانوں پر موجود پاکستان اس کے لیے خطرہ نہ بنا رہے۔

یہ تھا پاکستان سے امریکہ کی دغا اور روس کی دخل اندازی کا نقطۂ آغاز۔ امریکہ نے فیلڈ مارشل ایوب خاں کو جائنٹ مشترکہ دفاع پر زور دیا۔ لیکن تب عوام کی ذہنی فضا اور جماعت کی مسلسل آویزش کے باعث ممکن نہ تھا فیلڈ مارشل ایوب خاں کے اس پر راضی نہ ہونے کا نتیجہ نکلا کہ

۱۔ امریکہ کے رسوائے عالم ادارہ سی آئی اے نے پاکستان میں قدم جمانے شروع کئے۔ (اس کی مجبوراً مفصل تفصیلات ہیں (افسوس کہ اس مقالہ کا موضوع نہیں اور یہاں بھی وہ تفصیلات ایک جامع کتاب کا مضمون ہیں)

ب۔ سی آئی اے کے ایک سفارتی اہلکار نے سب سے پہلے فوج میں نقب لگانی چاہی لیکن ایک بریگیڈیر سے جو اس اہلکار کا جگری دوست تھا۔ جب ٹکا سا جواب پایا (راقم کی مصدقہ معلومات کے مطابق اس نے چینیٹ کھول کر جواب عرض کیا) تو سی آئی اے نے سی ایس پی کے افسروں کو اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے تلاش کیا۔

ج۔ مرکزی انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر جنرل کو سی آئی اے کے اس اہلکار سے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ مغربی پاکستان کے تمام تھانوں کی عوامی طاقت بندوقوں کی تعداد اور ان کے ساختہ مشینوں سے واقف تھا اور اُسے ایک عوامی انقلاب کی شکل میں ان کی اجتماعی کارکردگی کا اندازہ تھا۔

لے اس کی بعض دوسری تفصیلات بھی ہیں۔

د۔ مرکزی انٹیلی جنس بیورو نے صدر ایوب کو پشاور میں ہاشم کی فائرنگ سے قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا کہ صورت حال اس طرح بتائی جا رہی ہے (مزید نہیں کہ ہاشم بھی اس سے آگاہ ہو۔ راقم)

ر۔ اس فائرنگ کے بعد راولپنڈی چھاؤنی سے دس پندرہ میل آگے (قصبہ کا نام یاد نہیں آرہا سرکاری رپورٹوں میں محفوظ ہوگا) پشاور تک مختلف دیہات کے رنگ بغاوت کے انداز میں سڑکوں پر آگئے لیکن مسٹر الطاف گوہر یا مسٹر ابن الحسن رضوی کی کارروائی کے سوا کوئی اجتماعی مظاہرہ کسی نتیجہ کے ساتھ نہ ہو سکا۔ خبر نشر احتساب ہو گئی۔

۳۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھارت کی عریانی نے عالمی طاقتوں کو پاکستان سے متعلق ایک دوسری سوچ اور اس کے عمل میں ڈال دیا۔ وہ سوچ اور عمل تھا۔

ا۔ اگرتلہ سازش

ب۔ چھ نکات

ج۔ مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کا منصوبہ اور تحریک

۴۔ ۱۹۶۹ء کی عوامی تحریک صدر ایوب کی گول میز کانفرنس پر ختم ہو گئی اور ملک اس انقلاب کے ہاتھوں نکل گیا جو عالمی طاقتوں کی اسکیم کے مطابق تھا۔ لیکن یحییٰ خان نے جو اس وقت کا نئڈر انچیف تھا اپنے سیاسی رفقاء کی معرفت اس کانفرنس کے نتائج کا تجزیہ نکال دیا۔ نتیجتاً مارشل لاء آگیا۔

۵۔ یحییٰ خان کیا تھا؟ یہ بات ابھی تک سربستہ ہے لیکن اس کے برسرِ اقتدار آنے سے سی آئی اے سرگرم ہو گئی۔ مشرقی پاکستان کی سیاست تین حصوں میں بٹ گئی اور تین طاقتوں نے اپنی سیاست کی بساط وہاں بچھا۔ روس۔ امریکہ۔ چین۔ مولانا بھاشانی چین کے لیے مفید ہو گئے۔ مجیب ابتداً امریکہ کے بال و پر لے کر چلا تھا اب روس کی سیاست بھی اس کے ساتھ ہو گئی کہ وہ چین کا حریف تھا۔

مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان سے کٹ کے بنگلہ دیش بن جانا محض شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کا نتیجہ نہ تھا بلکہ مغربی پاکستان کے حکمران اور ان کے دست بچہ سیاست دان اس نتیجہ کے لیے خود زمین تیار کر رہے تھے اور وہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی ہی سے اپنے مقتدر اعلیٰ ہونے کے خواب کی تعبیر پا سکتے تھے اور یہی ہوا۔

جس نقاب پوش جماعت نے اس مہم میں عالمی استعمار کے بلا واسطہ مہرے کی حیثیت سے حصہ لیا اس کی تفصیلات

ذرا تفصیل میں اور آگے چل کر اس کا بڑا حصہ بیان ہوگا۔ یاد رکھنے کی چیز یہ ہے کہ مشرقی پاکستان صرف اس لیے پاکستان سے الگ کرایا گیا اور علیحدہ کیا گیا کہ عالمی طاقتیں ہندوستان کی خواہش کو پروان چڑھا کر اپنا راستہ ہموار کر رہی تھیں اور مغربی پاکستان کے حکمران و سیاست دان نا سمجھی تھے یا اپنے اپنے اقتدار کا راستہ صاف کر رہے تھے۔

۲۔ سی آئی اے کسی ملک یا قوم میں اپنے مقاصد کے لیے کسی ایک کو آلۂ کار یا گماشتہ نہیں بناتی، وہ بیک وقت کئی افراد سے کام لیتی اور وہ افراد ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔ انہیں بسا اوقات یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی ایجنسی کے فرستادہ ہیں۔

۳۔ مغربی پاکستان ——— صرف پاکستان ہو کر رہ گیا۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں ایک جماعت یا ایک فرد کا مالک و مختار ہونا مشکل ہے کئی چہرے اور بھی ہیں۔ اس پر طُرّہ یہ ہے کہ:

(۱)۔ مغربی پاکستان عالمی طاقتوں کی متحارب خواہشوں کے نرغہ میں ہے۔

ب۔ پختونستان، بلوچستان اور کسی پیمانہ پر سندھو دیش کا تصور آب و دانہ حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو حکمرانوں سے لے کر سیاست دانوں کے حلقے میں ہر روز گفتگو کے پیچ و خم میں زیر بحث آتی ہیں۔ "ایسا ہو سکتا ہے یا ایسا کبھی ہوگا" کی بحث سے قطع نظر جو چیز بھی ہے وہ بیرونی خارجی خطرہ ہے اور اس کے بال و پر ملک کی سیاسی فضا میں توانائی حاصل کر رہے ہیں۔

اس داخلی و خارجی خطرے نے پاکستان کے لیے موت و حیات کا سوال پیدا کر دیا ہے۔ حزب اقتدار حزب اختلاف کے پیچھے پڑی ہوئی ہے کہ وہ اس کی طاقت چھیننا یا بانٹنا چاہتی ہے۔ ادھر حزب اختلاف نے حزب اقتدار کو چت یا پچھاڑنا اپنا مطمح نظر بنا لیا ہے، لیکن اصل خطرہ اور اس کے پس منظر پر کسی کی نگاہ نہیں اور اگر کسی کی نگاہ اس طرف جاتی ہے تو محاسبہ نہیں ہو رہا اور نہ کوئی اس خطرہ کے تعاقب کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

اس معلوم حقیقت کے بعد کہ عالمی استعمار یا ان کے ٹکڑے کرنے کے در پے ہے، سوال یہ ہے کہ وہ کونسی جماعت ہے جو اس سطح پر عالمی استعمار کی آلۂ کار ہے۔ ظاہر ہے وہ کوئی ایسی جماعت ہی ہو سکتی ہے جس کی تاریخی خصوصیت یہ عالمی استعمار کو بھروسہ ہو۔ اور وہ ہیں احمدی ——— قادیانی۔

جب کبھی قادیانی امت کا احتساب کیا گیا مگر اس احتساب کی عمر بہت تھوڑی ہے لیکن خود قادیانی مذہب کی عمر بھی زیادہ نہیں۔ مرزا صاحب نے ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا پھر ۱۹۰۱ء میں اپنے نبی ہونے کا اعلان فرمایا گویا ۱۹۵۳ء میں ان کی نبوت کے ۵۲ سال ہوتے ہیں تو اس امت نے اپنے اقلیت ہونے کی پناہ لی اور واویلا کیا کہ اسے سواد اعظم ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستان میں برطانوی عملداری تک تو قادیانی اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہ کرتے تھے۔ انہیں مرزا صاحب کے الہام کی رو سے اپنے خود کاشتہ پودا ہونے کا احساس تھا اور وہ جانتے تھے کہ جس استعمار نے انہیں پیدا کیا وہی ان کا محافظ و پشتیبان ہے۔ پاکستان بنا تو وہ کوئی اہم اقلیت نہ تھے اہم عنصر ضرور تھے۔ انہوں نے اولاً ہندوستان میں رہنے کی بہتیری کوشش کی ریڈکلف کو اپنا الگ میمورنڈم دیا۔ سر ظفر اللہ خاں نے پاکستان کی سرحدی ترجمانی کے علاوہ اس یادداشت کی ترجمانی کی۔ جب اس طرح بات نہ بنی تو وہ قادیان میں تین سو تیرہ درویشوں کو چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ پاکستان میں سر ظفر اللہ خاں کی وزارت خارجہ ان کے لیے ایک سہارا ہو گئی۔ جن لوگوں کو سیاسی اقتدار منتقل ہوا تھا وہ قادیانیت کے مذہبی پہلو سے ناواقف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قادیانی ان کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتے بلکہ حکومت سے وفاداری ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ جب پاکستان کی سیاست خواجہ ناظم الدین جیسے بزرگوں کے ہاتھ میں آ گئی اور ان کی کابینہ میں وہ لوگ شامل ہو گئے جو سیاسی نہ تھے بلکہ برطانوی عملداری کے دنوں سے ملازم چلے آ رہے تھے تو قادیانیت اور محفوظ ہو گئی۔ ملک غلام محمد اور اسکندر مرزا نے اس کو مزید تحفظ دیا وہ سمجھتے تھے کہ قادیانی پاکستان جیسے مذہبی ملک میں ایک ایسی اقلیت ہیں کہ ان کے خلاف کسی سازش یا منصوبہ میں شریک نہیں ہو سکتے بلکہ ان پر مقتدرین کے شخصی و حزبی تحفظ کا بار ڈالا جا سکتا اور سیاستاً اعتماد کیا جا سکتا ہے

اس کے برعکس عام مسلمانوں کا اجتماعی مزاج یہ تھا کہ وہ کسی حالت میں بھی مرزائیت کے ساتھ مصالحت کے لیے تیار نہ تھے۔ مختصر یہ پانچ سال کے اندر اندر ۱۹۵۳ء کی تحریک نے قادیانیت کو معنوی اعتبار سے لپیٹ کر دیا۔ مرزائی تبلیغ کے دروازے بند ہو گئے۔ وہ نقاب اتر گئی جو ان کے سیاسی منصوبوں پر مذہب کا پردہ بنی ہوئی تھی بظاہر مرزا ناصر احمد نے ابھی الفضل ۲۳ مئی ۱۹۷۴ء میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ دنیا میں ایک کروڑ ہیں اور پاکستان میں چالیس لاکھ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزائی نہ ایک کروڑ ہیں نہ ۴۰ لاکھ۔ اگر وہ پاکستان میں اس قدر ہیں تو حکومت سے اپنی گنتی کرا لینے کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے؟ اور مردم شماری سے گریزاں کیوں ہیں؟

قادیانی امت کا تعاقب

پہلی جنگ ۱۸-۱۹۱۴ء کے اختتام تک مذہبی محاذ پر جد و جہد جاری تھی۔

پھر ۱۹۳۰ء میں ملک کی سیاسی مذہبی حدود میں پھیلتا گیا۔ چودھری افضل حق علیہ الرحمۃ نے سب سے پہلے ان کی سیاسی روح کا جائزہ لیا۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے (۱۹۳۵ء) پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں مضمون لکھ کر مرزائیت کو اس طرح بے نقاب کیا کہ مسلمانوں میں سیاسی طور پر یہ ذہنی فضا پیدا ہو گئی کہ مرزائیوں سے دوستانہ ہاتھ بڑھانے والا اونچا طبقہ جس کی ذہنیت مغربی افکار کی آزادی سے مرعوب تھی، مرزائیت سے چوکنا ہو گیا اور مسلمانوں کے عمرانی و سیاسی، تہذیبی، تعلیمی ادارے بڑی حد تک ان کے لیے بند ہو گئے۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں سے مخاصمت کا جو مقصد رکھتے تھے، سر ظفر اللہ خاں نے پاکستان بن جانے کے بعد خواجہ ناظم الدین کی مرضی کے خلاف کراچی میں اپنے جلسہ عام کو خطاب کرنا چاہا، لیکن عوامی احتجاج کی تاب نہ لاکر ترک دم بھاگ گئے۔

قادیانی بحیثیت جماعت پاکستان اور اپنے مستقبل کے بارے میں متذبذب تھے لیکن مرزا بشیر الدین محمود (خلیفہ ثانی) اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ جو عناصر قادیانیت کے مخالف تھے۔ وہ تحریک پاکستان میں شامل نہیں ہے، لہٰذا وہ پاکستان کے عوام میں متروک ہو چکے ہیں۔ اب اگر قادیانی اقتدار کی طرف قدم اٹھائیں یا تبلیغ کے لیے بڑھیں تو انہیں روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ بلوچستان کو احمدی صوبہ بنانے کا اعلان مرزا محمود کی اسی غلط فہمی ہی کا نتیجہ تھا، لیکن مجلس تحفظ ختم نبوت کا مشترکہ محاذ کہیے یا احرار ہی کے ذمہ لگا دیجیے۔ بہرحال ۱۹۵۳ء میں مرزائی چاروں شانے چت ہو کر رہ گئے تب سے ان کی حیثیت ایک ایسے طائفہ کی ہو گئی جو بین الاقوامی بساط پر استعماری مہرے کی حیثیت سے کام کرتا اور پاکستان میں عالمی طاقتوں کے سامراجی مقاصد کی آبیاری کرتا ہے۔

قادیانی ہمیشہ سے یہ تاثر دیتے چلے آرہے ہیں کہ انہیں غلط قسم کے لوگ مذہب کے نام سے دبانا چاہتے اور ان کی کشش بھرا نیت کی جان، مال اور آبرو کے دشمن ہیں۔ اس تاثر کے عام دنیا بالخصوص مغربی دنیا میں پھیل جانے کی واحد وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں جو لوگ ان کا محاسبہ کر رہے اور ان کے خطرہ کی گھنٹی بجاتے ہیں وہ اکثر و بیشتر یورپ کی زبانوں سے واقف ہیں نہ ان ممالک میں ان کے تبلیغی مشن ہیں اور نہ ان کے پاس مغربی دنیا سے بات چیت کرنے کے لیے ظفر اللہ خاں جیسی کوئی اعتباری شخصیت ہے اور نہ انہوں نے کبھی مغرب کے لوگوں کو قادیانی مسئلہ سمجھانے کا سوچا ہے۔

پاکستان میں مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ جب تک کوئی خطرہ ان کے سر پر آکر مسلط نہ ہو جائے وہ اس

کا نوٹس نہیں لیتے۔ پھر اسلام کے نام پر جتنی عریاں گالی سیاسی حریف کو دی جاتی ہے خود اسلام کے حریف کو اس طرح چھتا نہیں جاتا بلکہ سرے سے باز پرس ہی نہیں کی جاتی، الٹا یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی جاتی اور خاموشی اختیار کرنے پر زور دیا جاتا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔

میرزائی امت کے نشاطرین حد درجہ عیار ہیں۔ کوئی شخص اس پر غور نہیں کرتا کہ جب قادیانی ایک مذہبی اُمت بن کر اپنے سیاسی اقتدار کے لیے سعی و سازش کرتے ہیں تو وہ انہی بنیادوں پر اُس اُمت کے افراد کو اپنے محاسبہ کا حق کیوں نہیں دیتے؟ جس اُمت میں نقب لگا کر انھوں نے اپنی جماعت بنائی ہے عجیب بات ہے کہ قادیانی اُمت کا مذہبی محاسبہ کیا جائے تو وہ سیاسی پناہ تلاش کرتے ہیں۔ سیاسی محاسبہ کریں تو وہ مذہبی اقلیت ہونے کا تحفظ چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ مذاق نا روا ہے کہ ایک ایسی جماعت جو اس کے وجود کو قطع کر کے تیار ہوئی ہے وہ اصل وجود کو اپنے اعضاء و جوارح کی حفاظت کا حق دینا نہیں چاہتی اور جو عارضہ اُن کو قادیانی سرطان کی شکل میں مار دینا چاہتا ہے اس کے علاج سے روکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں سے اپنے الگ ہونے کا اعلان سب سے پہلے خود قادیانیوں نے کیا۔ میرزا غلام احمد کو نہ ماننے والے کافر قرار دیئے گئے۔ ان کے بچوں، عورتوں، معصوموں اور بوڑھوں کا جنازہ پڑھنے سے روک دیا گیا۔ انھیں زانیہ عورتوں کی اولاد و کنجریوں کے بچے اور سور لڈانانگ کہا گیا۔ مسلمانوں نے تو اس کے بہت دیر بعد محاسبہ شروع کیا اور انھیں اپنے سے خارج قرار دیا۔ جب میرزائی خود مسلمانوں سے الگ امت کہلاتے ہیں تو پھر انہیں مسلمانوں میں شامل رہنے پر اس وقت اصرار کیوں ہوتا ہے جب مسلمان ان کے الگ کر دینے کا مطالبہ کرتے اور انھیں اقلیت قرار دیتے ہیں؟ آخر کیا وجہ ہے کہ قادیانی مذہبی اور معاشرتی طور پر عقیدۃً مسلمانوں سے الگ رہتے لیکن سیاسۃً اُن کا پنڈ نہیں چھوڑتے۔ اس کی واحد وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس طرح وہ مسلمانوں کے حقوق و مناصب پر ہاتھ صاف کرتے اور ان کی ریاست پر حکمران ہونا چاہتے ہیں یا پھر انھیں مٹا کر اپنا سیاسی نقشہ مرتب کرنے کی جدوجہد میں ہیں۔

ایک خطرناک صورت حال جو ہمارے ہاں پیدا ہو چکی ہے یہ ہے کہ ہمارے مغرب زدہ طبقے نے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا کہ میں ڈکٹیٹر بن جاؤں تو سب سے پہلے اس طبقہ کو ہلاک کر دوں۔ ابھی تک نہ قادیانی مذہب کو سمجھنے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ وہ خود مذہب سے بیگانہ ہو رہا ہے

اور نہ وہ قادیانی امت کے سیاسی عزائم کی مضرتوں سے آگاہ ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ ایک چھوٹی سی اقلیت کو مسلمانوں کے کٹ ملا تنگ کر رہے ہیں۔ وہ ان کی چگی داڑھی دیکھکر اور ان کے تبلیغی اداروں کی رو داد سنکر انہیں مسلمان سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس کے اپنے ظاہری و باطنی وجود سے اسلام خارج ہو چکا ہے۔

ان لوگوں سے بجا طور پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان ایک وحدت کا نام ہے اور یہ وحدت ختم نبوت کے تصور سے استوار ہوتی ہے۔ اگر کوئی اس وحدت کو توڑتا ہے اور ختم نبوت کی مرکزیت کو ظلی و بروزی کی آڑ میں اپنی طرف منتقل کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کا وجود خطرناک نہیں؟ باغی کون ہے؟ دویا محاسب؟ کیا اپنی قومی سرحدوں کی حفاظت کرنا جرم ہے یا مذہبی جارحیت؟ بعض لوگ رواداری کا سبق دیتے ہیں لیکن وہ رواداری کے معنی نہیں جانتے اگر رواداری کے معنی غیرت، حمیت، عقیدہ، مسلک اور اپنے شخصی یا اجتماعی وجود سے دستبردار ہو جانے کے ہیں تو یہ معانی کہاں ہیں؟ اور کس ترکیب داعی، پیغمبر اور نظام نے بتلائے ہیں۔ قادیانیوں کے باب میں مسلمانوں کا معاملہ ذاتی نہیں اجتماعی ہے اور اس کے عناصر اربعہ میں غیرت و حمیت، عقیدہ و مسلک شامل ہیں۔

مسلمانوں کا مطالبہ کیا ہے؟ صرف اتنا کہ قادیانی جب مسلمانوں سے الگ ہیں تو وہ مسلمانوں میں رہتے کیوں ہیں؟ ہمارا اعتراض ان کے پاکستان میں رہنے پر نہیں مسلمانوں میں رہنے پر ہے۔ وہ پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں تو شوق سے رہیں۔ پھر اس کا فیصلہ وہ خود ہی کریں کہ مسلمانوں کے مسلمات کا استعمال ان کی ظلی نبوت اور علیحدہ اقلیت کے حسب حال ہوگا یا نہیں؟ اس سے مسلمانوں کی دل آزاری تو نہیں ہوتی؟ یہ کہنا کہ پاکستان میں کوئی جماعت یا شخصیت ان کی جان، مال اور آبرو کی دشمن ہے اور انہیں معدوم کرنے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے جیسا کہ آزاد کشمیر اسمبلی کی اس سفارش پر کہ مرزائی خارج از اسلام اور علیحدہ اقلیت ہیں۔ مرزا ناصر نے واویلا کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم سر ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں اور وقت آنے پر دنیا دیکھیگی کہ جان کیونکر دی جاتی ہے۔ یہ محض ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ قسم کی اڑان گھاتی ہے؟ پاکستان میں کوئی شخص نہ اُن کی جان کا دشمن ہے نہ مال کا اور نہ آبرو کا۔ اس قسم کی باتیں صرف کینہ توز کرتے اور کینہ ٹرک اچھالتے ہیں۔ ہم جو کچھ کہتے وہ یہ ہے کہ قادیانی امت ہمارے مطالبہ سے قطع نظر خود اپنے پیغمبر اور خلیفہ کی ہدایت و روایت کے مطابق مسلمانوں سے الگ امت ہے تو پھر وہ سرکاری طور پر الگ کیوں نہیں ہو جاتی؟ اس طرح وہ محمد عربی کی امت میں سے غلام احمد کی امت تیار کرنا چاہتی اور عالمی استعمار کے مہرے کی حیثیت سے مسلمانوں کی وحدت کو پاش پاش

کرکے اپنے لیے ایک عجمی اسرائیل پیدا کرنے کی متمنی ہے۔

یہ غلط ہے کہ قادیانی مسئلہ [illegible] ہے جیسا کہ پاکستان کی حکومتیں اس غلط فہمی کا شکار رہی ہیں اور اب تک یہی سمجھتی ہیں۔ قادیانی مسئلہ اپنی پیدائش سے اب تک پولیٹیکل ہے — افسوس کہ مسلمانوں نے اس کا نوٹس بہت دیر میں لیا ' وہ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی قیادت جس مغرب زدہ اور مقتضائے اسلام سے معریٰ طبقے کے ہاتھ میں رہی ہے اُس نے استعمار کی ہر ضرورت کا ساتھ دیا اور دین سے ہر بغاوت کو نظر انداز کیا ہے اور اس کے ذہن کا پورا کارخانہ ابھی تک اسی نہج پر قائم ہے۔ اگر قادیانی مسئلہ صرف مذہب کا ہوتا تو علماء کا تعاقب کافی تھا۔ قادیانی مسئلہ سیاسی مسئلہ ہے جس نے تجدید کی ایک ایسی شکل اختیار کر لی ہے کہ وہ باطنیت ' اخوان الصفا اور بہائیوں کی طرح اپنی زمین پیدا کرنے میں مشغول ہے ۔ معتزلہ کی تاریخ ہے۔ قادیانی جانتے ہیں کس طرح معتزلہ نے اقتدار حاصل کیا اور کیونکر باطنیہ نے فاطمیہ سلطنت قائم کی۔ وہ ان سب کے تاریخی تجربوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جدید سیاسی نہج پر اقتدار حاصل کرنا چاہتے اور اس زمانہ میں جب کہ انسان عالمی ہو گیا اور سیاست بین الاقوامی ہو گئی ہے ایک دوسرے پر انحصار کے تحت مغربی استعمار کی بدولت پاکستان کو عجمی اسرائیل میں منتقل کرنا چاہتے اور افریقہ میں جزیرۃ العرب کے خلاف قادیانی اسلام کا استعماری سیل [illegible] بنانا چاہتے ہیں۔ قادیانیوں کا سیاسی روپ اُسی صورت میں معلوم ہو سکتا اور سمجھ میں آ سکتا ہے جس صورت میں کہ ہم اس کے تاریخی ماخذ اور اُس کی عمومی رفتار سے واقف ہوں۔

مرزا غلام احمد نے انگریزوں کی حمایت میں بقول خود پچاس الماریاں لکھیں اور ان کی وفاداری میں نہ صرف قرآن سے جہاد کو منسوخ کیا بلکہ برطانیہ کے ہاتھوں شکست و ریخت پر چراغاں کیا اور یہی قادیانی امت کی تخلیقی غایت تھی۔ اسی غرض ہی سے قادیانی فرقہ وجود میں لایا گیا اور برطانوی استعمار نے گود میں لے کر جوان کیا۔

اس وقت میرے سامنے وہ کتاب نہیں، مصنف اور کتاب کا نام بھی یاد نہیں آ رہا۔ پاکستان کے ایک بڑے افسر مارشا ہے گئے۔ پھر اپنی نظر بندی کے باعث میں اُن سے کتاب واپس نہ لے سکا ' اس کتاب میں احمدیت کی افریقہ میں تگ و دو کا جائزہ دیا گیا اور اس کے خط و خال بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب میری یادداشت کے مطابق کیمبرج کے ایک پروفیسر نے لکھی اور اس میں بعض عجیب و غریب باتیں تحریر کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ

پادریوں کی ایک نمائندہ جماعت نے برطانوی وزارت خارجہ سے شکایت کی کہ افریقہ میں مسیحیت کی تبلیغ کے راستہ میں قادیانی مزاحم ہوتے ہیں کیا وجہ ہے کہ ان قادیانیوں کے تمام مشن برطانوی مقبوضات ہی میں ہیں اور وزارت خارجہ ان کی محافظت کرتی ہے۔ وزارت خارجہ نے جواب دیا سلطنت کے مقاصد تبلیغ کے مقاصد سے الگ ہیں۔ آپ ان کا مذہب کی صداقت سے مقابلہ کیجیے، سلطنت کی طاقت سے نہیں۔ امور سلطنت کے حضرات منکشف ہیں اس راز کی گرہ ایک برطانوی دستاویز "دی ارائیول آف برٹش ایمپائر ان انڈیا" (برطانوی سلطنت کی ہندوستان میں ورود) سے کھلتی ہے ۱۸۶۹ء میں انگلینڈ سے برطانوی مدبروں اور مسیحی راہنماؤں کا ایک وفد اس بات کا جائزہ لینے کے لیے ہندوستان پہنچا کہ ہندوستانی باشندوں میں برطانوی سلطنت سے وفاداری کا بیج کیونکر بویا جاسکتا اور مسلمانوں کو رام کرنے کی صحیح ترکیب کیا ہو سکتی ہے جو اس زمانہ میں جہاد کی مدح مسلمانوں میں کس خون کی طرح دوڑ رہی تھی اور جو انگریزوں کے لیے پریشانی کا سبب تھا۔ اس وفد نے ۱۸۷۰ء میں دو رپورٹیں لکھیں، ایک سیاست دانوں اور ایک پادریوں نے جو مشترکہ نام کے ساتھ شائع کی گئیں اس مشترکہ رپورٹ میں درج ہے کہ :

"ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اپنے روحانی راہنماؤں کی اندھا دھند پیروکار ہے۔ اگر اس وقت ہمیں کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اپاسٹالک پرافٹ (حواری نبی) ہونے کا دعویٰ کرے تو بہت سے لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو جائیں گے لیکن مسلمانوں میں سے ایسے کسی شخص کو ترغیب دینا مشکل نظر آتا ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے تو پھر ایسے شخص کی نبوت کو حکومت کی سرپرستی میں بطریق احسن پروان چڑھایا جاسکتا اور کام لیا جاسکتا ہے۔ اب کہ ہم پورے ہندوستان پر قابض ہیں تو ہمیں ہندوستانی عوام اور مسلمان جمہور کی داخلی بے چینی اور باہمی انتشار کو ہوا دینے کے لیے اسی قسم کے عمل کی ضرورت ہے"

مرزا غلام احمد اس برطانوی ضرورت ہی کی استعماری پیداوار تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اس استعماری پیداوار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " مرزا غلام احمد نے درحقیقت اسلام کے علمی و دینی ذخیرہ میں کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا جس کے لیے اصلاح و تجدید کی تاریخ ان کی معترف اور مسلمانوں کی نسلِ جدید ان کی شکر گزار رہے۔ انہوں نے کوئی دینی خدمت انجام دی جس کا نفع دنیا کے سارے مسلمانوں کو پہنچے، نہ وقت کے جدید مسائل میں سے کسی مسئلہ کو حل کیا، نہ ان کی تحریک موجودہ انسانی تہذیب کے لیے جو سخت مشکلات اور موت و حیات کی کشمکش سے دوچار ہے، کوئی پیغام

رکھتی ہے۔ اس نے یورپ اور ہندوستان کے اندر تبلیغ و اشاعت کا کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کی جدوجہد کا تمام تر میدان مسلمانوں کے اندر ہے اور اس کا نتیجہ صرف ذہنی انتشار اور غیر مفید کشمکش ہے جو اس نے اسلامی معاشرے میں پیدا کر دی ہے، اسلام کی صحیح تعلیمات سے انحراف اور ان مخلصین و مجاہدین کی (جو اس قریب میں اس ملک میں پیدا ہوئے اور اسلام کے عروج اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اپنا سب کچھ نثار کر چلے گئے) ناقدری کی سزا خدا نے یہ دی کہ مسلمانوں پر ایک ذہنی طاعون کو مسلط کر دیا۔ اور ایک ایسے شخص کو ان کے درمیان کھڑا کر دیا جو امت میں فساد کا مستقل بیج بو گیا ہے۔

(قادیانیت از ابوالحسن علی ندوی صفحہ ۲۴۳، ۲۴۴)

مرزا غلام احمد کی خصوصیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ اس نے:

۱۔ مسلمانوں میں اپنی نبوت و مسیحیت کا ڈھونگ رچا کر انتشار، تقسیم اور فساد پیدا کیا۔

۲۔ جہاد کی قرآنی تعلیم کو منسوخ کیا۔

۳۔ ہندوستانی اقوام میں باہمی فساد کی نیو اٹھائی۔

۴۔ دینی لٹریچر میں سب و شتم کی بنیاد رکھی۔

۵۔ برطانوی حکومت کی نسلاً بعد نسلٍ وفاداری کو مذہبی عقیدہ کی الہامی سند مہیا کی۔

۶۔ محمد عربی کی امت میں سے اپنی امت پیدا کی جس نے اپنے نہ ماننے والوں کو کافر جان کر مسلمانانِ عالم کے ابتلاء و مصائب سے لاتعلقی اختیار کی حتیٰ کہ ان کی شکست و ہزیمت پر خوشیاں منائیں اور برطانوی فتح و نصرت کو انعامات ایزدی قرار دیا۔

ان کے فرزند مرزا محمود احمد (خلیفہ ثانی) نے قادیانی امت کو برطانوی خواہشوں کے محور و مرکز پر مستحکم کیا اور اسے ایک ایسی سیاسی تحریک بنا دیا جو برطانوی استعمار کی خدمت گذار اور اپنے حزبی اقتدار کی طلبگار رہی۔ خلیفہ محمود رحلت کر گئے تو ان کے بیٹے خلیفہ ثالث مرزا ناصر نے دادا کے مشن اور باپ کے منصوبے کو ایسی شکل دی کہ آج وہ سب کچھ پاکستان کے لیے ایک سیاسی خطرہ بن چکا ہے۔

خوفِ طوالت کے پیشِ نظر ان تفصیلات کا ذکر بے سود ہوگا کہ مرزا غلام احمد کے والد مرزا غلام مرتضیٰ نے ۱۸۵۷ء میں مسلمانانِ پنجاب کے خون سے ہولی کھیل کر انگریزی سرکار کی خوشنودی اور اعتماد حاصل کیا۔ ان کے بڑے بھائی مرزا غلام قادر نے مشہور سفاک جنرل نکلسن کی فوج میں شامل ہو کر

ہوئیو انفنٹری کے باغیوں کو تربیگات پر نیسون ڈالا۔ ان باغیوں کو صرف گولی ہی سے نہیں اڑایا بلکہ ان کا مُثلہ کیا، انہیں درختوں سے باندھ کر اعضا قطع کیے، انہیں چھاؤنی میں ڈالا، ان پر ہاتھی چھوڑتے ان کی ٹانگیں چیر کر رقص بسمل کا تماشا دیکھا۔

پس منظر کے طور پر یہ جان لینا ضروری ہے کہ میرزائی اُمت کا اصل کردار کیا رہا اور اس نے تبلیغ کی آڑ میں برطانوی ملوکیت کے لیے کہاں کہاں جاسوسی کے فرائض انجام دیئے۔ بالخصوص مسلمان ملکوں میں ان کے وجود کا مقصد کیا تھا؟ کیا وہ مسلمانوں کو مسلمان بنانے کے لیے جزیرۃ العرب، افغانستان اور ترکی میں گئے تھے اور اب تک اسی لیے افریقہ و اسرائیل میں موجود ہیں۔

اسرائیل عربوں کے قلب میں ناسور ہے۔ تقریباً تمام مسلمان ریاستوں نے اس کا مقاطعہ کر رکھا ہے۔ پاکستان وہاں نہیں، لیکن قادیانی مشن وہاں ہے۔ سوال یہ ہے وہ کس پر تبلیغ کرتا ہے؟ مسلمانوں پر یا یہودیوں پر؟ آج جو چند مسلمان اسرائیل میں رہ گئے ہیں وہ قادیانی مشن کے استحصال کی زد میں ہیں۔ غور کیجئے جس اسرائیل میں عیسائی مشن قائم نہیں ہو سکتا وہاں اسلام کے لیے قادیانی مشن لطیفہ نہیں تو کیا ہے؟ اس مشن سے جو کام لیے جا رہے ہیں وہ ڈھکے چھپے نہیں تمام عالم عربیہ میں اس کے خلاف احتجاج ہو چکا اور ہو رہا ہے، لیکن مشن جوں کا توں قائم ہے۔

۱۔ اس مشن کی معرفت عرب ریاستوں کی جاسوسی ہوتی ہے۔ اس مشن کی وساطت سے حیانہ داروں کی نفسیات کے پاکستانی افسروں سے جن میں کئی قادیانی ہوتے ہیں، وہاں کے راز حاصل کیے جاتے اور اسرائیل کو پہنچائے جاتے ہیں۔

۲۔ اس مشن کی معرفت اسرائیل کے بچے کھچے مسلمان عربوں کو عرب ریاستوں کی جاسوسی کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

۳۔ اس مشن کی معرفت پاکستان کی اندرونی سیاست کے راز لیے جاتے اور اسلام دشمنوں سے متعلق مطلوبہ خبریں حاصل کی جاتی ہیں۔

۴۔ اس مشن کی معرفت پاکستان میں عالمی استعمار اور یہودی استحصال کی راہیں قائم کی جاتیں اور سیاسی نقشے درآمد برآمد ہوتے ہیں۔ خود صدر بھٹو پاکستان میں تل ابیب کی سیاسی مداخلت اور صیہونی سرمایہ کی زمانہ انتخاب میں آمد کا انکشاف کر چکے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تل ابیب کا سرمایہ پاکستان کے عام

انتخابات میں مقامی میرزائیوں کی معرفت اسی مشن کی وساطت سے آیا تھا اور ذیلی کے زمانہ میں اکثر وزراء نے خود راقم الحروف سے اس کی روایت کی تھی۔

۵۔ پاکستان کو اس وقت جو خطرہ درپیش ہے اس میں قادیانی امت اور تل ابیب کا گٹھ جوڑ عالمی استعمار کی مخفی خواہشوں کو معرض وجود میں لانے کا ذریعہ (LINK) بن چکا ہے۔

پاکستان میں اسلام کے خلاف ۱۹۷۰ء کے جنرل الیکشن میں جو سب سے بڑی ذہنی بغاوت ہوئی اس کے منتظم قادیانی تھے جو اسرائیل کے حسب ہدایت کام کر رہے تھے۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں کھلی حقیقت ہے اور پیش آمدہ واقعات کا تسلسل اس کی تصدیق کرتا ہے۔ پھر یہ کوئی نئی چیز نہیں قادیانی امت شروع ہی سے اس قسم کے مشن قائم کرنے کی عادی ہے۔ مثلاً میرزا محمود نے شاہ سعود اور شریف مکہ کی آویزش کے زمانہ (۱۹۲۵ء) میں اپنے ایک مرید میر محمد سعید حیدر آبادی کو مکہ بھیجا وہاں اس نے اونے پونے راز اُٹھائے اور دھر لیا گیا۔ اسی طرح ترکی میں دو قادیانی مصطفےٰ صغیر کی ٹیم کا رکن ہو گئے۔ ایک ثقہ روایت کے مطابق مصطفےٰ صغیر خود قادیانی تھا اور مصطفےٰ کمال کو قتل کرنے پر مامور ہوا تھا لیکن قبل از اقدام پکڑا گیا اور موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔

میرزا محمود احمد کے سالے میر حبیب اللہ شاہ فوج میں ڈاکٹر تھے وہ پہلی جنگ عظیم میں بھرتی ہو کر عراق گئے۔ انگریزوں نے بغداد فتح کیا تو انہیں ابتداً گورنر مقرر کیا۔ ان کے بڑے بھائی ولی اللہ زین العابدین جو قادیان میں امور عامہ کے ناظر رہے، عراق میں قادیانی مشن کے انچارج تھے، لیکن فیصل نے ان کی سرگرمیوں سے آگاہ ہوتے ہی نکال دیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے وہاں ان کے ٹکے رہنے پر زور دیا لیکن عراق گورنمنٹ نے ایک نہ مانی۔

غالباً ۱۹۲۲ء میں مولوی جلال الدین شمس کو شام بھیجا گیا۔ وہاں کے حریت پسندوں کو پتہ چلا تو قاتلانہ حملہ کیا۔ آخر تاج الدین الحسنی کابینہ نے شام بدر کر دیا۔ جلال الدین شمس فلسطین چلا گیا اور ۱۹۳۱ء تک برطانوی انتداب کی حفاظت میں عرب ملکوں میں عالمی استعمار کی خدمت بجا لاتا رہا۔ جب تک برطانیہ ہندوستان میں حکمران رہا اُس نے ہندوؤں کو اپنے لیے خطرہ سمجھا۔ اس غرض سے مختلف ادوار میں مختلف مشن روس اور وسط ایشیا کے اسلامی ممالک میں بھیجے گئے۔ بالخصوص اُن علاقوں میں جو ہندوستان کی سرحد کے ساتھ آباد تھے اور ہندوؤں کو وہاں اقتدار حاصل تھا۔ اس غرض سے پنڈت موہن لال، پنڈت من

بھیجا، مولوی فیض محمد، بھائی دیوان سنگھ اور مولوی غلام ربانی کے سفرنامہ کی بعض جھلکیاں عام ہو چکی ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کے نواسے آغا محمد باقر نے اپنے نانا کے سفر کو اسی نوعیت کی جاسوسی قرار دیا ہے۔ ادھر ۱۹۲۱ء میں مولوی محمد امین قادیانی ایران کے راستے روس گئے انہیں روس میں داخل ہوتے ہی پکڑ لیا گیا وہ ڈیڑھ سال جیل میں رہا۔ لیکن واپس آنے کے کچھ عرصہ بعد میرزا محمود نے ایک اور نوجوان مولوی ظہور حسین کے ساتھ انہیں واپس بھجوا دیا چونکہ پاسپورٹ نہیں تھے اس لیے ایران کے راستہ داخل ہوئے، لیکن پکڑے گئے پہلے مولوی محمد امین لوٹے پھر مولوی ظہور حسین۔ قید و بند کے مرحلے گزار کر برطانوی سفیر کی مداخلت سے رہا ہوئے اور واپس آ گئے۔

افغانستان میں نعمت اللہ قادیانی کو جولائی ۱۹۲۴ء میں پکڑا گیا۔ اس پر جاسوسی اور ارتداد ثابت ہو گیا تو سنگسار کر دیا گیا۔ فروری ۱۹۲۵ء میں دو اور قادیانی ملا عبدالحلیم اور ملا نور علی کو اسی جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ افغانستان اور پاکستان میں تعلقات کی کشیدگی کا ایک سبب ابتداً سر ظفر اللہ خان تھے جو ان تین قادیانیوں کے قتل پر افغانی سفیر مقیم برطانیہ کو عذاب خداوندی کی وعید دے چکے اور تب سے افغانستان کے خلاف تھے۔ دوسری وجہ میرزا محمود خود تھے کہ وہ افغانستان کے لیے اور افغانستان ان کے لیے ناقابل قبول تھا۔ افغانستان کا ہر ابتلا ان کے نزدیک بد دعا کا مظہر تھا۔

برطانوی ہندوستان میں بھی میرزائی امت کا شعار تھا کہ ان کے جو افراد پولیس میں بھرتی ہوتے وہ عموماً سی آئی ڈی میں چلے جاتے یا انگریز انہیں چن چن کے سی آئی ڈی میں لے جاتا جہاں انہیں حسب دلخواہ سکھوں اور مسلمانوں پر کوئی سا ظلم توڑتے ہوئے رتی بھر حیا محسوس نہ ہوتی بلکہ ہر ظلم کو اپنے فرائض کا حصہ سمجھتے۔

پنجاب میں سی آئی ڈی کا محکمہ برطانوی حکومت کے لیے ریڑھ کی ہڈی رہا۔ اس محکمہ کے میرزائی افسروں نے برطانوی استعمار کی جو خدمات انجام دیں وہ کوئی انگریز افسر بھی انجام نہ دے سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ تقریباً ہر اسلامی ملک میں قادیانیوں کے خلاف حکومت اور عوام دونوں سطح پر ذہنی احتساب موجود ہے لیکن جہاں قومی آزادی طاقتور ہے اور اس کا وجود عالمی استعمار کے نرغوں سے محفوظ ہے وہاں قادیانی مشن نہ کبھی تھے نہ اب ہیں۔ مثلاً مصر، ترکی، افغانستان، شام، حجاز، عراق، شرق اردن، انڈونیشیا وغیرہ میں قادیانی مشن نہیں۔ ایران ہمارا عزیز ہمسایہ ہے اس کے ساتھ ہمارے روابط گہرے ہیں لیکن قادیانی ادھر کا رخ نہیں کرتے۔ کیا وہاں انجام نظر آتا ہے یا عالمی استعمار کی شفقت نہیں۔

۱۹۷۴ء کی پاکستانی مزاحمت کے بعد بالعموم اور پچھلے تین سالوں سے بالخصوص قادیانی امت نے اپنے سیاسی ہتھکنڈے تبدیل کر لیے ہیں اور اب عالمی استعمار کی جاسوس امت کے طور پر افریشائی ممالک سے خفیہ معلومات فراہم کر رہے ہیں۔ تل ابیب (حیفا) میں اُن کا مشن گروپ عرب دنیا کے خلاف جاسوسی کا مرکز ہے۔ اس باب میں دمشق کے ایک مطبوعہ رسالہ "القادیانیۃ" سے ان کے سیاسی خط و خال اور استعماری فرائض و مناصب کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ "کسی بھی عرب مسلمان ریاست میں اُن کے لیے کوئی جگہ نہیں بلکہ ان کے وجود کی بدولت پاکستان کو عربوں میں ہدف بنایا جاتا ہے"۔ ذیل کا واقعہ رسالہ میں مذکور ہے کہ:

> "پہلی جنگ عظیم کے وقت انگریزوں نے ولی اللہ زین العابدین (میرزا محمود احمد کے سالے) کو سلطنت عثمانیہ میں بھیجا۔ وہاں یہ پانچویں ڈویژن کے کمانڈر جمال پاشا کی معرفت قدس یونیورسٹی (۱۹۱۵ء) میں دینیات کا لیکچرر ہو گیا، لیکن جب انگریزی فوجیں دمشق میں داخل ہوئیں تو یہی ولی اللہ اپنا جامہ اتار کر انگریزی لشکر میں آ گیا اور عربوں کو ترکوں سے لڑانے بھڑانے کی مہم کا انچارج رہا۔ عرب اس سے واقف ہو گئے تو بھاگ کر قادیان آ گیا اور ناظر امور عامہ بنایا گیا۔"

اب قادیانی امت کی استعماری تکنیک (STRATEGY) یہ ہے کہ وہ استعمار کے حسب منشا پاکستان کی مزید تقسیم میں مصروف کر سکھوں کے ساتھ پنجاب کو ایک علیحدہ قادیانی ریاست بنانا چاہتا ہے۔ اسی غرض سے عالمی استعمار اس کی پشت پناہی کر رہا اور وہ اس کے لیے مختلف ملکوں میں جاسوسی کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ اس کی جاسوسی کا جال وسیع ہو گیا ہے۔ اسی غرض سے اُس نے اسرائیل کے گرد و پیش حجاز و اردن میں فضائیہ وغیرہ کی تربیت کے لیے نہ صرف قادیانی پائلٹ بھیج رکھے ہیں بلکہ ان ملکوں میں استعماری کاروبار جاری رکھنے کے لیے ہر سال ڈاکٹروں، انجینئروں اور نرسوں کی ایک بڑی کھیپ جا رہی ہے۔ پاکستان میں کوشش کر کے اکثر بڑے ہسپتالوں میں میڈیکل سپرنٹنڈنٹ قادیانی مقرر کرائے جا رہے ہیں جہاں ہر سال نرسیں لڑکیاں بھرتی کی جاتی ہیں، چنانچہ لاہور کے میو ہسپتال کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ بھی ایک جمعہ قادیانی مقرر ہوا ہے۔ واضح رہے کہ میو ہسپتال لاہور، پشاور سے لے کر حیدرآباد تک نرسوں کا سب سے بڑا تربیتی مرکز ہے۔ اس پس منظر میں جمعہ کے لیے پوری قادیانی مشنری نے زور دے کر یہ جگہ حاصل کی ہے۔

اُدھر یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ میرزائی پاکستان بننے پر خوش نہ تھے اور نہ پاکستان بننے کے حق میں تھے میرزا محمود نے پاکستان بننے سے تین ماہ پہلے خطبہ دیا تھا ملاحظہ ہو الفضل ۵ اپریل ۱۹۴۷ء۔

"ہندوستان کی تقسیم پر اگر ہم رضامند ہوتے ہیں تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے اور پھر یہ کوشش کریں گے کہ یہ کسی نہ کسی طرح پھر متحد ہو جائے۔"

۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کے الفضل میں خلیفہ ثانی کی ایک دوسری تقریر درج ہے فرماتے ہیں۔

"بہرحال ہم چاہتے ہیں کہ اکھنڈ ہندوستان بنے اور ساری قومیں باہم شیر و شکر ہو کر رہیں۔"

میرزا صاحب نے قادیان میں رہنے کے بہتیرے جتن کئے۔ کوشش کی کہ پاپائے روم کے مقدس شہر ویٹیکن کا مقام قادیان کو مل جائے۔ لیکن جب کوئی سی بیل منڈھے نہ چڑھی تو ایک انگریز کرنل کی رپورٹ پر حواس باختہ ہو کر کیپٹن عطاء اللہ کی معیت میں بھاگ کر لاہور آ گئے۔ میجر جنرل نذیر احمد آپ کے ہمراہ تھے ان کے ساتھ جیپ میں سوار ہو کر نکلنے کا پروگرام تھا لیکن سکھوں کی مار دھاڑ کے خوف سے قبل از وقت نکل آئے اور چوری چھپے جان بچائی۔ یہاں پہنچ کر میرزا صاحب نے قادیان میں مراجعت کے رویا اور خواب بیان کرنا شروع کئے اور یہ پروگرام بنایا کہ

۱۔ تقسیم کی مخالف قوتوں سے گٹھ جوڑ کر کے قادیان کسی نہ کسی طرح حاصل کیا جائے۔

۲۔ کشمیر کے کسی حصے پر اقتدار حاصل کیا جائے۔

۳۔ پاکستان کے کسی علاقے کو قادیانی صوبہ میں تبدیل کیا جائے۔

بظاہر یہ تین مختلف اور شاید ایک نازک حد تک متعارض "محاذ" تھے لیکن اصلاً حصول اقتدار کا ایک مربوط سلسلہ تھا جو میرزا محمود احمد کے شاطر دماغ میں پرورش پا رہا تھا۔

جسٹس منیر نے ۱۹۵۳ء کے واقعات سے متعلق مسلمانوں سے میرزائیوں کی نزاع پر جو رپورٹ لکھی ہے اس کے صفحہ ۱۹۶ پر درج ہے کہ:

"۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۴۷ء کے آغاز تک احمدیوں کی بعض تحریروں سے منکشف ہوتا ہے کہ وہ برطانیہ کا جانشین بننے کے خواب دیکھ رہے تھے وہ نہ تو ایک ہندو بنیادی حکومت یعنی ہندوستان کو اپنے لیے پسند کرتے تھے اور نہ پاکستان کو منتخب کر

سکتے تھے :

الفضل ۲۰ر دسمبر ۱۹۳۰ء ملاحظہ ہو، خلیفہ صاحب فرماتے ہیں :-

"ملکی سیاست میں خلیفہ وقت سے بہتر اور کوئی راہنمائی نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اس کے شامل حال ہوتی ہے ۔"

۴ جون ۱۹۴۰ء کے الفضل میں :

"نہیں معلوم کب خدا کی طرف سے ہمیں دنیا کا چارج سپرد کیا جاتا ہے ہمیں اپنی طرف سے تیار رہنا چاہیے کہ دنیا کو سنبھال سکیں ۔"

یہ اُس وقت میرزائی امت کے خیالات تھے جب ہٹلر نے برطانیہ کو ہلا ڈالا تھا اور میرزائی دسکھ دونوں پنجاب پر قبضہ کرنے کی تیاری میں تھے ، اس ضمن میں ماسٹر تارا سنگھ کا مضمون ہفتہ وار الکال سے مختلف جرائد میں نقل ہو چکا ہے - ماسٹر جی نے لکھا تھا کہ برطانیہ نے ہندوستان چھوڑا تو سکھ ریاستوں بالخصوص مہاراجہ پٹیالہ کی مدد سے پنجاب میں ہم نے اتنی تیاری کر لی ہے کہ اُس کے جانشین ہو سکیں اور سکھوں کا یہ صوبہ سکھوں کی عملداری میں ہو ۔

اس سے پہلے ۱۴ فروری ۱۹۲۲ء کے الفضل میں خلیفہ صاحب کی تقریر ہے ۔

"ہم احمدی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں ۔"

مزید ملاحظہ ہو ،

"اس وقت تک کہ تمہاری بادشاہت قائم نہ ہو جائے تمہارے راستے سے یہ کانٹے ہرگز دور نہیں ہو سکتے ۔"

(الفضل ۸ ر جولائی ۱۹۳۵ء)

میرزائیوں نے اپنی جماعت کے سوا ہی مسلمانوں کے کسی ابتلا کسی تحریک ، کسی اُفتاد ، کسی مصیبت میں کبھی حصہ نہیں لیا - ہمیشہ مسلمانوں سے الگ تھلگ اور انگریزوں کی مرضی کے تابع رہے ، لیکن ریاست کشمیر کے مسلمانوں کی ہمدردی کے نام پر انھوں نے جولائی ۱۹۳۱ء میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا گھڑاگ رچایا اور آج تک صرف کشمیر ہی کا ذکر چھیڑتے ہیں ۔ کیا مسلمانوں کے مصائب کشمیر کے سوا اور کسی خطہ میں نہ تھے ، کیا صرف کشمیر کے مسلمان ہی مسلمانانِ عالم میں ہمدردی کے مستحق تھے اور کیا ریاست کشمیر کی آزادی ہی عالم اسلام کی

دیرینیوں کا مستند اصل ہے ۔ اگر قادیانی کشمیر کے معاملہ میں اسلام اور مسلمانوں کی خاطر مخلص ہوتے تو اس کا اعتراف نہ کرنا بخل ہوتا بلکہ شقاوت کے مصداق ۔ لیکن معاملہ دوسرا تھا ۔ مرزائی کشمیری مسلمانوں کی سادہ فطرت سے واقف تھے کہ وہ مذہبی سٹہ بازوں کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ دوسرے قادیان اور جموں متصل علاقے تھے ۔ اُدھر مرزائی جس قادیانی ریاست کا خواب دیکھتے تھے اس کی تعبیر کے لیے جموں و کشمیر حسب حال تھے ۔

پاکستان نے اپنی آزادی کے تیسرے مہینے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کشمیر کا مطالبہ کیا تو اس جنگ میں قادیانی امت نے الفرقان کو دیکھی ۔ اس نے فرقان بٹالین کے نام سے ایک پلاٹون تیار کی جو سیالکوٹ کے نزدیک جموں کے محاذ پر واقع گاؤں معراجکے میں متعین کی گئی ۔ اس نے وہاں کیا خدمات انجام دیں ؟ اس کے تذکرہ و انتشار کا محل نہیں لیکن اس وقت پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل سر ڈگلس گریسی تھے جن کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ پاکستان کی فوج کو کشمیر میں استعمال کرنے کے خلاف تھے اور نہ شخصی طور پر کشمیر کی لڑائی کے حق میں تھے بلکہ ان کی معرفت بعض معلومات ہندوستان کے کمانڈر انچیف جنرل سر آکن لیک تک پہنچتی گئیں ۔ قائد اعظم اس وقت سرطان کے مرض میں مبتلا تھے ۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا تو ان کا مرض شدید ہو گیا ۔

کسی کمانڈر انچیف نے کسی رضاکارانہ ادارے کی ایسی بٹالین پر کبھی صاد نہیں کیا ۔ جیسا کہ فرقان بٹالین تھی ۔ فرقان بٹالین کو یہ شرف بخشا گیا کہ جنرل گریسی نے بطور کمانڈر انچیف تحسین و ستائش کا خط و پیغام لکھا جو تاریخ احمدیت جلد ششم مؤلفہ دوست محمد شاہد کے صفحہ ۳۰۰ پر موجود ہے ۔

بات معمولی ہے لیکن عجیب ہے کہ کشمیر کے محاذوں کی جنگ میں قادیان سے ملحق سرحدات کی کمان ہمیشہ مرزائی جرنیلوں کے ہاتھ میں رہی ہے ۔ چونکہ یہ ایک فوجی عمل ہے لہٰذا اس کا ذکر مناسب نہیں ۔ لیکن سوال ہے کہ فرقان بٹالین ہو یا اس کے بعد ۱۹۶۵ء کی جنگ جو کشمیر سے شروع کی گئی کہ وہاں چھمب اور جوڑیاں کا کا محاذ پٹھانکوٹ اور قادیان کی طرف تھا ۔ ابتداً ان محاذوں کی کمان جنرل اختر ملک اور بریگیڈیر عبدالعلی ملک کے ہاتھ میں تھی جو سگے بھائی ہونے کے علاوہ قادیانی العقیدہ تھے ۔ جنرل اختر ملک ترکی میں وفات پا گئے ۔ اُن کی نعش وہاں سے ربوہ لائی گئی جہاں بہشتی مقبرے سے باہر ہمیشہ کی نیند سو رہے ہیں ۔ پنجاب ٹیکسٹ بک کی پانچویں اور چھٹی جماعت کی تاریخ و جغرافیہ کے نصاب میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کا ہیرو جنرل اختر ملک اور بریگیڈیر عبدالعلی کو بنایا گیا اور اول الذکر کی رنگین تصویر شائع کی گئی ہے ۔

ایک دوسری تصویر جنرل ابرار حسین کی بھی ہے لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ کو اس طرح گڈمڈ کرنا اور صرف جنرل اختر حسین ملک یا بریگیڈیئر عبدالعلی کا ذکر کرنا مرزائی امت کا پنجاب میں نئی پود کو ذہناً اپنی طرف منتقل کرنے کا شاخسانہ ہے۔ عزیز بھٹی وغیرہ کو نظر انداز کر کے اور اس وقت کے آتش بجانوں کے سر سے گزر کے جنرل اختر ملک کو قومی ہیرو بنایا جانا اور پڑھانا قادیانی سیاست کی شوخی ہے جو حصول اقتدار کی آئندہ کوششوں میں رنگ و صدف کا کام دیگی۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ جنرل اختر ملک کے تذکرے کی رعایت سے اس ضمن کی دو باتیں حافظہ میں اور تازہ ہوگئیں۔

۱۔ نواب کالا باغ نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے واقعات پر گفتگو کرتے ہوئے راقم سے بیان کیا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اللہ تعالیٰ نے ہماری محافظت کی ورنہ صورت حال کے پامال ہونے کا امکان تھا۔

نواب صاحب نے فرمایا مرزائی پاکستان میں حصول اقتدار سے مایوس ہو کر قادیان پہنچنے کے لیے مضطرب ہیں۔ وہ بھارت سے مل کر یا بھارت سے لڑ کر ہر صورت میں قادیان چاہتے ہیں اور اس غرض سے پاکستان کو بازی پر لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔ ایک دن میرے ہاں جنرل اختر حسین ملک آئے اور میرے ملٹری سیکرٹری کرنل محمد شریف سے کہا کہ میں نے جنرل ملک سے اگر ملاقات کی تو صدر ایوب جو مجھ سے پہلے ہی بدظن ہو چکے ہیں اور بدظن ہوں گے اور یہ عین اتفاق ہے کہ میں بھی اعوان ہوں، جنرل ملک بھی اعوان ہے اور تم (ملٹری سیکرٹری) بھی اعوان ہو، صدر ایوب کے کان میں الطاف حسین (ڈان) نے بات ڈال رکھی ہے اس سے کسی امریکن نے کہا ہے کہ نواب کالا باغ ایوب خاں کے خلاف اندر خانہ خود صدر بننے کی سازش کر رہا ہے۔

اس وقت تو جنرل ملک لوٹ گئے لیکن چند دن بعد نتھیا گلی میں ملاقات کا موقع پیدا کر لیا۔ کہنے لگے: میں صدر ایوب کو آمادہ کر رہا ہوں کہ یہ وقت کشمیر پر چڑھائی کرنے کے لیے بہترین ہے۔ یقین ہے کہ ہم کشمیر حاصل کر پائیں گے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بیٹھے بٹھائے جنرل کو یہ کیا سوجھی؟ بہر حال میں نے عذر کر دیا کہ میں تو زرعی ایکسپرٹ ہوں نہ مجھے جنگ کے مبادیات کا علم ہے۔ آپ خود ان سے تذکرہ کریں۔ انھوں نے کہا کہ صدر نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس لڑائی کے جلد بعد بھارت براہ راست پاکستان کی بین الاقوامی سرحدوں پر حملہ کر دیگا۔

میں نے کہا صدر مجھ سے پہلے ہی بدگمان ہے۔ وہ لازماً خیال کریگا کہ احمدی اس کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں۔

جنرل اختر ملک میرے جواب پا کر چلے گئے۔ اسی اثنا میں سی آئی ڈی کی معرفت مجھے ایک دستی اشتہار ملا جو آزاد کشمیر میں کثرت سے تقسیم کیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ "ریاست جموں و کشمیر انشاء اللہ آزاد ہوگی اور اس کی فتح و نصرت احمدیت کے ہاتھوں ہوگی"۔

(پیشگوئی مصلح موعود)

اور میرے لیے یہ ناقابل فہم نہ تھا کہ جنرل اختر ملک اس پیشگوئی کو سچا بنانے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔

راقم نے نواب کالاباغ کی یہ گفتگو محترم مجید نظامی ایڈیٹر نوائے وقت کو بیان کی تو انہوں نے تائید کی کہ ان سے بھی نواب صاحب یہی روایت کر چکے ہیں۔

جو۔ ڈاکٹر جاوید اقبال سے ذکر آیا تو حیران ہوتے فرمایا کہ اس جولائی میں سر ظفر اللہ خان نے مجھے امریکہ میں کہا تھا کہ میں صدر ایوب کو پیغام دوں کہ یہ وقت کشمیر پر چڑھائی کے لیے موزوں ہے، پاکستانی فوج ضرور کامیاب ہوگی جہاں تک ہندوستان کے ہاتھوں بین الاقوامی سرحد کے آلودہ ہونے کا تعلق ہے۔ ایسی کوئی چیز نہ ہوگی۔ میں نے صدر ایوب سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا، مجھ سے کہہ رہا ہے اور کسی سے نہ کہنا۔

صدر ایوب کو سر ظفر اللہ خاں نے پیغام دے کر اور جنرل اختر ملک نے خود حاضر ہو کر علاوہ دوسرے زعماء کے یقین دلایا تھا کہ کشمیر پر حملہ کرنے سے بھارت اور پاکستان میں براہ راست جنگ نہ ہوگی۔ لیکن پاکستانی فوجیں جب کشمیر کی طرف بڑھنے لگیں تو پاکستان کی بین الاقوامی سرحدیں ایکا ایکی بھارتی فوج کے حملہ کا شکار ہو گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کو ہندوستان کے تابع کرنے اور اس کی جغرافیائی حیثیت کو نئی صورت دینے کے لیے عالمی استعمار کا جو منصوبہ تھا اس کو پروان چڑھانے کے لیے پاکستان کے بعض پر اسرار لیکن مخفی و معلوم ہاتھ بھی تھے۔ قدرت نے استعماری منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ مغربی پاکستان میں پنجاب کو بالواسطہ یا بلا واسطہ شکست پر تو پاکستان کا عسکری بازو ٹوٹ جائے گا اور مشرقی پاکستان نتیجۃً الگ ہو جائے گا۔ پنجاب کی پسپائی کے بعد سرحد، بلوچستان اور سندھ بھی ان

ریاستوں یا عرب ریاستوں کی طرح چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن جائیں گے۔

کشمیر اور احمدیت کے بارے میں اس سے پہلے یہ بات سطور بالا میں رہ گئی ہے کہ قادیانی امت نے تحریک کشمیر (قبل از آزادی) اور جنگ کشمیر (بعد از آزادی) میں صرف اس لیے حصہ لیا کہ مرزا بشیر الدین محمود جس قادیانی ریاست کا خواب دیکھتے تھے ان کی نگاہ میں کشمیر موزوں تھا۔ جماعت احمدیہ کی کشمیر سے دلچسپی کا سبب دوست محمد شاہد نے تاریخ احمدیت جلد ششم صفحہ ۴۴۰ تا ۴۴۹ میں مرزا محمود کی روایت سے لکھا ہے کہ:

۱۔ وہاں مسیح اول دفن ہیں اور مسیح ثانی (غلام احمد) کے پیروؤں کی بڑی جماعت آباد ہے۔

۲۔ وہاں تقریباً اسی ہزار احمدی ہیں۔

۳۔ جس ملک میں دو مسیحوں کا دخل ہو اس ملک کی زرخیز اراضی کا حق احمدیوں کو پہنچتا ہے۔

۴۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نواب امام الدین کو گورنر بنا کر کشمیر بھیجا تھا تو ان کے ساتھ مرزا غلام احمد کے والد بطور مددگار گئے تھے۔

۵۔ حکیم نورالدین خلیفہ اول مرزا محمود کے اُستاد اور خسر شاہی حکیم کے طور پر کشمیر میں ملازم رہے تھے۔

ان نکات ہی کو ملحوظ رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ قادیانی اُمت کی کشمیر سے ہمدردی کسی عام انسانی مسئلہ یا عام مسلمانوں کی ہمدردی کے جذبہ سے نہیں تھی نہ ہے بلکہ وہ اپنے شخصی تعلق اور جماعتی مفاد کے لیے پورے پاکستان اور تمام مسلمانوں کو استعمال کرتے رہے ہیں۔

بلوچستان کو احمدی ریاست بنانے کا خواب پراگندہ ہو گیا۔ (اس کے لیے ہم شاہ ایران کے ممنون و شکر گزار ہیں) اُدھر کشمیر سے متعلق ۱۹۴۸ء و ۱۹۶۵ء کی دونوں سعییں بے نتیجہ رہیں۔ اِدھر ۱۹۶۵ء کے بعد برعظیم سے متعلق عالمی استعمار نے کانٹا بدلا۔ قادیانی امت کا اس کے ساتھ بدلنا ایسا ہی تھا جیسے انجن مڑتے ہی گاڑی مڑ جاتی ہے۔ اب پاکستان کو ملیامیٹ کرنے کی استعماری کوششوں میں سے ایک کوشش یہ تھی کہ:

۱۔ مشرقی پاکستان کو الگ کیا جائے۔ قادیانی عقلاء نے وہ سب کچھ کیا جو اس کے لیے ضروری تھا انہوں نے مشرقی پاکستان کے بیچ شکایات کو جنم دیا۔ پھر پروان چڑھایا۔ ایم ایم احمد نے حکومت پاکستان کے فنانس سیکرٹری بالا شیرا و منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین کی حیثیت سے بنگالیوں کو ستائے بھی

اور بیزار کر دیا کہ وہ علیحدگی کی تحریک میں ڈھل گئے۔ مشرقی پاکستان کے مصیبت زدگان کو سرکاری امداد سے محروم رکھا گیا اور اس کے مسئول ایم ایم احمد تھے۔

۲۔ جب تک مشرقی پاکستان علیحدہ نہ ہوا قادیانیوں کے لیے پاکستان میں اقتدار کا سوال خارج از بحث تھا۔ کیونکہ اکثریت مشرقی پاکستان کی تھی اور شیخ مجیب الرحمٰن قادیانی امت کی ان حرکات کو بھانپ کر ان سے باخبر ہو گئے تھے وہ ایم ایم احمد کی حرکات پر پبلک میں بیان دے چکے اور ان کی فوری علیحدگی کے خواہاں تھے۔ اس بیان کے فوراً بعد چوہدری ظفر اللہ خان ان سے ملنے ڈھاکہ گئے۔ دوسرے یا تیسرے دن تخلیہ میں ملاقات ہوئی اور راز فردہی ہوا جو مرزائی امت کے ظفر اللہ خان یا ایم ایم احمد سے ٹکراؤ کا نتیجہ ہو سکتا تھا کہ ایم ایم احمد کو علیحدہ کرنے سے پہلے مجیب الرحمٰن پاکستان سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو گئے۔

۳۔ اب مرزائی تمام تجربوں کے حسب مراد نہ پاک پاکستان میں عالمی استعمار کا آخری ناٹک کھیل رہے ہیں۔ انہوں نے امریکہ کے یہودیوں کی طرح ملک کی مالیات (بینکنگ، انشورنس اور انڈسٹری) میں اس قسم کا اقتدار حاصل کر لیا ہے کہ انہیں ان کے پس منظر، پیش منظر اور تہ منظر سے خارج نہیں کیا جا سکتا اب ان کے اقتدار کی راہ میں یہ چیزیں معاون ہو سکتی ہیں اور یہ کتنا جرم نہ ہوگا کہ پاکستان کی فضائیہ اپنے چیف سے لے کر آئندہ جانشینوں کی ایک کڑی تک ان کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح بری فوج کے دو ڈویژنوں کا تعلق (جنرل عبدالعلی اور جنرل عبدالحمید) ان کے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ڈار بندی ہوئی ہے۔

۴۔ ملک کی بعض اہم آسامیاں قادیانی لے رہے ہیں۔ مثلاً پنجاب میں ٹیکسٹ بک بورڈ کا چیئرمین غالب احمد قادیانی ہے پنجاب اور بہاولپور کے علاقہ کی انشورنس کارپوریشن کا جنرل منیجر جعفر صاحب قادیانی ہے۔ لاہور میو ہسپتال کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ قادیانی ہے۔ غرض ایسے کئی ادارے قادیانی امت کے ہاتھ میں ہیں، جہاں اس کے افراد کی بڑی سے بڑی اکثریت معاشی طور پر پرورش پا سکتی اور سیاسی طور پر اقتدار کی راہیں ہموار کرتی ہے۔

۵۔ ابھی تک پریس قادیانی امت کے ہاتھ نہیں آسکا لیکن وزارت اطلاعات و نشریات کی معرفت پریس کو مغلوب کر دیا گیا ہے۔ اور ملک کے بیشتر ورکنگ جرنلسٹوں میں کرپشن کی نیو رکھ دی گئی ہے جس کی بدولت قادیانیت کے بیچ و خم کا مسئلہ خارج از احتساب ہو چکا ہے۔

۱۰۔ ملک کے بعض اہلِ قلم اسرائیلی صحافت کو بالواسطہ و بلاواسطہ مختلف شکلوں میں معاوضہ دے کر اس قسم کے مضمون لکھواتے جا رہے ہیں جن سے قادیانی اُمت کے مخالفین ضعیف ہوتے جائیں اور باہمی انتشار و افتراق کو ہوا ملتی رہے جو ان کے آئندہ اقتدار کی ضروری اساس ہے۔

۱۱۔ سرحد و بلوچستان کی علیحدگی سے متعلق بالکل انہی خطوط پر قادیانی امت اقدام و کلام کا انبار لگا رہی ہے۔ جن خطوط پر شیخ مجیب الرحمٰن کو لگایا جا رہا تھا۔ مرزائی اُمت بظاہر پیپلز پارٹی کے ساتھ ہے لیکن اُس کے مختلف نوجوان مختلف پارٹیوں میں حسبِ ہدایت شامل ہیں۔ پنجاب نیشنل عوامی پارٹی میں ایک ایسا احمدی نوجوان شریک ہے جس کا بھائی بڑے وثوق سے کراچی کا ڈپٹی کمشنر ہے اور باپ مرزا غلام احمد کا صحابی ایک زمانہ میں لیگ کا قانونی مشیر تھا۔ قادیانی امت کا طرزِ عمل یہ ہے کہ مذمت کے روپ میں سرحد و بلوچستان کی سیاسی فضا کو اتنا مسموم کر دیا جائے کہ علیحدگی کا مطالبہ حقیقت بن جائے جب عالمی استعمار کی خواہش کے مطابق پاکستان جو کبھی مغربی پاکستان تھا کئی ریاستوں مثلاً پختونستان، بلوچستان اور سندھو دیش وغیرہ میں تقسیم ہو تو پنجاب میں حکمران طاقت یا سکھوں کے ساتھ مشترکہ طاقت کی سربراہی ان کے ہاتھ میں ہو۔

مرزائی سیاست کا نقشہ یہ ہے کہ عالمی استعمار اس پاکستان کو ضرب و تقسیم سے تین چار ریاستوں میں بانٹنے کا ارادہ کر چکا ہے۔ پختونستان بنے گا، بلوچستان بنے گا۔ سندھو دیش بنے گا۔ ان کے اضلاع میں تھوڑا بہت رد و بدل ہو گا۔ ہو سکتا ہے سندھ کا کچھ علاقہ بھارتی راجستھان کو چلا جائے۔ پختونستان میں پنجاب کے ایک دو اضلاع آ جائیں، بلوچستان سندھ کے ایک دو اضلاع لے جائے اور پنجاب میں ڈیرہ غازی خان کے ضلع پر اس کی نگاہ ہو۔ لیکن جتنی جلدی یہ ہو قادیانی اپنے لیے اتنا ہی مفید سمجھتے ہیں۔ قادیانی اُمت کی اس صف بندی کا حاصل کلام یہ ہے کہ اپنے اس اتفاقی مقصد کے بعد پاکستان ختم ہو جائے گا تو سکھ استعماری شہ اور بھارتی تعاون سے پنجاب پر اپنے اس استحقاق کا دعویٰ کریں گے کہ وہ ان کے گوروؤں کی نگری ہونے کے باعث اُن کا ہے۔ جس طرح یہود نے فلسطین کو اپنے پیغمبروں کے مولد و مسکن و مرقد ہونے کی بنا پر حاصل کیا اور اسرائیل بنا ڈالا۔ اسی طرح پنجاب سکھوں کے لیے ہو گا۔ بعض معلوم وجوہ کے باعث پنجاب اُس وقت پختونستان، سندھو دیش اور بلوچستان کی ناراضی میں گھرا ہو گا۔ مرزائی امت گوروؤں کی نگری کے مالکین سے معاہدہ کر کے اپنے "مدینۃ النبی" قادیان کی مراجعت پر خوش ہو گی۔

تب عالمی استعمار کی مداخلت سے ایک نیا پنجاب پیدا ہوگا جو سکھ احمدی ریاست ہوگا اور جس کا پاکستانی وجود ختم ہو جائے گا۔

پاکستان کا اصل خطرہ یہ ہے کہ پنجاب اس خوفناک سانحہ کی زد میں ہے اور نہ جانے حزب اقتدار اور حزب اختلاف اس بارے میں کیوں غور نہیں کرتے۔ اس سیاسی مسئلہ کا اس وقت تعاقب نہ کیا گیا اور ایک پولیٹیکل خطرہ کے طور پر اس کا محاسبہ نہ کیا گیا تو کیا پاکستان کی آنکھ اس وقت کھلے گی جب طوفان سر سے گزر چکا ہوگا اور پاکستان کی تاریخ استعماری انقلاب کے ہاتھوں الٹ چکی ہوگی تب مورخ یہ لکھیں گے کہ ان علاقوں میں ایک ایسی قوم رہتی تھی جس نے اپنے مسلمان ہونے کی بنیاد پر برعظیم ہندوستان سے کٹ کے ایک علیحدہ ملک پاکستان بنایا تھا لیکن اس پر تیسری یا چوتھی دہائی بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ اپنی مجرمانہ غفلتوں اور احمقانہ سرگرمیوں سے اس ملک کو خود مٹا ڈالا اور اب وہ ملک و قوم ماضی کی ایک خطرناک یاد کا المناک تتمہ ہیں!

اس پمفلٹ کی آواز ہر گوشہ میں پہنچ گئی اور یہ شرف اس دور میں بفضل تعالیٰ 'چٹان' ہی کو حاصل ہوا کہ اس نے عوام و خواص میں قادیانیت کو برہنہ کیا۔ حتیٰ کہ سول کے تمام محکموں اور فوج کے ہر سہ شعبوں میں قادیانی مسئلہ اپنے جملہ خطرات سمیت واضح و آشکار ہو گیا۔

جن دنوں (فروری ۱۹۷۴ء) لاہور میں اسلامی ممالک کے سربراہوں کا اجلاس ہوا۔ راقم نے یہ عنوان "اسلام کے غدار" ایک پمفلٹ لکھا۔ اس کے عربی اور انگریزی تراجم نہایت خوبصورت کاغذ پر شائع کئے جب کانفرنس منعقد ہوئی تو راقم نے عربی و انگریزی پمفلٹ کے بنڈل مندوبین اور ان کے ساتھیوں کی قیام گاہوں پر خود جا کر تقسیم کئے اس کے علاوہ قادیانیت سے متعلق علامہ اقبال کے دو مقالے چھپوا کر ہر مندوب تک پہنچائے۔ راقم سے کئی ملکوں کے مندوبوں اور جرنلسٹوں نے کہا کہ انہیں پاکستان سے مختلف مباحث پر بہت سا لٹریچر ملا ہے لیکن وہ اپنے ساتھ "اسلام کے غدار" نام کا پمفلٹ لے جا رہے ہیں کیونکہ ان کے ملک میں قادیانیت کو جاننا ضروری ہو چکا ہے۔ ہم ان کے تبلیغی مشن کو اپنے ہاں ایک سانحہ اور ایک خطرے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اس پمفلٹ کی بعض چیزیں زیر نگاہ کتاب کے بعض پچھلے ابواب میں آ چکی ہیں لیکن سوال تکرار یا اعادہ کا نہیں۔ پمفلٹ کا ہے کہ اس کی اشاعت سے قادیانی امت تمام اسلامی ملکوں کے مطالعہ و اعتقاد میں عریاں ہو گئی۔ بعض عبارتیں قند مکرر ہیں لیکن اس کا پورا متن حسب ذیل ہے۔

مرزا غلام احمد سے مرزا ناصر احمد تک

قادیانی امت کے استعماری خدوخال

علامہ اقبال بیسویں صدی میں برِ عظیم پاک و ہند کے ایک عظیم فلسفی تھے۔ انہوں نے اس برِ عظیم کو دو چیزیں دی ہیں:

۱۔ مشترکہ ہندوستان کو برطانوی غلامی کے خلاف انقلابی تو، مگر ان کی شاعری میں غیر ملکی غلامی کے خلاف احتجاج بھی تھا اور اجتماعی جد و جہد کی ایک دعوت بھی ـــ اردو شاعری نے ان کے رشحاتِ قلم سے نئے بال و پر حاصل کیے۔

۲۔ وہ ہندوستان میں اسلامی فکر کے احیائی شاعر تھے۔ ان کا فلسفہ قرآن کی دعوت اور پیغمبر کی سیرت پر تھا۔ وہ ملتِ اسلامیہ کی عظمتِ رفتہ کو لوٹانے کے متمنی اور عصرِ حاضر کے دور معاشرے میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے داعی تھے۔

پاکستان انہیں اپنے وجود کا مصور گنتا اور اپنی قومی زندگی کا سب سے بڑا ذہن تسلیم کرتا ہے۔ اُدھر ہندوستان، انہیں اپنی ذہنی عظمتوں میں شمار کرتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں شدید سیاسی تناصد کے باوجود دونوں ملکوں نے پورا سال علامہ کی پیدائش کے صد سالہ جشن کا اعلان کیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو مہاتما گاندھی کے بعد ہندوستان کے سب سے بڑے راہنما تھے۔ ہندوستان آزاد ہوا، تو وہ پہلے وزیرِ اعظم منتخب کیے گئے اور اپنی موت تک اسی عہدہ پر متمکن رہے۔ انہوں نے اپنے بعض خطوط کے علاوہ اپنی کتاب تلاشِ ہند DISCOVERY OF INDIA میں اقبال کی فکری سیادت کا خراج ادا کیا ہے ـــ اقبال نے احمدیت (قادیانیت) کا محاسبہ کیا تو نہرو نے ان سے بحث چھیڑ دی اور احمدیت کو ملتِ اسلامیہ کا جزو قرار دے کر بالواسطہ اس کا دفاع کیا۔

۱۔ مرزا غلام احمد کے پیرو کار اپنے تئیں احمدی کہتے اور اپنی مذکورہ جماعت کو احمدیہ کا نام دیتے ہیں۔ چونکہ مرزا صاحب کا مولد، مسکن اور مدفن قادیان ہے اس لیے مسلمان انہیں قادیانی کہتے ہیں یا مرزا غلام احمد کی [illegible] کے باعث مرزائی لکھتے ہیں۔ اس کتابچہ میں مرزائی اور قادیانی کے بجائے جہاں تہاں احمدی لکھا گیا ہے، وہ پاکستان سے باہر کے ملکوں کو بتانے کے لیے، جہاں اسی نام سے وہ متعارف کیے جاتے ہیں۔

علامہ نے اس کا مسکت جواب دیا۔ جواہر لال سپر انداز ہو گئے۔ علامہ نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ احمدیت کی مفید خدمات کا صلہ دینے کی مجاز ہے لیکن مسلمانوں کے لیے احمدیت کو نظر انداز کرنا خطرہ کا باعث ہے۔ اس طرح نہ صرف ملت اسلامیہ کی وحدت ختم ہوتی، بلکہ محمد عربی کی اُمت کا شیرازہ بکھر کر تشتت و افتراق کی راہیں کھلتی ہیں اور ان کے بنیادی معتقدات کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ اور پنڈت جواہر لال نہرو میں قلم کے تعلقات تھے۔ پنڈت جی نے حضرت علامہ سے احمدیت کے متعلق استفسار کیا، تو اس کے جواب اور ان مضامین کے سلسلہ میں علامہ نے پنڈت جی کو لکھا:

"اس کے متعلق میرے ذہن میں کوئی شک نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔"

پنڈت جی نے اپنے نام بڑے آدمیوں کے خطوط کا ایک مجموعہ (A BUNCH OF OLD LETTERS) شائع کیا ہے، اس میں علامہ کا محولہ بالا خط موجود ہے۔

احمدیت کیا ہے؟

مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرو کار احمدی کہلاتے اور ان کے مسلک و مشرب کا عرف احمدیت ہے۔ مرزا کا خاندان سکھوں کے عہد اقتدار میں اُن کی فوج میں ملازم تھا۔ (ملاحظہ ہو سر لیپل گریفن کی تالیف۔ رئیسان پنجاب) اُن کے دادا عطا محمد اور عطا محمد کا والد گل محمد سکھوں کی طرف سے لڑتے رہے۔ عطا محمد سردار فتح سنگھ اہلووالیہ کی چاکری میں بارہ سال بیگووال رہا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے عطا محمد کی رحلت کے بعد اُس کے بیٹے غلام مرتضیٰ (والد مرزا غلام احمد) کو واپس بلا لیا۔ جدی جاگیر کا ایک حصہ عطا کیا۔ غلام مرتضیٰ مہاراجہ کی فوج میں داخل ہو گیا اور کشمیر کی سرحدوں کے علاوہ بعض دوسرے مقامات میں مسلمانوں کی سرکوبی پر مامور ہوا۔ غلام مرتضیٰ نے سکھوں کی فوج میں بھرتی ہو کر ہری سنگھ نلوہ کے زیر قیادت پٹھانوں پر طور خم تک چڑھائی کی۔ حضرت سید احمدؒ اور ان کی جماعت کو بالاکوٹ میں شہید کرنے والی فوج میں شامل تھا۔ انگریزوں نے پنجاب فتح کیا، تو وہ اور اس کے بھائی ان کے ہو گئے اور سات سو روپے پنشن حاصل کی۔ مرزا غلام قادر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کو شانے کے لیے جنرل نکلسن کی فوج میں تھا۔ اس نے ۴۶ نیو انفنٹری (سیالکوٹ) کے باغی نوجوان کو جنرل نکلسن کے

ساتھ دردناک اذیتیں دے کر ہلاک کیا۔ جنرل نکلسن نے لکھا کہ قادیان کے تمام دوسرے خاندانوں سے یہ خاندان نمک حلال رہا ہے۔ مرزا صاحب نے اپنی ان گنت کتابوں میں انگریزوں سے اپنی غیر متزلزل وفاداری کا اعتراف کیا اور اس پر فخر و ناز کیا ہے۔ اور خلاصہ اس کا خود مرزا صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ وفاداری کی ان کتابوں سے پچاس الماریاں بھرتی ہیں۔

احمدیت کا آغاز

مرزا غلام احمد ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت ان کی عمر سولہ یا سترہ برس کی تھی۔ ابتداءً ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کے دفتر میں قلیل تنخواہ پر محرری کی اور ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۸ء تک ملازم رہے۔ ۱۸۶۹ء کے شروع میں برطانوی ایڈیٹروں اور مسیحی راہنماؤں کا ایک وفد اس غرض سے ہندوستان آیا کہ ہندوستانی عوام میں وفاداری کیونکر پیدا کی جا سکتی اور مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو سلب کر کے انہیں کیونکر رام کیا جا سکتا ہے۔ اس وفد نے ۱۸۷۰ء میں واپس جا کر دو رپورٹیں مرتب کیں۔ ان میں برطانوی سلطنت کا ہندوستان میں ورود — (THE ARRIVAL OF THE BRITISH IN INDIA) کے مرتبین نے لکھا کہ:

> "ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اپنے روحانی راہنماؤں کی اندھا دھند پیروکار ہے۔ اگر اس وقت ہمیں ایسا کوئی آدمی مل جائے جو اپاسٹالک پرافٹ (حواری نبی) ہونے کا دعویٰ کرے تو اس شخص کی نبوت کو حکومت کی سرپرستی میں پروان چڑھا کر برطانوی مفادات کے لیے کام لیا جا سکتا ہے۔" (تلخیصات)

مرزا صاحب اس غرض سے نامزد کیے گئے۔ انہوں نے پہلے تو ایک مناظر کا روپ دھارا کہ پادریوں کے تابڑ توڑ حملوں سے مسلمان ناخوش تھے۔ گویا مرزا صاحب مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ابتداءً اس طرح نمودار ہوئے۔ پھر ایک جماعت پیدا کر کے ۱۸۸۰ء میں ملہم من اللہ ہونے کا اعلان کیا۔ پھر اپنے مجدد ہونے کا نادر چھوڑا۔ دسمبر ۱۸۸۸ء میں اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیعت لینے کا حکم فرمایا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا اور اپنے ظلی نبی ہونے کی اصطلاح ایجاد فرمائی۔ نومبر ۱۹۰۴ء میں اپنے کرشن ہونے کا بیان داغا۔ اس دوران میں یہ کارنامہ بھی سرانجام دیا کہ آریہ سماج سے ٹکراؤ پیدا کیا۔ ہندوستان سے متعلق کڑوی باتیں لکھیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سوامی دیانند کی ستیارتھ پرکاش کا آخری باب حضور سرور کائنات کے خلاف دریدہ دہنی سے لکھا گیا اور یہ بدنظمی کے

مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے سے لڑانے بھڑانے اور کٹانے کا برطانوی حربہ تھا۔

حرمت جہاد اور اطاعت برطانیہ

مرزا صاحب نے اپنی نبوت کا آغاز ان دعاوی سے کیا کہ:

(۱) "میرے پانچ اصول ہیں جن میں دو حرمت جہاد اور اطاعت برطانیہ ہیں"

(تبلیغ رسالت از غلام احمد صفحہ ۱۰۲)

(۲) میں نے مخالفت جہاد کو پھیلانے کے لیے عربی و فارسی کتابیں تالیف کیں اور وہ تمام عرب، شام، مصر، بغداد اور افغانستان میں شائع کی گئیں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ کسی نہ کسی وقت ان کا اثر ہوگا۔

(تلخیص از تبلیغ رسالت جلد ۸، صفحہ ۲۰۲ مصنفہ غلام احمد)

(۳) "میں نے ۲۲ برس سے اپنے ذمہ یہ فرض لے رکھا ہے کہ وہ تمام کتابیں جن میں جہاد کی مخالفت ہو، اسلامی ملکوں میں ضرور بھیج دیا کروں گا۔" (تبلیغ رسالت جلد ۱۰، صفحہ ۲۸)

(۴) "میں سولہ برس سے متواتر اپنی تالیفات میں اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ مسلمانانِ ہند پر اطاعت گورنمنٹ برطانیہ فرض اور جہاد حرام ہے۔" (تبلیغ رسالت، جلد سوم صفحہ ۲۲)

(۵) "مجھے مسیح و مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار ہے۔" (تبلیغ رسالت جلد ہفتم)

یہ تھا باپ کا کلام، بیٹے کا ارشاد ہے کہ:

(۶) "حضرت مسیح موعود نے اپنی پاک تعلیم میں گورنمنٹ عالیہ کی اطاعت و وفاداری کو جزو مذہب قرار دے کر ان منافق مسلمانوں سے ہمیں علیحدہ کر دیا جو خونی مہدی کے انتظار میں ہیں کہ وہ عیسائی سلطنتوں کو مٹا کر اہل اسلام کے مسلمانوں کو حکمران بنا دے گا۔" (الفضل، جلد ۴، نمبر ۹۰، یکم مئی ۱۹۱۷ء)

(۷) "ہمارے سر پر سلطنت برطانیہ کے بہت احسان ہیں۔ وہ مسلمان سخت جاہل، سخت نادان اور سخت نالائق ہے جو اس گورنمنٹ سے کینہ رکھے۔ اس گورنمنٹ کا شکر ادا نہ کریں تو ہم خدا کے بھی ناشکر گزار ہوں گے۔ خدا کا مسیح تو کہتا ہے کہ ہر مسلمان کو انگریزوں کی کامیابی کے لیے دعا کرنی چاہیے لیکن جاہل، نادان اور نالائق مسلمان

کہتا ہے کہ انگریزوں کو شکست ہو تو زیادہ بہتر ہے۔" (الفضل ۵ رجون ۱۹۴۴ء خطبہ مرزا بشیر الدین محمود)

(۸) "بعض احمق سوال کرتے ہیں، اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ یہ گورنمنٹ ہماری محسن ہے۔ اس کا شکر ادا کرنا فرض اور واجب ہے۔ محسن کی بدخواہی ایک بدکار اور حرامی کا کام ہے۔"

(الفضل، جلد ۲۶، ۱۲ ستمبر ۱۹۳۹ء)

(۹) مسیح موعود (مرزا غلام احمد) فرماتے ہیں: میں مہدی ہوں، برطانوی حکومت میری تلوار ہے، ہمیں بغداد کی فتح سے کیوں خوشی نہ ہو؟ عراق، عرب، شام، ہم ہر جگہ اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں۔"

(الفضل، جلد ۵، نمبر ۴۲ مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۱۸ء)

(۱۰) "ہم نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنا خون بہانے اور جان دینے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔"

(تبلیغ رسالت جلد ہفتم، مرزا غلام احمد) ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء

پس منظر و پیش منظر

مرزا صاحب ان دعاوی کو لے کر میدان میں آئے، تو برِ عظیم میں مصالح و مقاصد کا نقشہ یہ تھا کہ:

(۱) سارا ملک برطانوی اقتدار کے شکنجہ میں آچکا تھا لیکن مسلمانوں کے دل و دماغ میں جہاد کا جو عقیدہ راسخ تھا، انگریز اس کی ناقابلِ تسخیر سپرٹ سے پریشان تھے، مسٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی تصنیف "ہمارے ہندوستانی مسلمان" ظاہر کرتی ہے کہ انگریز جہاد کی اس روح سے کیونکر ہراساں تھے، اس کے علاوہ اور بہت سی برطانوی یادداشتیں، مسلمانوں کے جذبۂ جہاد سے انگریزوں کی سراسیمگی ظاہر کرتی ہیں۔

(۲) انگریز سب سے پہلے بنگال پر قابض ہوئے۔ ۱۸۵۷ء سے کہیں پہلے بنگال کے مسلمانوں کو ان کی طویل مزاحمت سے بے دست و پا کر چکے تھے۔ ان کے بیشتر دیار کے علاقوں میں انگریزوں کے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہاں بعض علماء کی طرف سے اس قسم کے فتوے چل رہے تھے اور محمڈن سوسائٹی کلکتہ نے بھی مکہ معظمہ کے بعض علماء سے اسی قسم کا فتویٰ حاصل کر کے شائع کیا تھا کہ ہندوستان دارالحرب نہیں، دارالاسلام ہے۔

(۳) تقسیم سے پہلے جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے اور یہ صوبے بنگال سے ادھر صوبہ بہار سے شروع ہو کر دہلی تک تھے اور دہلی سے آگے پنجاب تھا۔ ان کی حد بندی اس طرح کی گئی کہ مسلمان وسط ہند کے تمام صوبوں میں عمدًا اقلیت میں تھے سلطنت اودھ کے مسلمانوں کو مغلوب کر دیا گیا اور دہلی کے مسلمان بے حیثیت ہو چکے تھے حتیٰ کہ آخری فرمانروا بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے رنگون میں جلاوطن کیا گیا اور قید رکھا گیا۔ اب مسئلہ شمال مغربی سرحدی علاقوں کی مسلمان اکثریت کا تھا۔ اس کے تمام علاقے افغانستان سے ملحق تھے اور ان میں جذبۂ جہاد غیر مختتم تھا۔ سرحد، بلوچستان اور سندھ میں انگریز حکمران ہو چکے تھے لیکن مسلمانوں کے جہاد اور انگریزوں کے استعمار میں جھڑپیں جاری تھیں۔

(۴) جنگ امبیلہ (صوبہ سرحد) ۱۸۶۳ء میں ہوئی۔ اس کے مجاہدین و معاونین جو ہندوستان کو دارالحرب کہتے اور جہاد و غزا کو فرض قرار دیتے تھے، انگریزوں کے لیے داخلی طور پر خطرہ تھے۔

(۵) انگریزوں نے ۱۸۶۴ء، ۱۸۶۵ء، ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء میں پٹنہ، راج محل، مالدہ اور انبالہ میں ان علماء اور ان کے معاونین پر پانچ مقدمات قائم کیے جو ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے جہاد کا عزم قائم کیے ہوئے تھے۔ انہیں موت، عمر قید اور ضبطی جائیداد کی سخت سزائیں دے کر پامال کیا گیا۔

(۶) افغانستان میں برطانوی اقتدار کی بیل منڈھے نہ چڑھی تو ۱۸۹۳ء میں سر مارٹیمر ڈیورنڈ نے افغانستان اور ہندوستان کے مابین طورخم کے ساتھ سرحدی لائن قائم کی، جو ڈیورنڈ لائن کہلاتی رہی۔ اور اب بھی سرکاری کاغذوں میں اس کا یہی نام چلا آ رہا ہے۔

(۷) پنجاب مسلمانوں کی اکثریت کا وسیع تر علاقہ تھا۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کو اسی صوبہ ہی کے بل پر ختم کیا اور تجربہ سے اندازہ ہو گیا کہ ان کے لیے پنجاب کا سپاہی ایک عظیم فوجی متاع ہے۔ ہندوستان بھر میں پنجاب برطانوی عملداری کے لیے ریڑھ کی ہڈی تھا۔ یہاں کے رؤسا نے انگریزوں کی توقعات سے کہیں زیادہ برطانوی عملداری کے لیے جاں سپاری اور وفاداری بشرط استواری کا ثبوت دیا تھا۔ پنجاب کی سرحدوں سے منسلک صوبوں میں روح جہاد قائم تھی اور وہ تمام تر پاکستان کے علاقے تھے۔ ان علاقوں سے ملحق افغانستان و ایران تھے، ان سے آگے دور دور تک اسلامی مملکتوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اُدھر ان علاقوں کے شانوں پر ترکی تھا اور برطانوی عملداری روس کو اپنے لیے خطرہ سمجھتی تھی۔ پنجاب کو اپنے قبضہ میں رکھنے اور ان علاقوں سے روح جہاد ختم کرنے کے لیے مرزا غلام احمد کو برطانوی سرکار نے مبعوث کیا۔ برطانوی سرکار کو بزعم خویش یقین تھا

کہ پنجاب ایک ملہم کی معرفت اپنے سانچے میں ڈھالا جا سکتا اور گرد و پیش کے مسلمان اسی طرح زیر کیے جا سکتے ہیں۔ اگر ان علاقوں کے مسلمان زیرِ بند ہوں تو اس ملہم کو پیدا کر کے علما کا محاذ اس کی طرف پھیرا جا سکتا ہے اور اس طرح مسئلہ جہاد ٹل سکتا ہے ــــ مرزا غلام احمد اسی ضرورت ہی کی پیداوار تھے۔

مرزا غلام احمد نے مسلمان عوام کو پادریوں کے خلاف بھڑکایا اور مسیحی عقائد پر رکیک حملے کیے تو پادریوں نے برطانوی سرکار سے شکایت کی کہ مرزا توہینِ مسیحیت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ مرزا نے ملکہ وکٹوریہ کو خط لکھا کہ:

"مشنریوں سے مناظرہ کرتا ہوں تو مسلمانوں میں تنسیخِ جہاد کا اعتبار بڑھتا ہے۔"

ایک دوسری جگہ لکھا کہ:

"میں نے عیسائی رسالہ نورِ افشاں کے جواب میں سختی کی تو اس کا مقصد یہ تھا کہ سریع الغضب مسلمانوں کے وحشیانہ جوش کو ٹھنڈا کیا جائے اور میں نے حکمتِ عملی سے وحشی مسلمانوں کے جوش کو ٹھنڈا کیا۔"

گویا مرزا صاحب پادریوں سے عیسائیت اور اسلام کے زیرِ عنوان جو مناظرے کرتے تھے ... ان کی غرض یہ تھی ــــ ــــ کہ مسلمانوں کا ان پر اعتماد قائم ہو کہ وہ انگریزوں کے فرستادہ نہیں بلکہ جہاد کی منسوخی کا اعلان ایک ملہم کی حیثیت سے خدا کی رضا پر کرتے ہیں۔

مرزا صاحب نے اپنے تئیں نبی منوانے کے لیے بے تحاشا گالی گلوچ کی۔ اس وقت تمام ہندوستان میں پنجاب ہی شاید سب سے ان پڑھ صوبہ تھا۔ اس کے باشندوں کو اس طرح مرعوب کیا کہ:

(۱) "تمام مسلمانوں نے مجھے قبول کر لیا ہے۔ صرف کنجریوں اور بدکار عورتوں کی اولاد نے مجھے نہیں مانا۔"

(آئینہ کمالات صفحہ ۵۴۷)

(۲) جو شخص میرا مخالف ہے وہ عیسائی، یہودی، مشرک اور جہنمی ہے (تبلیغ رسالت جلد ۹، صفحہ ۲۷)

(۳) جو شخص ہماری فتح کا قائل نہیں ہوگا، تو صاف سمجھا جائے گا کہ اس کو ولد الحرام بننے کا شوق ہے اور حرام زادہ کی یہی نشانی ہے۔"

(۴) "ہمارے دشمن بیابانوں کے خنزیر ہو گئے اور ان کی عورتیں کتیوں سے بھی بڑھ گئیں۔"

(نجم الہدیٰ صفحہ ۳۴۹)

مرزا صاحب ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو وفات پا گئے۔ ان کے جانشین حکیم نورالدین خلیفہ اول (مئی ۱۹۰۸ء تا مارچ ۱۹۱۴ء) اور ثانیاً مرزا بشیرالدین خلیفہ ثانی (مارچ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۶۵ء) نے احمدیت کو استوار کی

ایجنسی بنایا۔ اس ایجنسی نے پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں کی بے نظیر خدمات انجام دیں۔ عرب ریاستوں کو مسلمانوں کی دشمنی قطع اور مسلک و مشرب کا فریب دے کران کی قطع و برید کا برطانوی مشن پورا کیا اور جاسوسی کرتے رہے۔ ادھر ہندوستان میں جاسوسی کے مرکزی و صوبائی محکموں سے متعلق رہے۔ مسلمانوں کو برطانیہ سے وفاداری کا سبق اس طرح پڑھایا کران کے روحانی رشتے کی روح مفقود ہو جائے۔ پہلی جنگ عظیم میں بغداد کے سقوط پر چراغاں کیا۔ مدینہ و مکہ کے متعلق حقیقۃ الرؤیا (مصنفہ بشیر الدین محمود) میں لکھا کہ ان کی چھاتیوں سے دودھ خشک ہو گیا ہے۔

قادیان کے متعلق الفضل ۳ جنوری ۱۹۲۵ء میں لکھا کہ وہ تمام جہان کے لیے اُم ہے۔ اس مقام مقدس سے دنیا کو ہر ایک فیض حاصل ہو سکتا ہے۔

الفضل ۱۰ ستمبر ۱۹۳۵ء میں مرقوم ہے کہ ہم ان لوگوں سے متفق نہیں ہو سکتے ہیں کہ کسی صورت میں بھی حرمین پر حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ مدینہ پر بھی چڑھائی ہو سکتی ہے۔"

اس سے پہلے ۱۸ ستمبر ۱۹۳۲ء کے الفضل میں مرقوم تھا کہ "قادیان میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ والی برکات نازل ہوتی ہیں۔ قادیان کا سالانہ جلسہ ظلی حج ہے اور یہ نفل اب فرض بن گیا ہے۔

قادیانی جاسوس

مرزا غلام احمد نے ملک سے باہر جہاد کی تنسیخ اور برطانیہ کی اطاعت سے متعلق ہر قول خود بے پناہ لٹریچر پھیلایا اور اسلامی ملکوں میں تقسیم کرایا۔ ان کا بیٹا بشیر الدین محمود خلیفہ ثانی ایک شاطر انسان تھا۔ اس نے اپنے معتقدین کو انگریزوں کی جاسوسی کے لیے مقرر کیا۔ بعض جگہ مشن قائم کیے۔ بعض جگہ خانہ جنگیاں کرائیں اور بعض جگہ پہلی جنگ عظیم میں عرب ریاستوں کے احوال و آثار چوری کرنے کے لیے اپنے معتقدین بھیجے۔ مثلاً:

۱۔ پہلی جنگ عظیم میں اپنے سالے ولی اللہ زین العابدین کو سلطنت عثمانیہ میں بھیجا۔ اس نے ترکوں کی پانچویں ڈویژن کے انچارج جمال پاشا کی معرفت ۱۹۱۷ء میں قدس یونیورسٹی دمشق میں دینیات کی لیکچر شپ حاصل کی۔ لیکن اس کا کام انگریزی فوجوں کے لیے جاسوسی کرنا تھا کہ وہ دمشق میں کیونکر داخل ہو سکتی ہیں۔ جونہی انگریزی فوجیں دمشق میں داخل ہوئیں وہ انگریزی کمانڈر کے حسب ہدایت مامور ہو گیا اور عربوں کو ترکوں سے جبر لینے کے فرائض انجام دیتا رہا لیکن جب عراقی اس کے جاسوسی خط و خال سے آگاہ ہو گئے تو بھاگ کر قادیان آ گیا اور ناظر امور عامہ ہو گیا۔

۲۔ پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد کلکتہ میں احمدیہ مشن قائم کیا گیا۔ میر محمد سعید حیدرآبادی اس کا انچارج تھا۔ اور وہ کرنل ٹی۔ ڈبلیو۔ لارنس (برطانوی محکمہ جاسوسی کا اہم عہدیدار) کی ہدایت پر کام کرتا تھا۔ اس مشن کے ارکان نے کلکتہ اور ترکی میں برطانوی مصالح کے مطابق تخریب کاری کا جال بچھایا (الفضل ۲۸ ستمبر ۱۹۲۰ء ملاحظہ ہو) آخر جب اللہ مصطفیٰ کمال کے مستحکم ہونے پر میرزائی سب کچھ چھوڑ کر جہاں تہاں ترکی سے فرار کر گئے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ گرفتار کیے جا رہے ہیں۔ اور ان کے جرم کی سزا موت ہے۔

(۳) ترکی میں مصطفیٰ کمال کو قتل کرنے کے لیے مصطفیٰ صغیر نام کے ایک نوجوان کو آمادہ کیا گیا اور میرزا معراج دین (سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی) ایک تاجر کی حیثیت سے اس کے ساتھ منسلک کیے گئے۔ اس نوجوان (مصطفیٰ صغیر) کو میرزا بشیر الدین محمود نے ایک معتمد جاں نثار کی حیثیت سے مقرر و منتخب کیا اور برطانوی حکومت کے حوالے کیا تھا۔

۴۔ پہلی جنگ عظیم میں برطانوی فوج کامیاب ہو کر عراق میں داخل ہوئی تو اس کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے روپ میں بہت سے احمدی تھے، ولی اللہ زین العابدین کا چھوٹا بھائی اور میرزا بشیر الدین محمود کا سالا میجر حبیب اللہ شاہ، جو انگریزی فوج میں ایک ڈاکٹر تھا، بغداد فتح ہونے پر سول گورنر مقرر کیا گیا اور فوج کی رٹ چلائی گئی، پھر وہ سبکدوش ہو کر واپس آ گیا۔ آخر ۱۹۲۴ء میں عراقی حکومت نے میرزائی عناصر کو ان کی مخالفانہ سرگرمیوں کے باعث نکال دیا۔

۵۔ شام میں جلال الدین شمس کو بھیجا گیا۔ اس کے سپرد فلسطین و شام کا مشن تھا لیکن دسمبر ۱۹۲۷ء میں اس کی پُراسرار سرگرمیوں کے باعث اس پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ وہ بچ گیا، لیکن بہت دیر تک زیر علاج رہا۔ شام میں استعماری گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو جلال الدین شمس کو نکال دیا گیا۔ اور وہ ۵ مارچ ۱۹۲۸ء کو حیفا آ گیا۔ اب برطانوی مصالح کا مرکز فلسطین تھا۔ اور اس کو یہودی ریاست بنانے کے لیے عربوں کی وحدت میں نقب لگانے والے ایسے ہی نام نہاد مسلمان درکار تھے جو میرزا بشیر الدین محمود نے مہیا کیے۔ فلسطین میں برطانیہ کی جاسوسی کا افسر اعلیٰ ایک یہودی تھا۔ احمدی مشن اس کے ماتحت تھا اور اس طرح یہودیت اور احمدیت کے گٹھ جوڑ کا آغاز ہوا۔ اس آغاز ہی نے اسرائیل قائم کرنے کی استعماری کوششوں کو پروان چڑھایا۔ آج احمدی ان بے نظیر خدمات ہی کے صلہ میں اسرائیل کی حکومت سے متمتع ہو رہے اور آج کل عرب ریاستوں کی بیخ کنی اور مخبری کر رہے ہیں۔ لارڈ جارج (وزیر اعظم انگلستان) نے فلسطین میں احمدیوں کی خدمات کا اعتراف کیا اور وہ ان سے نہایت درجہ مطمئن تھا۔ ۱۹۲۴ء میں میرزا بشیر الدین محمود فلسطین گیا اور اس نے اعلان کیا کہ یہودی اسی خطہ کے مالک ہو جائیں گے (تاریخ احمدیت

جاسوسی | ستمبر ۱۹۳۰ء میں مرزا محمود نے فلسطین کے ان کی کثرت سے ملاقات کی راہ اور آئندہ خدمات کا نقشہ طے پایا۔ جلال الدین شمس کے ساتھ محمد المغربی الطرابلسی اور عبدالقادر عودہ صالح نام کے دو عربوں کو منسلک کیا گیا۔ اصلاً دونوں یہودی تھے اور استعماری مقاصد کے لیے انھیں مسلمان کیا گیا تھا۔

۲۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت نے روس سے ہمیشہ خطرہ محسوس کیا اور وسط ایشیا میں اسلامی علاقوں کی معرفت اس خطرے کے مفروضوں یا حقیقتوں کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے مختلف وقتوں میں کئی جاسوس یا وفد بھیجے اور جو مختلف واسطوں سے روس جاتے رہے۔ ایک احمدی محمد امین خاں کو ۱۹۲۱ء میں مبلغ کے روپ میں روانہ کیا گیا۔ وہ ایران کے راستے معلومات حاصل کرتا ہوا روس میں داخل ہوا لیکن روسی حکومت نے پکڑ کے جیل میں ڈال دیا۔ آخر برطانوی مداخلت سے رہا ہوا۔ اس نے قادیان واپس آکر میرزا بشیرالدین محمود سے مزید ہدایات لیں اور ایک دوسرے شخص ظہور حسین کو ساتھ لیکر لوٹ گیا۔

ظہور حسین بھی روسی پولیس کے ہاتھ آگیا اور انگریزوں کے لیے جاسوسی کے الزام میں ماسکو وغیرہ کے قید خانہ میں دو سال رہا۔ بالآخر برطانوی سفیر متعینہ ماسکو کی تگ و دو سے رہا ہوا۔ شہزادہ وطن ہندوستان آیا تو میرزا بشیرالدین محمود نے وفاداریوں سے متعلق سپاسنامہ پیش کیا۔ اس میں بڑا بانگ کہ حضرت میرزا غلام احمد کی پیشگوئی کے مطابق روس کی حکومت بالآخر احمدیوں کے ہاتھ میں ہوگی اور اللہ تعالیٰ احمدیت کو بخارا میں عنقریب پھیلا دے گا۔

۳۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں انگریزوں اور افغانستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو قادیانی ایک کمپنی کی شکل میں افغانستان کو انگریزوں کے زیر نگیں لانے کے لیے مصروف ہو گئے۔ میرزا محمود کا چھوٹا بھائی چھ ماہ ایک ٹرانسپورٹ کور میں آنریری کام کرتا رہا۔

برطانوی حکومت اوّل تو افغانستان کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھی جب افغانستان اس کی نوآبادی نہ بن سکا تو اپنی ریشہ دوانیوں کے لیے چن لیا تاکہ افغانستان کمزور رہے۔ اس کام کے لیے جو مہرے جاسوسی کے تخریبی فرائض انجام دے رہے تھے ان میں ایک شخص نعمت اللہ قادیانی بھی تھا۔ اس کو جولائی ۱۹۲۴ء میں گرفتار کر کے سنگسار کیا گیا۔ فروری ۱۹۲۵ء میں دو اور قادیانی ملا عبدالحلیم اور ملا نور علی اسی پاداش میں موت کے گھاٹ اتارے گئے۔

قادیانی امت کی برطانیہ سے از حد اور حد وفاداری اور مسلمان ملکوں میں انگریزوں کی خاطر جاسوسی کا ریکارڈ اتنا ضخیم ہے کہ اور کسی سرکاری جماعت کا ریکارڈ اس قدر شرمناک نہیں۔ اس سے فی الحقیقت کئی سو کتابوں کی ایک لائبریری قائم ہو سکتی ہے۔

میرزا غلام احمد اور اُن کی اُمّت کے دو ہی شعار رہے ہیں :

۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت چھن جانے پر میرزا غلام احمد جہاد کی منسوخی کے لیے ایک نبی بن کر سامنے آیا اور اُس نے الہام کا جامہ پہنا کر اطاعتِ برطانیہ کو فرض قرار دیا۔ اس کی اُمّت نے اُس کی موت کے بعد ایک ایسے طائفہ کی حیثیت اختیار کرلی جو ہندوستان میں برطانوی استعمار کے انجن کی بھاپ تھا، اور جس کے دباؤ سے مسلمانوں کی وحدت ودلخت ہوکر کمزور پڑتی اور ختم ہوتی تھی۔

۲۔ قادیانی اُمّت نے اپنے پیغمبر کی منصبے کر تمام اسلامی ملکوں میں برطانوی استعمار کی خدمت گذاری اپنے اوپر فرض کرلی۔ وہ مسلمانوں کے رُوپ میں اُن ممالک میں جاتے اور رہتے لیکن عقیدۃً انہیں کافر سمجھ کر انہیں سبوتاژ کرتے۔ تمام اسلامی ملکوں کے مسلمان اُن کے ظواہر سے دھوکا کھاتے۔ المختصر قادیانی اُمّت کے افراد اسلامی مملکتوں میں برطانیہ کا ففتھ کالم تھے۔

علامہ اقبالؒ نے قادیانی اُمّت کے عمیق مطالعہ کے فوراً ہی بعد ہندوستان کی برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ میرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے۔ وہ محمد عربیؐ کی اُمّت میں نقب لگا کر ایک علیحدہ اُمّت پیدا کرتے ہیں میرزا غلام احمد خود کوئی اُمّت پیدا نہ کر سکتے تھے۔ اگر وہ الگ اُمّت پیدا کرتے تو اسلامی ملکوں میں انگریزی استعمار کے لیے مفید نہ ہوتے۔ اُنھوں نے اپنے پیروؤں کی جمعیت کو اس طرح ڈھالا کہ وہ اپنے سوا تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے لیکن کام ان سے اس طرح لیا گویا وہ مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ اور جماعت ہیں۔

علامہ اقبالؒ قادیانی اُمّت کے الگ تھلگ عقائد، اُن کی اسلام سے غداری اور برطانوی استعمار کی خدمت گذاری سے اس قدر بدظن ہوگئے کہ انھوں نے نہ صرف احمدیوں کو مسلمانوں سے الگ کر دینے کا مطالبہ انتہائی شدّت سے کیا بلکہ مسلمان اداروں سے انہیں نکلوا دیا۔ لاہور ہائیکورٹ کے ایک جج مرزا ظفر علی بھی حضرت علامہ کے مؤید ہوگئے اور اس طرح انگریزی خواندہ جماعت کی ایک نئی تعداد میں بھی ان کی علیحدگی کا مطالبہ قائم ہوگیا۔

علامہؒ نے فرمایا کہ :

۱۔ قادیانی مسلمانوں میں صرف سیاسی فوائد کے حصول کی خاطر شامل ہیں، ورنہ وہ تمام عالمِ اسلام کو اپنے عقائد کی رُو سے کافر قرار دیتے ہیں۔

۲۔ وہ اسلام کی باغی جماعت ہے اور مسلمانوں کو اس مطالبہ کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو ان سے الگ کر دیا جائے۔

ہے۔ وہ مسلمانوں میں یہودیت کا شتی ہیں۔

برِ عظیم کی آزادی تک قادیانی امت کی تاریخ میں ایک شوشہ یا ایک نقطہ بھی ایسا نہیں جس سے معلوم ہو کہ وہ اس برِ عظیم کی جدوجہد آزادی سے موافق تھے یا کبھی انہوں نے برطانیہ سے ہندوستان چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا ہو۔ ان کی غیر مختتم کاسہ لیسی کے باوجود برِ عظیم آزاد ہو گیا۔ ہندوستان آزاد ہوا، پاکستان قائم ہوا تو برطانیہ سے ان کی وابستگی کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہ تھی اور نہ وہاں رہ کر وہ مختلف محاذوں پر برطانیہ کے لیے ففتھ کالم ہو سکتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کا رخ کیا۔ پنجاب میں آزادی سے کچھ عرصہ بعد تک سر فرانسس موڈی انگریز گورنر تھا۔ اس کے سامنے برطانوی استعمار کے مختلف پلان تھے، چنانچہ اس کی معرفت ربوہ قادیانی امت کو ملا۔ یہ ان کے لیے اس طرح کا ایک گڑھ تھا جس طرح امریکیوں نے پشاور سے کوہاٹ کی طرف بڈبیر کے مقام پر اپنا ایک عسکری مرکز قائم کیا تھا اور وہاں کسی پاکستانی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔

جن لوگوں نے مرزائیت کے تعاقب کی تحریک چلائی، ان میں زعمائے احرار مسلم لیگ میں شامل نہ تھے اور نہ پاکستان کو ہندوستان کے مسلمانوں کا سیاسی حل سمجھتے تھے۔ علامہ اقبالؒ پاکستان سے پہلے وفات پا گئے۔ مولانا ظفر علی خاں گوشہ گیر ہو رہے تھے۔ مرزا بشیر الدین محمود کو خیال ہوا کہ ان کے مخالف جو متروک اور اچھوت ہیں مسلم لیگ میں عدم شمول کے باعث اب پاکستان میں سر اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ مسلمانوں نے انہیں مسترد کر دیا ہے۔ اس مفروضہ پر اس نے پاکستان کو اپنی ریاست بنانے کی نامسعود مہم کا آغاز کیا۔ اس نے جنرل سر ڈگلس گریسی کے ایما پر جہادِ کشمیر کے نام پر فرقان بٹالین قائم کی۔ یہ اس شخص کا اقدام تھا جس کے باپ مرزا غلام احمد نے جہاد کو ابداً منسوخ کیا تھا، اور جو برطانوی عہد میں خود بھی منسوخیِ جہاد کا داعی تھا۔

مشرقی پاکستان کے پاکستان سے کٹ جانے کے بعد آج مغربی پاکستان میں بلوچستان عالمی طاقتوں کی بدولت ایک سیاسی مسئلہ ہے اور وہاں بیرونی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ انگریزوں نے برِ عظیم چھوڑنے سے پہلے بلوچستان کے موجودہ گورنر نواب آف قلات کو اپنے ڈھب پر لانا چاہا کہ وہ بلوچستان کو نیپال کی طرح آزاد حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ مسٹر ڈی۔ وائی۔ فل (پولیٹیکل ایجنٹ کوئٹہ) نے نواب قلات کو ترغیب دی کہ انگریز برما اور لنکا کی طرح بلوچستان کو آزاد ریاست کا درجہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ اُن دنوں بلوچستان کا ایجنٹ جنرل جیفرے تھا، وہ خود قلات گیا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا پیغام دیا کہ وہ بلوچستان کو آزاد ریاست بنانے کے لیے تیار ہیں، لیکن قائد اعظمؒ مطلع ہو گئے اور بیل منڈھے نہ چڑھی۔ آخر برطانوی حکومت کے ان سیاستدانوں نے مرزا محمود سے طویل ملاقات کر کے بلوچستان کا پلان

ان کے حوالے کیا اور خود چلے گئے۔ میرزا محمود نے جولائی ۱۹۴۸ء میں کوئٹہ کا دورہ کیا اور بلوچستان کو قادیانی صوبہ بنانے کا اعلان کیا۔ ان کا یہ خطبہ ۱۳؍اگست ۱۹۴۸ء کے "الفضل" میں درج ہے۔

اگر ۱۹۵۳ء میں قادیانیت کے خلاف مجلس عمل کی تحریک نہ چلتی تو میرزائی پاکستان میں استعماری سیاست کے حسب ہدایت اپنے قدم جما رہے تھے۔ اس تحریک نے تمام ملک کو چوکنا کر دیا۔ قادیانی تبلیغ ہمیشہ کے لیے رک گئی اور تمام مسلمان ان سے باخبر ہو گئے۔ لیکن سر ظفر اللہ خاں نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے بیرون پاکستان اپنی ساکھ قائم کر لی اور عالمی استعمار سے اس کی مزید قوتوں کے تابع ناطہ قائم کر لیا۔ ادھر ملک استعماری اور نظریاتی طاقتوں کے محور میں چلا گیا۔ ادھر قادیانی استعماری طاقت کے مہرے ہو گئے۔

چین ——— امریکہ اور روس دونوں کے لیے خطرہ یا پرابلم ہو چکا تھا۔ دونوں محسوس کرتے تھے کہ ہندوستان سوشلسٹ ہو گیا تو پھر ایشیا اور افریقہ میں انہیں کوئی سا مقام یا رسوخ حاصل نہ ہوگا کیونکہ اس طرح ایک ارب اور بیس کروڑ انسان سوشلسٹ ہو جاتے تھے۔ ان عالمی طاقتوں نے ہندوستان کو ساتھ ملا کر چین کے خلاف محاذ بنانا چاہا۔ ہندوستان کا جواب یہ تھا کہ اس کے دو طرف مشرقی و مغربی پاکستان دشمن کی حیثیت سے موجود ہیں۔ جب تک وہ ہیں، ہندوستان کا ایسے کسی محاذ میں شامل ہونا مشکل ہے۔ امریکہ اور روس نے صدر ایوب سے کہا کہ وہ ہندوستان سے مشترکہ دفاع کرے۔ صدر ایوب نے مشکلات پیش کیں اور عذر کیا۔ اس پر دونوں طاقتیں پاکستان اور ایوب خاں کے خلاف ہو گئیں۔ اسی ناراضی کا نتیجہ ۱۹۶۵ء کی جنگ تھی۔ جو استعماری طاقتوں کے پاکستانی گماشتوں کی بھگت ورپڑ سے معرض وجود میں آئی۔ خدا نے پاکستانی فوج کے بازوؤں کو توانائی دے کر پاکستان کو بچا لیا۔ ورنہ نقشہ مختلف ہوتا۔ اور جو ہوا نہ کیا ظہور میں آتا۔ عالمی طاقتیں سمجھتی تھیں کہ مغربی پاکستان کے اعصاب فتح ہو گئے اور اس کی شکل بدل گئی تو مشرقی پاکستان کسی تردد کے بغیر خود بخود الگ ہو جائے گا۔ لیکن قدرت کو منظور نہ تھا، پاکستان محفوظ ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ عالمی طاقتوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ مشرقی پاکستان کبھی الگ نہ ہوتا لیکن عالمی طاقتوں کے جو ایجنٹ مغربی پاکستان میں حکومت کی مشنری کے بڑے بڑے عہدوں پر کام کر رہے تھے، انھوں نے مشرقی پاکستان کو کاٹ دیا اور قادیانی اس منصوبہ کے سرخیل تھے۔ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف معاشی استحصال کا جو غصہ تھا اس کو سوا کرنے والا میرزا غلام احمد کا پوتا، میرزا بشیر الدین کا بھتیجا اور داماد ایم ایم احمد تھا جو ایوب خاں کے زمانہ میں بیرونی پشت پناہی سے مالیات کا انچارج تھا، اور آج ان استعماری خدمات کے صلہ میں عالمی بینک کا اہم عہدیدار ہے۔ لطف یہ

کہ پاکستان میں ایٹمی توانائی کا سربراہ عبدالسلام بھی قادیانی ہے۔

ظفراللہ خان، ایم۔ ایم۔ احمد اور عبدالسلام تینوں ہی پاکستان سے باہر لندن کی جلوہ گاہ میں رہتے اور عالمی شکتی کے اشارہ ابرو پر رقص کرتے ہیں۔ قادیانی پارٹی کی کمانڈ تھی، ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پاکستان کے اسلامی ذہن کو اسرائیل کے روپیہ کی طاقت پر مجروح کیا اور اس کے بعد سے ملک کے غیر اسلامی ذہن کی معرفت پاکستان کی معاشی و عسکری زندگی پر قابض ہو رہے ہیں۔ یورپ کی نظریاتی و استعماری طاقتیں نہ تو اسلام کو بطور طاقت زندہ رکھنے کے حق میں ہیں، اور نہ اس کی نشاۃ ثانیہ چاہتی ہیں۔ ہندوستان کی خوشنودی کے لیے پاکستان اُن کی بندر بانٹ کے سلسلہ میں ہے۔ وہ اس کو بلقان اور عرب ریاستوں کی طرح طرح چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے سامنے مغربی پاکستان کا شوارہ ہے۔ وہ پختونستان، بلوچستان، سندھو دیش اور پنجاب کو الگ الگ ریاستیں بنانا چاہتی ہیں۔ ان کے ذہن میں بعض سیاسی روایتوں کے مطابق کراچی کا مستقبل سنگاپور اور ہانگ کانگ کی طرح ایک خود مختار ریاست کا ہے۔ خدانخواستہ اس طرح تقسیم ہوگئی تو پنجاب ایک مقصود (SANDWITCH) صوبہ ہو جائے گا۔ جس طرح مشرقی پاکستان کا حصہ مغربی پاکستان میں صرف پنجاب کے خلاف تھا، اسی طرح پختونستان، بلوچستان اور سندھو دیش کو بھی پنجاب سے ناراضی ہوگی پنجاب تنہا رہ جائے گا، تو عالمی طاقتیں سکھوں کو مجبور کر کے مطالبہ کرا دیں گی کہ مغربی پنجاب اُن کے گوروؤں کا مولد، مسکن اور مرگھٹ ہے۔ لہٰذا ان کا اس علاقہ پر وہی حق ہے جو یہودیوں کا فلسطین (اسرائیل) پر تھا، اور انہیں وطن مل گیا۔ عالمی طاقتوں کے اشارے پر سکھ حملہ آور ہوں گے، اس کا نام شاید پولیس ایکشن ہو۔ جانبین میں لڑائی ہوگی لیکن عالمی طاقتیں پلان کے مطابق مداخلت کر کے اس طرح لڑائی بند کرا دیں گی کہ پاکستانی پنجاب، بھارتی پنجاب سے پیوست ہو کر سکھ احمدی ریاست بن جائے گا۔ جس کا نقشہ اس طرح ہوگا کہ صوبہ کا صدر سکھ ہوگا، تو وزیر اعلیٰ قادیانی۔ اگر وزیر اعلیٰ سکھ ہوگا تو صدر قادیانی! اسی غرض سے استعماری طاقتیں قادیانی اُمت کی کھلم کھلا سرپرستی کر رہی ہیں۔ بعض مستند خبروں کے مطابق سر ظفر اللہ خان لندن میں بھارتی نمائندوں سے گفت و شنید کر چکے ہیں۔ قادیانی اس طرح اپنے نبی کا مرکز (قادیان) حاصل کر پائیں گے جو ان کا شرعاً مطمح نظر ہے اور سکھ اپنے بانی گورونانک کے مولد میں آجائیں گے۔ یہی دونوں کے اشتراک کا باعث ہوگا۔

قادیانی عالمی استعمار سے اپنی ریاست کا وعدہ لے چکے ہیں۔ اور اس کے عوض عالمی استعمار کے گماشتہ کی حیثیت سے اسرائیل کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے وہ مسلمانوں کی صف میں رہ کر عرب ریاستوں کی بیخ کنی اور مخبری کے

لیے افریقہ کی بعض ریاستوں میں مشن رچا کے بیٹھے ہیں۔ اور حیفا (اسرائیل) میں حکومت یہود کے مشیر برائے اسلامی ممالک ہیں، وہ پاکستان میں حکمران جماعت کے ہاتھوں، سرحد و بلوچستان کی نمائندہ جماعت کو ہٹوا کر پنجاب و سندھ میں اسلامی ذہن کے قتل عمد سے موجودہ استعماری صوبہ کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اور اس وقت طاقتوں کی معرفت اسرائیل اور ہندوستان کے آلۂ کار ہیں اور یہ ہے اُن کا سیاسی چہرہ جس سے ان کا داخلی وجود ظاہر ہوتا ہے۔

* * *

قومی اسمبلی کا تاریخی فیصلہ

قادیانی بزرجمہر اس گمان میں تھے کہ پیپلز پارٹی کی پناہ لے کر وہ اس مقام تک پہنچ چکے ہیں کہ پاکستان میں ان کے اقتدار کا راستہ صاف ہو چکا ہے اور آئندہ انقلاب کی عنان ان کے ہاتھ میں ہوگی۔ مرزا ناصر احمد نے اپنے بیرونی رشتوں کو مضبوط کرنے کے لیے انگلستان اور افریقہ کا سفر کیا اور سر ظفر اللہ کی معرفت عالمی استعمار کے ان اہلکاروں سے ملاقات کی جو ایشیائی ممالک میں انقلاب کے خواہاں تھے اور مختلف قوموں کے سیاسی تدبر کو اپنے مہروں کی وساطت سے متاثر کرتے ہیں۔ مرزا صاحب کے اس سفر کا مصور کتابچہ شائع کیا گیا۔ اس کتابچہ میں نائیجیریا کی ایک مسجد کے دروازہ پر کلمہ سے محمد رسول اللہ بدل کر احمد رسول اللہ کندہ کیا گیا تھا۔ چٹان نے اس کی فوٹو سٹیٹ شائع کی، تو ملک میں ایک غلغلہ پیدا ہو گیا۔ مرزائیوں نے اپنے روایتی کذب کی اساس پر فائدہ اٹھانا چاہا، لیکن جو چیز خود ان کی طباعت شدہ تھی اس کی توجیہہ و تعبیر میں تو آئیں بائیں شائیں کی گئی، مگر واضح طور پر اس تصویر کی تغلیط و تردید نہ ہو سکی۔ ایڈیٹر چٹان کو جب سیکرٹری نے یاد کیا، جس نے کتابچہ دیکھ کر تصدیق کی کہ چٹان کا فوٹو سٹیٹ درست ہے اور فرمایا کہ اس چیز نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے۔ جس سے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔

مرزا ناصر احمد اور ان کی شوریٰ کے ارکان ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ انہوں نے امن کے واقعات سے بے نیاز ہو کر اپنا کام جاری رکھا اور نجی محفلوں میں یہ تاثر دیتے رہے کہ ملک کا انقلاب اب ان کے ہاتھ میں ہوگا

ملک کی حیثیت حاکم ہوں گے۔ مرزا ناصر احمد نے ربوہ میں عسکری تربیت کا ڈول ڈالا اور جنگ کے تربیتی گھوڑوں کی نمائش پر انعامات کا اعلان کیا۔ اس غرض سے گھوڑ دوڑ کی بنا ڈالی۔ اپنے پیروؤں سے ڈھائی کروڑ روپے طلب کیے اور اعلان کیا کہ رقم پانچ کروڑ ہو جائے گی اور یہ اس روپے کی پردہ پوشی کے لیے حیلہ تھا جو عالمی استعمار کی معرفت ربوہ میں آ رہا تھا۔ لیکن اس کا بڑا حصہ غیر ملکی بنکوں کی مد محفوظ میں تھا۔ مرزا ناصر احمد اور اس کے فرستادہ معتمدوں نے ملک بھر میں دام تزویر بچھا رکھا تھا۔ ان کے حوصلے اتنے بڑھ چکے تھے کہ ان کے فرستادہ مختلف قومی تنظیموں میں داخل ہو کر ان کا تجربہ حاصل کرتے اور سیاسی تربیت پاتے تھے۔ اس زمانہ میں بعض سیاسی کارکنوں اور کئی ایک صحافیوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ خرید کیا گیا۔ مرزائی اس حد تک بے لگام ہو چکے تھے کہ اپنی طاقت کے ہلکے پھلکے تجربے کرنے لگے۔ انھوں نے ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۷۵ء کی صبح کو چونڈہ کی ایک مسجد میں گھس کر اس کے پیش امام کو زد و کوب کیا۔

ایک قادیانی العقیدہ نوجوان رفیق احمد باجوہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں سٹوڈنٹس یونین کا صدر تھا۔ اس کی طبیعت نے قادیانیت کی سیاہ کاریاں دیکھ کر ابا کیا، تو اس کو جان بچانا مشکل ہو گیا۔ اس کے والد کو خلافت ربوہ کی طویل خدمات سے محروم ہونا پڑا وہ جان بچا کر اپنے گاؤں چونڈہ پہنچے، تو انھیں وہاں قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بال بال بچ گئے۔ ادھر علاقائی افسروں کا عالم یہ تھا کہ مرزائیت کے رسوخ کی بدولت کوئی سی کارروائی کرنے سے معذور تھے۔ چودھری ظفر اللہ خاں ۱۰ جنوری سنہ ۱۹۷۳ء کو واہگہ سے چپ چاپ قادیان گئے۔ وہاں ہندوستان کی حکومت کے سیاسی نمائندوں اور را ملٹری جنرل ہیڈکوارٹر کے افسر اعلیٰ سے ملاقات کی۔ چٹان نے اسی زمانہ میں اس کا انکشاف کیا۔ دوسرے کسی اخبار میں یہ خبر نہ آسکی۔ مولانا شمس الدین بلوچستان کی صوبائی اسمبلی میں ڈپٹی سپیکر تھے۔ ان کی عمر ۴۱ برس تھی۔ اہل ربوہ نے قرآن پاک میں تحریف کی اور وہ نسخے بلوچستان میں تقسیم کیے گئے، تو اس کے خلاف جولائی سنہ ۱۹۷۳ء میں زبردست تحریک چلی۔ بارہ روز تک فورٹ سنڈیمن اور اس سے ملحق علاقہ نظم و نسق کے اعتبار سے معطل رہا۔ تقریباً ۳۰ علماء گرفتار کیے گئے۔ مولانا شمس الدین کو فوج کے زیر حراست سینڈیمن میں رکھا گیا۔ میر غلام قادر بسیلہ نے ایک روایت کے مطابق آپ کو وزارت اعلیٰ کی پیشکش کی کہ نظم و نسق بحال کریں۔ آپ نے پیشکش کو ٹھکرا دیا اور اپنے اس مطالبہ پر قائم رہے کہ محرف قرآن کے تمام نسخے ضبط کیے جائیں اور قادیانی بلوچستان چھوڑ دیں۔ آخر صوبائی حکومت سپر انداز ہو گئی۔ اس نے محرف قرآن کے تمام نسخے ضبط کر لیے اور قادیانیوں کو بلوچستان چھوڑنا پڑا۔ واقعہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی تاب نہ لا کر قادیانی خود ہی بھاگ گئے۔ کچھ لوگ کوئٹہ میں رہ گئے۔ اس دوران میں مولانا منظور احمد چنیوٹی کوئٹہ گئے اور وہاں

رد قادیانیت کی غرض سے قرار صاحبان کے اساتذہ مقرر کئے جو سعودی حکومت کیطرف سے بطور مبلغین افریقہ کی مختلف ریاستوں میں بھیجے جاتے تھے۔ ان کی مساعی جمیلہ سے سعودی عرب سے تمام قادیانی بھاگ گئے جو ان کے علم میں تھے اور اسرائیل کی خدمت بجا لانے پر مامور تھے۔ میرزا ناصر احمد سیاسی چالوں میں مشغول رہا۔ اس نے جماعت احمدیہ کی ایک مجلس مشاورت کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ :

" جماعت احمدیہ کی صد سالہ جوبلی کے فنڈ میں ۹ کروڑ ۹۰ لاکھ سے زائد کے وعدے ہو چکے ہیں۔ صرف انگلستان سے ڈھائی کروڑ روپیہ کے وعدے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بیرونی ممالک کی احمدی جماعتوں نے ۳ کروڑ ۱۰ لاکھ ۵۴ ہزار ۴ سو ۸۵ روپے کے وعدے کئے ہیں۔ "

(الفضل ربوہ ۲۰ مارچ ۱۹۷۴ء)

ایڈیٹر چٹان نے ہر شمارے میں قادیانی امت کے سیاسی محاسبہ کو اپنا شعار بنا لیا۔ حتیٰ کہ مرکزیہ مجلس اقبال کے جلسہ میں قادیانیت کے خلاف افکار اقبال کی روشنی میں ایک ایسی معرکۃ الآرا تقریر کی جس سے قادیانی ایوانوں میں تھرتھری مچ گئی۔ میرزائی اخباروں نے ایڈیٹر چٹان کے خلاف طوفان بدتمیزی برپا کیا اور اقتدار کے خواب کی رو میں اتنی فحش و ناشائستہ گالیاں بکیں کہ ان کا ہر بول میرزا غلام احمد کی قبر کا فاتحہ ہو گیا۔ ایڈیٹر چٹان نے ۵ اپریل کو منٹگمری میں تقریر کرتے ہوئے قادیانیت کے بارے میں تجزیاتی تقریر کی۔ اس میں کہا کہ میرزا غلام احمد برطانوی اغراض کا روحانی بیٹا تھا۔ قادیان میرزائیت کا مکہ، ربوہ استعماری مرکز، تل ابیب تبلیغی مرکز اور واشنگٹن اس کا بینک ہے۔ مکہ معظمہ میں ۱۰ اپریل کو رابطہ عالم اسلامی کے زیر اہتمام دنیا بھر کی ایک سو ۱۴ اسلامی تنظیموں کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا۔ اس میں قادیانیت کو ملت اسلامیہ سے خارج قرار دیا گیا۔ اور اس سے متعلق دو ٹوک قرارداد منظور کی گئی کہ اس کا وجود برطانوی استعمار کا پروردہ ہے۔ اس نے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد سے ہمیشہ غداری کی ہے۔ اس کے معابد و مراکز کی تعمیر اسلام دشمن طاقتیں کرتی ہیں۔ اس جماعت کے پیرو، نہ صرف یہ کہ محرف قرآن مجید شائع کرتے ہیں بلکہ عرب ریاستوں میں اسرائیل کے ایجنٹ ہیں۔ اس موتمر میں فیصلہ کیا گیا کہ اس جماعت کا ہر میدان میں مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔ انہیں اہم سرکاری عہدوں سے الگ کر دیا جائے اور ان سے وہی سلوک کیا جائے جو دوسرے باطل فرقوں سے کیا جاتا ہے۔ ایک سوالیہ جملہ تمام مندوبین کی زبان پر تھا کہ جب پاکستان نے اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا، تو حیفہ میں قادیانی مشن کیا معنی رکھتا ہے ؟

میرزا ناصر احمد مسلمانوں میں ہیجان و اضطراب کے باوجود اپنی مہرہ بازی میں مشغول تھا کبھی اس کے فرستادہ ملک کی سیاسی تحریکوں اور تنظیموں میں شامل ہو کر ترپ کھیلنا چاہتے اور کبھی مسلمانوں کی مدافعت و مزاحمت یا جوش و جواب کو پرکھنے کے لیے مختلف تجربے کرتے، جب انھوں نے محسوس کیا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی معرفت ملک کے اسلامی ذہن کو حسب منشا قتل نہیں کر سکے اور نہ سیاسی اصطلاح کے مطابق زوال پذیر بنا سکے بلکہ منبر و محراب کی دینی فضا جوانوں کی محاسب قوت ہے۔ پہلے سے کہیں تیز ہو رہی ہے؛ حتیٰ کہ اوقاف کی مساجد میں بھی ان کے خلاف وعظ ہوتے ہیں، تو وہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ہو گئے۔ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا خلیفہ ربوہ کی صدارت میں چند سبکدوش میرزائی جرنیلوں نے جمع ہو کر وزیر اعظم بھٹو کے قتل کی سازش کی۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے لوگوں کو بھی قتل کرنے یا کرانے کا منصوبہ تیار کیا گیا، لیکن یہ سب چیزیں مولانا تاج محمود ایڈیٹر لولاک، لائل پور کے مستند ذرائع سے عوام تک پہنچتی رہیں۔ چٹان نے ان تمام عزائم کو اس شد و مد سے عوام کے سامنے رکھا کہ ربوہ حیران رہ گیا کہ اس کے اسرار و رموز پر وہ تمام احتیاطوں کے باوجود "چٹان" اور "لولاک" تک کیونکر پہنچتے ہیں۔ کئی ایک قادیانی اسی شبہ میں ربوہ سے نکال دیے گئے، لیکن ناصر احمد اندر خانہ اس غلط فہمی میں تھا کہ اس کی جماعت آئندہ پاکستان کی حکمران طاقت ہو گی۔ اس نے لاہور میں اپنی جماعت کو ہدایت دیکر وائی ایم سی اے ہال لاہور میں سیرۃ النبی پر ایک جلسہ کروایا۔ اس کا صدر بائیں بازو کے ایڈووکیٹ جنرل راجہ سید اکبر کو بنایا۔ راجہ صاحب ایڈیٹر چٹان کے مقدمہ میں خصوصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس جلسہ سے قادیانیوں کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان مزاحم ہوں، تو ان سے معرکہ رچا لیا جائے۔ اس غرض سے تمام قادیانی اپنے غنڈوں سمیت مسلح ہو کر آئے۔ لیکن قادیانی محاسبہ کمیٹی نے ان تمام نوجوانوں کو سختی سے روک دیا جو سیرۃ النبی کی آڑ میں قادیانیت کی اس نمائش کو ناپسند کرتے تھے اور راجہ سید اکبر کی صدارت سے بیزار تھے۔ میرزائیت کا یہ جلسہ سحرائی بوندا باندی کی طرح گذر گیا۔ میرزائیوں نے اپنی شرارتوں کو اس حد تک طول دیا کہ ملک غلام مصطفیٰ کھر کی وزارت علیٰ سے سبکدوشی کو بھی میرزا ناصر احمد کا "معجزہ" گردانتے رہے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ ان سے ناراضی کا سبب کیا تھا۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر وزارت علیٰ سے الگ ہو کر کوٹ لکھپت کی طرف مزدوروں کے ایک مظاہرہ میں گئے، تو راجہ منور احمد ایم پی اے نے اپنی سرکاری حیثیت سے فائدہ اٹھا کر میرزائی نوجوانوں سے ان پر حملہ کرایا اور بُری سے بُری زبان استعمال کی۔

میرزائیوں نے ایک بڑا حوصلہ یہ کیا کہ ملک غلام مصطفیٰ کھر ایک دوست کے ہاں شادی میں گئے تو پولیس

گئے تو ان کے خلاف وہاں ہنگامہ برپا کرایا اور ہنگامہ کرنے والے تقریباً سبھی نوجوان قادیانی تھے۔ ان نوجوانوں نے کمر صاحب کی موٹر پر پتھراؤ کیا۔ غرض ربوہ کی منصوبہ بندی کا خلاصہ یہ تھا کہ مختلف تجربوں کی ترازو میں تول کر مسلمانوں کا وزن معلوم کر لیا جائے کہ اب ان کی طاقت کیا ہے؟ اور وہ کس حد تک مزاحمت و مدافعت کر سکتے ہیں۔ اسی کا حصہ ربوہ ریلوے سٹیشن پر ۲۹ رمئی کا سانحہ تھا۔ میرزا ناصر احمد کی شہ پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے لگ بھگ ایک سو طلبہ کو میرزائی غنڈوں نے اس بری طرح زدوکوب کیا کہ ڈیڑھ درجن طلبہ ہلاک ہو گئے اور جب گاڑی میرزا غلام احمد کے بزرگوں کی مشق ناز کے بعد لائل پور پہنچی تو غم و غصہ کی ایک طوفانی لہر دوڑ گئی۔ دیکھتے آنکھوں شہر سے دس ہزار افراد پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی بھاری جمعیت کے ساتھ آ گئے۔ انہوں نے نہایت تدبر و فراست سے صورت حالات پر قابو پا لیا ورنہ عوام کے جذبات آتش کدہ کے شعلوں کی طرح کھول رہے تھے۔ اس واقعہ کی تفصیلات یہ ہیں کہ ۲۲ رمئی کو نشتر میڈیکل کالج ملتان کے ایک سو طلبہ سیاحت کی غرض سے پشاور جا رہے تھے۔ ربوہ اسٹیشن پر انہوں نے ختم نبوت زندہ باد کے نعرے لگائے۔ ان طلبہ میں ایک دو طلبہ قادیانی تھے۔ انہوں نے ربوہ کے حسب ہدایت مخبری کی اور واپسی پر ان طلبہ کی پٹائی کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ جب ۲۹ رمئی کو چناب ایکسپریس پشاور سے چلی تو ربوہ کے اوباش تیار رہے گئے اور گاڑی کی آمد سے پہلے تقریباً پانچ ہزار افراد لاٹھیوں، کلہاڑیوں، ہاکیوں، خنجروں، تلواروں اور پستولوں سے مسلح ہو کر پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ جب گاڑی ربوہ سے پہلے نشتر آباد کے سٹیشن پر پہنچی تو اس کے قادیانی العقیدہ اسٹیشن ماسٹر نے ربوہ کے ہم عقیدہ اسٹیشن ماسٹر کو طلبہ کی بوگی کا نشان دیا اور تیاری کو مستحکم کرنے کے لیے گاڑی کی روانگی میں تاخیر کی۔ پھر جب گاڑی ربوہ سٹیشن پر پہنچی تو ان ہزاروں افراد نے طلبہ کی بوگی پر حملہ کر دیا۔ طلبہ نے وحشیانہ ہجوم کو دیکھ کر بوگی کے دروازے بند اور کھڑکیاں مقفل کر لیں لیکن میرزائی غنڈوں نے دروازے اور کھڑکیاں توڑ ڈالیں، اندر گھس گئے اور تمام طلبہ کو بری طرح زدوکوب کیا۔ ۳۰ طلبہ سخت زخمی ہوئے۔ نشتر میڈیکل کالج یونین کے صدر ارباب عالم کو اس بری طرح پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ ربوہ کے اسٹیشن ماسٹر نے سگنل ہونے کے باوجود گاڑی کو چلنے نہ دیا۔ وہ قادیانی غنڈوں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ نوائے وقت کے نامہ نگار کی روایت کے مطابق پچاس ساٹھ قادیانی سرگروہ سامنے سوار ہوئے کہ اس کار خیر میں حصہ لیں اور طلبہ کی نشت ٹھکائی کریں۔ ان حملہ آوروں میں تعلیم الاسلام کالج کے طلبہ، بعض اساتذہ، ڈاکٹر و دکاندار اور کئی ایک قصر خلافت کے متعلقین تھے۔ انہوں نے طلبہ کی پٹائی کے علاوہ ان کا سامان چھین لیا اور مال غنیمت کی طرح ان

کرے گئے۔ دلچسپ پہلو یہ تھا کہ مرزائی اپنے ساتھ بازاری عورت کی تین چار سو عورتیں بھی لائے تھے جو طلبہ کی پٹائی پر تالیاں بجاتیں اور رقص کرتی رہیں۔ جب گاڑی لائل پور پہنچی، تو ایک طوفان برپا ہو گیا۔ مشتعل عوام کا احتجاج محسوس رہا تھا۔ مولانا تاج محمود ایکا ایکی اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ عوام کو صبر و تحمل کی تلقین کی اور طلبہ کو یقین دلایا کہ جو ضربیں اُن کے جسم پر لگی ہیں، وہ مرزائیت کے تابوت میں آخری میخ ثابت ہوں گی۔ اور اب اس واقعہ کو کسی صورت نظرانداز نہیں کیا جائیگا، بلکہ ربوہ کے غنڈوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کے دم لیں گے۔ اُسی وقت مولانا تاج محمود اور مولانا فضل رسول نے ایڈیٹر چٹان کو فون پر ان حالات سے مطلع کیا۔ ایڈیٹر چٹان نے اگلی صبح لاہور کے متعدد علماء اور سیاسی زعماء کو اپنے دفتر میں اجلاس بلوایا۔ اس بھرپور اجلاس میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں اور اس امر کا فیصلہ کیا گیا کہ دو روز میں سر کردہ علماء کو بند کر کے کیا جائے کہ آئندہ اقدام کیا ہو اور مرزائیت کو اس کے حقیقی مقام پر کیونکر پہنچایا جا سکتا ہے۔ لائلپور کے علماء و زعماء اور مقامی انتظامیہ ڈپٹی کمشنر اور پولیس سپرنٹنڈنٹ نے عوام کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کیا۔ چناب ایکسپریس زخمی طلبہ کو لے کر ملتان روانہ ہو گئی۔ وہاں مجروحین کو ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ اپنے ساتھی طلبہ کو دیکھ کر دوسرے طلبہ کو سخت غصہ آیا۔ انہوں نے قادیانی طلبہ کو زد میں لے کر طارق ہوسٹل اور ایسے بیشیا ہوٹل سے ان کا سامان باہر نکال کر آگ لگا دی، پھر نشتر میڈیکل ہال اور شبستان ہوٹل پر حملہ کر دیا اور کچھ نقصان پہنچایا۔ لیکن پولیس نے دونوں اداروں کو بچا لیا۔ اگلے روز ۳۰ مئی کو سانحہ ربوہ کی خبر اخبارات کے ذریعہ ملک میں پھیل گئی، تو ہر جگہ مرزائیت کے خلاف لہر پیدا ہو گئی۔ اور قدیم مطالبہ میں گونج پیدا ہونے لگی کہ مرزائی مسلمانوں کا حصہ نہیں، انہیں خارج از اسلام قرار دے کر علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ راقم نے ۳۱ مئی سے ۷ ستمبر تک جب مرزائیت کو نیشنل اسمبلی نے اسلام سے خارج قرار دے کر علیحدہ اقلیت قرار دیا۔ اس تحریک کے متعلق تاریخ وار ایک اشاریہ مرتب کیا تھا جس سے واقعات کی رفتار کے علاوہ عوام کے جذبات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اس جد و جہد میں کیونکر کامیابی حاصل کی اور مرزائیوں کے جماعتی وجود کا تعین کیونکر ہوا۔ تمام روزنامچہ من و عن درج ذیل ہے۔

۳۱ مئی : تمام صوبے میں ۳۰ مئی کو ربوہ کے واقعہ پر زبردست مظاہرے ہوئے۔ اکثر شہروں میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ کئی جگہ قادیانیوں کے متعدد مکانوں اور دکانوں کو نذرِ آتش کیا گیا۔ پولیس

نے اکثر جگہ لاٹھی چارج کیا۔ آنسو گیس پھینکی اور بعض جگہ فائرنگ کی، جس سے کئی افراد زخمی ہو گئے۔ بعض شہروں میں اکثر مظاہرین گرفتار کیے گئے۔ ہر جگہ ربوہ کو کھلا شہر اور مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ حکومت سے کہا گیا کہ اس سانحہ کی عدالت عالیہ کے کسی جج سے تحقیقات کرائی جائے۔ سرگودھا میں تمام کاروبار بند رہا۔ تاجر، طلباء، مزدور اور شہری سڑکوں پر نکل آئے۔ مرزائیوں کی دکانوں پر پتھراؤ کیا گیا۔ انہوں نے اپنی دکانوں سے ہجوم پر فائرنگ کی۔ بعض طلبہ کو پکڑ کر حبس بے جا میں رکھا۔ زدوکوب کیا اور شدید زخمی کر دیا۔ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے وکلاء نے سانحہ ربوہ کے خلاف زبردست احتجاجی جلوس نکالا۔ جس کی قیادت بار کے صدر چوہدری محمد اکبر چیمہ ایڈووکیٹ نے کی۔ قاری عبدالسمیع، رانا منصور احمد، مفتی محمد طفیل گوہڑوی اور دوسرے رہنماؤں نے مختلف احتجاجی اجتماعات سے خطاب کیا اور حکومت سے مطالبہ کیا وہ سانحہ ربوہ کے تمام مجرموں کو گرفتار کرے اور قرار واقعی سزا دلوائے۔ ورنہ حالات کی ذمہ داری حکومت پر ہوگی۔ پولیس نے ربوہ کے اسٹیشن پر حملہ کرنے والے مشتبہ قادیانیوں کو گرفتار کر کے سرگودھا جیل میں بھیج دیا۔ جن پانچ افراد نے سرگودھا میں مظاہرین پر فائرنگ کی۔ انہیں سٹی پولیس نے زیر دفعہ ۳۰۷ معہ اسلحہ گرفتار کر لیا۔ تمام شہر میں سخت اضطراب پایا جاتا ہے۔ راولپنڈی شہر کے تمام بازار اور منڈیاں بند رہیں۔ کل صدر کے دوکاندار بھی احتجاجی ہڑتال کر رہے ہیں۔ شاہراہ بیکلوں پر قادیانیوں کی نور مسجد اور ان کے دارالمطالعہ پر تقریباً ڈیڑھ سو لڑکوں نے دھاوا بول دیا۔ اس کے لٹریچر اور فرنیچر کو آگ لگا دی۔ لائل پور میں مکمل ہڑتال رہی۔ ایک زبردست ہجوم نے کئی ایک گاڑیوں میں بیٹھ کر مرزائیوں کی دوکانوں کا سامان نذر آتش کر دیا۔ تمام کالجوں، سکولوں اور زرعی یونیورسٹی کے طلباء نے کلاسوں کا بائیکاٹ کیا۔ ہجوم نے مرزائیوں کی بعض بڑی بڑی دکانوں کو جلا دیا۔ اکثر جگہ پولیس سے ٹکراؤ ہوا۔ بعض دکانیں مظاہرین نے لوٹ لیں۔ تمام شہر میں سیکورٹی پولیس اور ڈسٹرکٹ پولیس گشت کرتی رہی۔ مظاہرین اپنے احتجاجی اقدام میں مستعد و مشتعل رہے۔ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نے عدالتوں کا بائیکاٹ کرنے اور احتجاجی جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ تمام سیاسی دینی اور قومی جماعتوں نے مرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ کیے جانے کا مطالبہ دہرایا اور حکومت پر زور دیا کہ وہ انہیں خارج از اسلام قرار دینے کا دیرینہ مطالبہ فوری طور پر قبول کرے۔ تمام جماعتوں کا ایک مشترکہ اجلاس کچہری بازار کی جامع مسجد میں منعقد ہوا۔ مفتی زین العابدین، مولانا تاج محمود، مولانا خلیل احمد ضیاء، چوہدری صفدر علی رضوی اور ملک احمد سعید اعوان نے سانحہ ربوہ پر زبردست تقریریں کیں۔

مرزائیوں سے متعلق مسلمانوں کے متفقہ فیصلہ پر صاد کیا۔ اس کے بعد ایک زبردست جلوس نکالا گیا جو حبیب بنک کی بڑی بلڈنگ کے سامنے پُرامن طور پر ختم ہو گیا۔ پولیس نے مظاہرہ کرنے کی بنا پر چالیس افراد کو حراست میں لے لیا جن میں زیادہ تر طلبہ ہیں۔ مرزائیوں کی بہت بڑی تعداد بھاگ کر ربوہ چلی گئی ہے۔ ضلع کے تمام بڑے قصبوں مثلاً ٹوبہ ٹیک سنگھ، گوجرہ، کمالیہ، سمندری، جڑانوالہ، چک جھمرہ وغیرہ میں زبردست احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ مرزائی کی دکانوں کے تجارتی سامان کو نقصان پہنچایا گیا۔ گوجرہ میں چوہان میڈیکل سٹور، رفیق میڈیکل سٹور، سگریٹوں کی ایک ایجنسی اور کپڑے کی ایک دوکان کو جلا دیا گیا۔ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کی گئی لیکن مظاہرین نے اپنا احتجاج جاری رکھا۔ جناح کالونی لائیپور میں مرزائیوں کی دو کوٹھیوں کو آگ لگا دی گئی۔ پولیس نے ایک پچاسی افراد کو گرفتار کیا ہے۔ اور کئی جگہ اشک آور گیس چھوڑ کر لاٹھی چارج کر چکی ہے۔ چک جھمرہ میں زبردست مظاہرے کیے گئے۔ اس کی نواحی بستیوں میں بھی احتجاج کا زور بندھا رہا۔ اکثر جگہ مرزائیوں کی دکانوں اور مکانوں کا سامان لوٹ کر راکھ کر دیا گیا۔ مقامی مرزائی جماعت کے امیر کا جنرل سٹور لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ یہ آگ آتنی پھیل کر لائل پور سے فائر بریگیڈ نے پہنچ کر قابو پایا لیکن اُس وقت تک پُورا سٹور اور دُوکان جل چکے تھے۔ ہجوم کو اس قدر غصہ تھا کہ مرزائیوں کے گھروں اور دکانوں کے دروازے، کھڑکیاں اور چھتیں تک اکھاڑ کر نذر آتش کر دیں۔ علاقہ کے بجلی گھر کا ایس۔ ڈی۔ او مرزائی عقیدہ اس کے گھر پر حملہ کیا اور سامان نکال کر آگ لگا دی۔ جڑانوالہ میں مکمل ہڑتال کی گئی، مطالبات کا اعادہ کیا گیا۔ رحیم یار خاں میں مکمل ہڑتال رہی اور ایک زبردست جلوس نکالا گیا۔ جھنگ میں جمعیت العلمائے اسلام کے زیر اہتمام احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ سارا شہر بند رہا۔ سکھانوال میں مظاہرے ہوئے، اخرجی کر طالبات نے بھی جلوس نکالا۔ تمام قصبے نے ہڑتال کی۔ خانیوال میں نوجوانوں اور طالب علموں نے زبردست مظاہرہ کیا اور بلاک ۲ میں واقع احمدیہ لائبریری کو آگ لگا دی۔ ایک مرزائی عورت نے ہجوم پر فائرنگ کی۔ عوام نے پتھراؤ کیا۔ پولیس نے حالات کو بگڑنے سے بچا لیا۔ شہر میں ہڑتال رہی۔ سیکورٹی پولیس کے مسلح دستے گشت کر رہے ہیں۔ کئی ایک نوجوانوں کے علاوہ طالب علم رہنما طارق جاوید کو گرفتار کر لیا گیا۔ کمالیہ میں دو میل لمبا جلوس نکلا اور پُرامن مظاہروں کے بعد منتشر ہو گیا۔ ساہیوال میں بارہ بجے دوپہر سے مکمل ہڑتال ہے۔ تمام تنظیموں کے اجلاس میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے اور سانحہ ربوہ کی تحقیقات کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ چنیوٹ میں زبردست جلوس نکالا گیا ــــ شاہ میڈیکوز کے قادیانی العقیدہ مالک کے مکان

کی چھت سے جلوس پر شدید خشت باری کی گئی جس سے ہجوم بے قابو ہو گیا اور شہر میں مرزائیوں کی تمام دکانوں کو شاہ میڈیکوز سمیت نذرِ آتش کر دیا۔ ایک قادیانی العقیدہ دندان ساز کے مکان سے جلوس پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی، جس سے متعدد طلباء زخمی ہو گئے۔ تین کی حالت نازک بیان کی جاتی ہے۔ شہر میں مکمل ہڑتال ہے جو کل بھی جاری رہے گی۔ گجرات میں ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن اور مختلف دینی رہنماؤں نے زبردست ردِ عمل کا اظہار کیا۔ کئی ایک جلوس نکالے گئے اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس سلسلے میں مسلمانوں کے مطالبات کو بلا تاخیر منظور کرے۔ ملتان میں انتظامیہ نے کالج کے ہوسٹل بند کرا دیے اور طلباء کو فوری طور پر گھروں میں چلے جانے کا حکم دیا ہے۔ تمام شہر میں ڈسٹرکٹ پولیس کے ہمراہ سیکورٹی پولیس گشت کر رہی ہے۔ پولیس نے چھ طالب علم لیڈروں کے علاوہ کئی ایک افراد کو دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی اور ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کیا ہے۔ شہر میں ایک بجے دن سے مکمل ہڑتال ہے۔ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نے ربوہ کو کھلا شہر قرار دینے اور سانحہ ربوہ کے حقیقی مجرموں پر مقدمے قائم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

پنجاب اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے ارکان نے سانحہ ربوہ کے پیشِ نظر حکومت سے مطالبہ کیا کہ مرزائیوں کو فوراً اقلیت قرار دیا جائے۔ انہیں کلیدی آسامیوں سے سبکدوش کر دیا جائے اور ربوہ سٹیشن کے سانحہ کی تحقیقات اعلیٰ سطح پر ہو۔ مجرموں کو عبرتناک سزا دی جائے۔ اس بحث میں جن چھ ارکان نے حصہ لیا۔ علامہ رحمت اللہ ارشد اپوزیشن لیڈر نے نہایت شاندار الفاظ میں مرزائیت کا تجزیہ کیا۔ سید تابش الوری نے معرکۃ الآرا تقریر کی۔ ملک خداداد بندیال نے پرجوش خیالات کا اظہار کیا۔ حاجی محمد سیف اللہ نے مسلمانوں کے جذبات کی نمائندگی کی۔ مخدوم زادہ حسن محمود نے بھی تائیدی تقریر کی۔ حافظ علی اسعد اللہ نے اقرار کیا کہ مرزائی پاکستان میں بھی اسرائیل قائم کرنا چاہتے ہیں۔ میاں خورشید انور، چوہدری امان اللہ، خان زادہ خان محمد وغیرہم نے اپوزیشن کے دوسرے لیڈروں کی ہم نوائی میں تحریک التوا کی تائید کی۔ لیکن سپیکر نے یہ کہہ کر اجازت نہ دی کہ مسئلہ عدالت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس پر حزبِ اختلاف کے ارکان نے کھڑے ہو کر ختم نبوت زندہ باد کے نعرے لگائے۔ آج پھر قادیانیت کے مسئلے کو ایک تحریک کی شکل دینے کے لیے دفتر چٹان لاہور میں مقامی علماء و زعماء کا ایک اہم اجلاس ہوا جس میں سیاسی جماعتوں کے نمائندے بھی شریک تھے۔ اس میں اجلاس کو ایک وسیع شکل دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ گورنمنٹ کالج، اسلامیہ کالج اور ایم۔ اے۔ او کالج کے طلباء نے احتجاجی مظاہرے کیے۔ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنا چاہی تو پولیس والوں نے

آنسو گیس چھوڑ کر انہیں منتشر کر دیا۔ یونیورسٹی نیو کیمپس کے ہوسٹلوں میں سے قادیانی طلبا کو مسلمان طلبہ نے نکال کر بھگا دیا۔ لاہور کے تجارتی مراکز میں ہڑتال رہی اور نصف دن کے بعد تمام مارکیٹیں بند ہو گئیں۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، فاطمہ جناح میڈیکل کالج، انجینئرنگ یونیورسٹی اور دوسرے تمام کالجوں کی سٹوڈنٹس یونینوں نے ربوہ کی جارحیت کے خلاف احتجاج کیا اور قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ کیے جانے کا مطالبہ دہرایا۔ جمعہ کے روز تمام کالج احتجاجاً بند رہے۔ تمام شہر میں مرزائیت کے خلاف غم و غصہ کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ تمام ہوسٹل بند کر دیے گئے۔ قادیانی طلبہ بھاگ گئے۔ پنجاب یونیورسٹی کو ماتحت کالجوں سمیت غیر معین عرصے کے لیے بند کر دیا گیا۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے ہوسٹل سے قادیانی طلبا کو نکال دیا اور ان کے بند کمروں سے سامان اٹھا کر نذر آتش کر دیا گیا۔ سپیرئیر سائنس کالج وحدت روڈ سے بھی مسلمان طلبہ نے قادیانی طلبہ کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی کے طلبا نے ایک مرزائی کی کار کو نذر آتش کر دیا۔ فائر بریگیڈ نے آگ پر قابو پایا چاہا تو طلبہ نے خشت باری کی ایک کار جل کر راکھ ہو گئی۔ دو گھنٹے تک جی ٹی روڈ پر ٹریفک بند رہا۔ مسٹر جاوید ہاشمی سابق صدر پنجاب سٹوڈنٹس یونین نے طلبہ کو پُرامن رہنے اور احتجاج کو ختم کرنے کی تلقین کی۔ مسٹر رامے وزیر اعلیٰ پنجاب نے واقعہ ربوہ کی عدالتی تحقیقات کا حکم دیدیا۔ چیف جسٹس سردار محمد اقبال نے اس غرض سے مسٹر جسٹس کے۔ ایم۔ صمدانی کو تحقیقاتی افسر مقرر کیا ہے۔ راقم نے مقامی زعماء کے ساتھ شہر کا دورہ کیا اور مسلمانوں کے جذبات سے آگاہی حاصل کی۔ تمام حلقہ خیال پر مشتمل مجلس عمل قائم کرنے کے لیے مولانا تاج محمود اور مولانا محمد شریف جالندھری کے مشورے سے ملک کے مختلف اکابر کو تار دیے گئے۔ راقم نے بعض قانونی گذارشات کے سلسلے میں جسٹس کے۔ ایم۔ صمدانی کے علاوہ چیف جسٹس سردار محمد اقبال سے ملاقات کی اور اس سلسلے میں انکوائری کے حدود معلوم کئے۔ اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کی طرف سے تحقیقات میں تعاون کا یقین دلایا۔

یکم جون :۔ مسٹر جسٹس کے۔ ایم۔ صمدانی نے امور متنی کو تحقیقات کے دائرہ کار کا اعلان کیا۔ مسٹر حنیف رامے نے ایک بیان میں کہا کہ تحقیقاتی رپورٹ کی روشنی میں واقعہ ربوہ کے کسی مجرم کو معاف نہیں کیا جائیگا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے ایک بیان میں کہا کہ عوام تحقیقاتی رپورٹ کی اشاعت کا انتظار کریں۔ چودھری ظہور الٰہی نے واقعہ ربوہ پر قومی اسمبلی میں تحریک التوا پیش کی۔ میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی نے ایک بیان میں کہا کہ مرزائیوں کو سیاسی جماعت قرار دیکر اس پر پابندی لگا دی جائے، کیونکہ ان کی جماعت موجودہ حکومت اور ملک کی سالمیت کے خلاف سازش کر رہی ہے۔ لاہور کی تمام مساجد میں نماز جمعہ کے

اجتماعات میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے اور سانحہ ربوہ کے ملزموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کیا گیا۔
پیر پگاڑا شریف نے لاہور پہنچ کر مسلم لیگ لائرز سرکل کے افتتاحی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ واقعہ
ربوہ کے نتائج بہت خطرناک ہو سکتے ہیں۔ پولیس نے مسٹر جاوید ہاشمی کو اس "جرم" میں گرفتار کر لیا کہ انہوں
نے مسلمان طلباء میں قادیانی طلباء کے خلاف اشتعال پیدا کیا اور ان کا سامان جلوا دیا ہے۔ لائل پور کے حالات
احتجاج کے عروج پر پہنچ گئے۔ تین سو پچپن اشخاص کو گرفتار کیا گیا۔ پولیس کی فائرنگ سے ایک شخص ہلاک اور دو زخمی
ہو گئے۔ آنسو گیس کا گولہ لگنے سے ایک شخص انتقال کر گیا۔ مسلمانوں نے زبردست احتجاجی جلوس نکالے۔ کئی قادیانیوں
کے مکان، دو دکانیں اور بارہ دو موٹر وغیرہ جلا دی گئیں۔ ایک احمدی مقبول احمد نے رضا آباد میں ایک شخص غلام محمد
کو گولی چلا کر شہید کر ڈالا۔ اس کی فائرنگ سے ایک عورت بھی شدید زخمی ہو گئی۔ لوگوں نے اس کے مکان پر حملہ
بول کر سامان جلا ڈالا۔ لائل پور کی گلشن کالونی میں سینیٹری فٹنگ مرچنٹ کے قادیانی العقیدہ مالکان کی خوبصورت
کوٹھی کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ان کی کار کے علاوہ دوسرا سامان بھی پھونک دیا گیا۔ ایک اور قادیانی ظہور احمد کی کوٹھی
جلا دی گئی۔ اس شخص کی کار کے علاوہ ہزاروں روپے کا سامان نذر آتش کیا گیا۔ اس نے مسلمانوں پر گولیاں چلائی
تھیں۔ غلام محمد آباد میں مرزائیوں کے متعدد مکان جلا دیے گئے اور ان کا سامان آگ میں جھونک دیا گیا۔ تمام
دن مرزائیوں کے مکانوں اور دکانوں کو لوگوں نے اُن کی فائرنگ کے جواب میں ایندھن کی طرح پھونکا۔
ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نے مرزائیت کے خلاف احتجاجی جلوس نکالا۔ زرعی یونیورسٹی کے طلباء نے بھی مظاہرہ
کرنا چاہا، لیکن پولیس نے لاٹھی چارج کر کے جلوس کو منتشر کر دیا۔ عوام کے احتجاج و اضطراب اور غم و غصہ
کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا۔ ان میں زیادہ اشتعال اس سے پھیلا کہ مرزائیوں کے ہر گھر میں اسلحہ تھا اور وہ
بے خوف ہو کر مسلمانوں پر فائرنگ کرتے تھے۔ شہر بے قابو ہو گیا، تو وزیر اعلیٰ پنجاب مسٹر حنیف رامے نے
آئی۔ جی پولیس کو حکم دیا کہ وہ لائل پور کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ بہاول پور میں مکمل ہڑتال رہی۔
زبردست احتجاج کیا گیا۔ — ایک قادیانی العقیدہ پیٹرولیم سروس پر مشتعل ہجوم نے پتھراؤ کر کے مظاہرہ کیا۔
مسٹر فرید پراچہ صدر پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین نے سرگودھا میں حکومت کو متنبہ کیا کہ وہ ربوہ کو
کھلا شہر قرار دے اور مرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ کر دے، ورنہ طلباء تحریک چلانے پر مجبور ہو جائیں
گے۔ شاہ کوٹ میں مکمل ہڑتال رہی۔ گجرات میں زبردست احتجاجی مظاہرے کیے گئے۔ شاہ کوٹ میں مکمل ہڑتال
ہوئی۔ وزیر آباد میں زبردست مظاہرہ ہوا۔ میانوالی میں طلباء نے ہڑتال کی اور جلوس نکالا۔ شہر میں کشیدگی رہی۔

گئی۔ پولیس گشت کر رہی ہے۔ تمام ضلع کی تحصیلوں سے مرزائی دُم دبا کر بھاگ رہے ہیں۔ رحیم یار خان میں احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے منتشر ہونے کا حکم دیا۔ عوام مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے شاہی روڈ کے ایک قادیانی ہوٹل اور بجلی کی ایک دُکان پر خشت باری کی۔ پولیس نے آنسو گیس چھوڑی۔ ہجوم نے پان کی ایک دُکان کو آگ لگا دی۔ پولیس نے جامع مسجد غلہ منڈی میں بھی گیس کے گولے چھوڑے۔ چند مظاہرین گرفتار کیے گئے۔ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نے واقعہ ربوہ پر شدید احتجاج کیا۔ بھکر میں زبردست احتجاج کیا گیا۔ علاقے میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی۔ گورنمنٹ کالج کے طلباء نے ایک پُرامن جلوس نکالا۔ ایک زبردست جلسۂ عام کیا گیا۔ چشتیاں میں طلبہ نے جلوس نکالا۔ انتظامیہ نے روکنا چاہا۔ نتیجۃً پولیس اور طلباء میں مڈبھیڑ ہوئی جو نصف گھنٹہ جاری رہی۔ آٹھ طلبہ گرفتار کیے گئے۔ اس پر باقی طلباء نے مورچہ لگا دیا۔ تو انہیں فوراً رہا کر دیا گیا۔ مرزا غلام احمد کا پتلا جلایا گیا۔ شہر نے اگلے روز مکمل ہڑتال کی۔ عارف والا میں زبردست جلوس نکلا۔ ایک قادیانی ڈاکٹر خالد ہاشمی کی دکان پر دھاوا بول دیا اور فرنیچر وغیرہ کو آگ لگا دی۔ اگلے روز پھر جلوس نکالنے کا اعلان کیا گیا۔ پسرور میں مکمل ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ خانیوال میں احتجاج جاری ہے۔ ساہیوال میں نماز جمعہ کے بعد جلوس نکالا گیا۔ ٹاؤن ہال میں جلسہ ہوا۔ لوگوں نے اپنے مطالبات کا اعادہ کیا۔ چنیوٹ کی احمدیہ مسجد پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ اس کا نام مسجد ختم نبوت رکھا۔ تمام شہر نے وہیں نماز جمعہ ادا کی۔ تحریک طلباء اسلام کے مرکزی صدر ملک رب نواز نے دو گھنٹے تک تقریر کی۔ اس کے بعد ستر ہزار افراد پر مشتمل جلوس نکالا گیا۔

ڈپٹی کمشنر اور ایس۔ پی جھنگ نے پریس کانفرنس میں انکشاف کیا کہ ربوہ، لالیاں، اور نشتر آباد کے اسٹیشن ماسٹروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ حافظ آباد میں زبردست احتجاجی اجتماع ہوا اور ملحقہ قصبات میں عظیم مظاہرے کیے گئے۔ اکثر جگہ مرزائیوں کی مختلف دکانوں کو جلا دیا گیا۔ سیالکوٹ میں زبردست مظاہرے کیے گئے۔ ظہور الحق سینیٹر کو بعض افراد نے چاقوؤں سے زخمی کرنا چاہا۔ اس کے دفتر کو آگ لگا دی۔ حافظ آباد اور گوجرانوالہ کے مابین ٹریفک معطل ہو گیا۔ عوام نے احمدی مسجد گوجرانوالہ کا محاصرہ توڑنے سے انکار کر دیا کہ اس مسجد سے مرزائیوں نے مسلمانوں کے جلوس پر پتھراؤ کیا تھا۔ تمام مساجد سے احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ پولیس نے لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس استعمال کی۔ یکم جون کو مکمل ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ رات گئے گوجرانوالہ کے حالات بے قابو ہو گئے۔ مرزائیوں کی آٹھ دکانیں اور پانچ مکان جلا دیے گئے۔ اس خرابی کا باعث خود قادیانی تھے جنہوں نے مسلمانوں کے پُرامن جلوس پر پتھراؤ کر کے ابتدا کی۔ گوجرانوالہ کے

حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ راولپنڈی میں احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ مسلمانوں نے راولپنڈی اور مری میں مرزائیوں کی دو مسجدوں پر قبضہ کر لیا۔ اسلام آباد میں احتجاجی ہڑتال کی گئی۔ چھ افراد کو حراست میں لے لیا گیا۔ بہاول نگر کے طلباء نے پُرجوش مظاہرہ کیا۔ مرزائیوں کی دو دکانوں کو نقصان پہنچایا۔ صوبہ کے تقریباً سبھی اضلاع کے دیہات وقصبات سے مرزائیوں کے فرار ہو جانے کی اطلاعیں آ رہی ہیں۔ حکومت سخت پریشان ہے۔ مرزائیوں نے مختلف اجتماعات میں شریک ہونے کے لیے اپنے رکنیت چھوڑ رکھے اور لاہور چھاؤنی کے علاقے میں اپنے دو خفیہ مرکز قائم کیے ہیں جہاں دن میں چار دفعہ ربوہ سے قاصد آتے۔ خفیہ پیغام لاتے اور خفیہ دستاویز لے جاتے ہیں۔ سیکورٹی پولیس مختلف مقامات پر متعین کر دی گئی ہے۔ لاہور آتش فشاں پہاڑ کی طرح خاموش ہے۔ علماء روزنامہ مسلمانوں میں گھوم پھر کر انہیں صبر کی تلقین کرتے اور ۲۴ رجون ہونے والی مجلس مشاورت کے فیصلے تک پُرسکون رہنے کی اپیل کرتے ہیں۔ لاہور کو قابو میں رکھنا آسان نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم ہے کہ اس کے نوجوان (بہ استثناء) ہمارے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ قادیانی اسی کوشش میں ہیں کہ تو تکرار و فساد پیدا ہو۔ نہ جانے کیوں؟

۱۲ر جون: حکومت پنجاب نے تحفظ امن عامہ آرڈیننس کے تحت تمام اخبارات و مطابع اور لٹریچر پر پابندی عائد کر دی ہے کہ نہ تو واقعہ ربوہ سے متعلق کوئی ردعمل ظاہر کیا جائے۔ نہ کوئی خبر دی جائے۔ اور نہ کوئی تبصرہ ہو۔ اس حکم کے مطابق ایسی تمام خبروں، تبصروں، بیانوں، اطلاعوں، تقریروں، کارٹونوں اور اظہار خیال وغیرہ کی ممانعت کر دی ہے۔ حکومت کی مخصوص اصطلاح کے مطابق فرقہ وارانہ لٹریچر شائع کرنا ممنوع قرار دیا ہے۔ نوائے وقت نے اپنے اداریہ کے دونوں کالم سفید چھوڑ دیے ہیں۔ اس حکم کے متعلق روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ خان عبدالقیوم خان وزیر داخلہ کی ربوہ دوستی کے باعث ایسا ہوا ہے۔ مرزا ناصر احمد نے جنرل انتخابات میں احکامات جاری کیے تھے کہ جہاں پیپلز پارٹی کا امیدوار نہ ہو یا پیپلز پارٹی کے مقابلہ میں خان عبدالقیوم خان کے امیدوار کا پلڑا بھاری ہو، وہاں تمام قادیانی خان عبدالقیوم کے امیدوار کا ساتھ دیں۔ صوبے کے تمام اضلاع میں مرزائیوں سے مسلمانوں کی ناراضی پھیلتی جا رہی ہے۔ اب سرحد، سندھ اور بلوچستان سے بھی ردعمل کی خبریں آنے لگی ہیں۔ مسٹر جسٹس کے ایم صمدانی نے اشتہار کے ذریعہ ۱۵ رجون کو صبح ۹ بجے سے سانحہ ربوہ کی تحقیقات شروع کرنے کا اعلان کیا ہے اور متعلقہ شہادتیں طلب کی ہیں۔

۳ر جون :۔ بعض مرزائیوں کی طرف سے قبول اسلام کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ وہ مختلف اخباروں میں اشتہار دینے لگے ہیں۔ سنسر کی شدید پابندیوں کے باوجود صوبہ بھر میں سانحہ ربوہ کا شدید ردعمل موجود ہے۔ پولیس کو اس ردعمل کے محرک کی خاطر وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کے احکام دیئے جا رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سانحہ ربوہ نے قادیانیت کے خلاف ولولہ پیدا کر دیا ہے اور تحریک تمام ملک میں احتجاج کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

۴ر جون :۔ صوبہ کے حالات بگڑ رہے ہیں۔ بعض شہروں میں جزوی ہڑتال ہوئی۔ لاہور کی مسجد وزیر خاں میں ایک جلسہ کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ لیکن اس سے پہلے آغا شورش کاشمیری، نوابزادہ نصر اللہ خاں، چوہدری غلام جیلانی، ملک محمد قاسم، سید محمود احمد رضوی، علامہ احسان الٰہی ظہیر، سید مظفر علی شمسی اور علامہ عزیز انصاری گرفتار کر لیے گئے۔ ان سب کو دریائے راوی کے ریسٹ ہاؤس میں رکھا گیا۔ مولانا عبید اللہ انور مسجد وزیر خاں میں پہنچ گئے۔ حاضرین سے خطاب کیا۔ اس کے بعد لوگوں نے جلوس نکالنے کی کوشش کی، تو پولیس اور ہجوم میں تصادم ہو گیا۔ آنسو گیس استعمال کی گئی۔ ہجوم نے بعض جگہ آگ لگا دی۔ شب کے آغاز میں زیر حراست رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا۔ قومی اسمبلی میں واقعہ ربوہ سے متعلق التواء کی سات تحریکیں مسترد ہو گئیں۔ اپوزیشن کے ارکان ختم نبوت زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے واک آؤٹ کر گئے۔ سپیکر نے اعلان کیا کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کے لیے آئین میں ترمیم کرنا ہو گی۔ صوبہ کے ہیجان کے پیش نظر وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا کہ صورت حال خراب کرنے والوں سے سختی سے نپٹا جائے گا۔ پنجاب کے علاوہ باقی صوبوں سے بھی مرزائیوں کے خلاف غم و غصہ کی خبریں آ رہی ہیں اور احتجاج کے مظاہروں کا زور بندھ چکا ہے۔

۶ر جون :۔ جسٹس صمدانی نے واقعہ ربوہ کی تحقیقات شروع کر دی۔ جن رہنماؤں کو کل گرفتار کیا گیا تھا، ان کے متعلق میاں خورشید انور اور مسٹر تابش الوری نے تحریک التواء پیش کیں۔ سپیکر نے مسترد کر دیں۔ اپوزیشن نے علامتی واک آؤٹ کیا۔ صوبہ کے حالات اسی طرح بے قابو ہیں۔ بہاولپور اور حضرو میں پولیس نے احتجاجی جلوسوں پر لاٹھی چارج کیا۔ آنسو گیس پھینکی۔ اکثر شہروں میں ہڑتال رہی۔ سرگودھا میں آتش زنی کی وارداتیں ہوئیں۔ پولیس نے مرزا ناصر احمد سے تفتیشی رابطہ قائم کیا۔

۷ر جون :۔ مرزا ناصر احمد نے ہائی کورٹ میں ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست دی۔ حزب اختلاف کے پارلیمانی گروپ نے حکومت کو پانچ مطالبات پیش کیے۔ ان میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے

کا مطالبہ بھی تھا۔ نوابزادہ نصراللہ خاں نے ایک بیان میں واقعہ ربوہ کی شدید مذمت کی اور وزیراعظم و وزیراعلیٰ سے سوال کیا کہ انہوں نے اس واقعہ کی مذمت کیوں نہیں کی؟

۸ رجون :- مسٹر حنیف رامے نے ایک بیان میں صوبہ کی صورتحال کو ناقابل برداشت قرار دیا۔ میاں طفیل محمد نے ایک بیان میں کہا کہ ربوہ کی ریاست اندر ریاست ختم کی جائے۔ اسلام آباد میں مظاہرین نے زبردست مظاہرہ کیا۔ پولیس نے عوام کو نیشنل اسمبلی تک جانے سے روکا۔ لاٹھی چارج کیا، آنسو گیس پھینکی۔ لاہور میں نیلا گنبد کی مسجد سے نماز جمعہ کے بعد جلوس نکالا گیا۔ ۲۲ افراد گرفتار کر لیے گئے۔ رحیم یار خاں کے علاوہ کئی علاقوں میں آتش زنی کی وارداتیں ہوئیں ________ صوبائی وزیراعلیٰ نے تقریباً دو درجن صحافی و علماء کو مدعو کیا۔ ان سب نے وزیراعظم سے کہا کہ ہم قادیانیوں کے سلسلہ میں اپنے موقف سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ ربوہ اور چنیوٹ کے درمیان ٹریفک پر اوقات شب میں پابندی لگا دی گئی — ربوہ کی دیواروں پر قادیانیوں نے عبارت درج کی ہے کہ "خدا اپنی فوجوں کے ساتھ آ رہا ہے" ظفراللہ خاں نے لندن میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے الزام لگایا کہ حکومت پنجاب قادیانیوں کے جان و مال کا تحفظ کرنے میں ناکام رہی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ حکومت اس سلسلے میں غیر جانبدار نہیں ہے۔ عالمی اداروں سے اپیل کی کہ وہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے مبصرین پاکستان بھیجیں۔ ایک اور اطلاع ہے کہ ظفراللہ خاں اور ایم۔ ایم۔ احمد وزیراعظم سے ملاقات کے لیے راولپنڈی پہنچ گئے ہیں۔

۹ رجون :- ہم اس سلسلے میں مسلسل کوشش کر رہے تھے کہ اخبارات پر پابندی کے باعث حالات کا سدھار ممکن نہیں بلکہ افواہیں خرابیٔ حالات کا باعث ہو سکتی ہیں۔ وزیراعلیٰ نے تمام جلسوں کی پابندیاں ختم کر دینے کا اعلان کیا لیکن صوبہ سندھ کی پابندیاں بدستور قائم ہیں۔ وہاں یہ پابندیاں پنجاب سے پہلے عاید کی گئیں اور اس حکم تحت نوائے وقت اور چٹان کے پرچے سندھ کے مختلف سٹیشنوں پر ضبط کیے جاتے رہے۔ جسٹس صمدانی کی تحقیقات جاری ہے۔ تحریک استقلال کے مرکزی دفتر نے اپنے ارکان کو ہدایت کی ہے کہ وہ قادیانیوں کے خلاف تحریک میں بھرپور حصہ لیں۔

۱۰ رجون :- مرزا ناصر احمد نے آل انڈیا ریڈیو کے نشریہ کے مطابق ایسوسی ایٹڈ پریس امریکہ کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ قادیانیوں کے خلاف فسادات بھٹو کی پارٹی نے کرائے ہیں اور اس طرح حکمران جماعت

اپنی بگڑی ہوئی ساکھ بحال کرنا چاہتی ہے۔ مرزا صاحب نے مزید کہا کہ خواہ وہ قتل ہو جائیں لیکن اپنے مسلک سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ بی۔ بی۔ سی نے ایک خصوصی پروگرام میں تسلیم کیا کہ پاکستان میں قادیانی فرقے کے خلاف تحریک کا زور ہے۔ اس سے پہلے قادیانی انگریزوں کے مفاد کی خدمت کر کے اپنا وجود قائم رکھ سکتے تھے۔ صوبائی وزیروں میں سے کئی ایک نے اپنا لہجہ بدل لیا اور مسلمانوں کی تائید کرنے لگے ہیں۔ مسٹر صادق علی وزیر مواصلات نے کہا ہے کہ مسٹر بھٹو اسلام کے اصولوں کے مطابق قادیانی مسئلہ حل کر دیں گے۔ عوام کو ان پر اعتماد کرنا چاہیے۔ ۹ر جون کو ملک کی اٹھارہ دینی اور سیاسی جماعتوں کا مشترکہ اجلاس حضرت مولانا احمد علی کی مسجد و مدرسہ میں منعقد ہوا جو صبح دس بجے سے ۳ بجے سہ پہر تک جاری رہا۔ اس میں اکثر و بیشتر اکابر نے شرکت کی۔ مولانا مفتی محمود، مولانا یوسف بنوری، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف، نوابزادہ نصر اللہ خان، چوہدری غلام جیلانی اور آغا شورش کاشمیری نے ساری صورت حالات کا جائزہ لیا۔ آخر طویل بحث کے بعد شورش کاشمیری کی تحریک و تجویز پر قادیانیوں کے اقتصادی و عمرانی بائیکاٹ کا فیصلہ کیا گیا۔ مجلس عمل قائم کی گئی اور مسلمانوں کے دیرینہ مطالبات کو حسن جوش و خروش کے ساتھ دہرایا گیا۔ نیز فیصلہ کیا گیا کہ چودہ جون کو ملک گیر ہڑتال کی جائے۔ متحدہ جمہوری محاذ نے اگلے روز مکمل ہڑتال کی تائید کی۔

۱۲ر جون :- تمام ملک میں قادیانیوں کے اقتصادی و عمرانی بائیکاٹ کا خیر مقدم کیا گیا اور ولولہ انگیز تحریک پیدا ہو گئی۔ ایک روز پہلے گیارہ جون کو شورش کاشمیری نے وزیر اعظم سے طویل ملاقات کی۔ انہیں مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا۔ قادیانی مسئلے کی بہ تفصیل وضاحت کی اور انہیں مجلس عمل کے جید علماء سے ملاقات پر آمادہ کیا تاکہ وہ جملہ کوائف سے آگاہ ہو سکیں۔ مرزا غلام احمد کے دعاوی پر اشتہارات کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہو گیا۔ وزیر اعظم کے زیر صدارت اس مسئلہ پر ایک اعلیٰ سطح کا اجلاس ہوا۔ ربوہ میں قادیانیوں کے خود ساختہ ڈپٹی کمشنر اور ایس۔ پی گرفتار کر لیے گئے۔ ملائی پور ہول سیل کلاتھ مرچنٹ ایسوسی ایشن نے قادیانی کے سماجی بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ وزیر اعظم نے ایک روز پہلے تمام علماء سے اپنی ملاقاتیں مکمل کیں۔ گزشتہ شب وزیر اعظم بھٹو کی تقریر نے عوام کو بے حد متاثر کیا۔ وزیر اعظم نے کہا کہ جو شخص ختم نبوت پر ایمان نہیں رکھتا وہ مسلمان نہیں ہے اور قادیانیوں کا مسئلہ حل کرنے کا شرف انشاء اللہ انہیں حاصل ہو گا اور یہی اعزاز انہیں خدا کے حضور سرخرو کر دے گا۔ وزیر اعظم نے کہا کہ وہ اس مسئلے کو جولائی کے پہلے ہفتے میں قومی اسمبلی کے سامنے پیش کر دیں گے اور پارلیمنٹ کے ارکان پر کسی عنوان سے کوئی دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔ وزیر اعظم کی

اس نشری تقریر کو لوگوں نے بڑے ذوق و شوق سے سنا اور تحسین و ستائش کا اظہار کرتے ہوئے اس امر کا اظہار کیا کہ وزیر اعظم نے صحیح طریق کار منتخب کیا ہے۔ مسٹر بھٹو نے ۸ر جون تک لاہور میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ ظفر اللہ خاں نے لندن میں وزیر اعظم سے ملاقات کی۔ مولانا محمد یوسف بنوری نے ۱۶ر جون کو لائل پور میں مجلس عمل کا اجلاس طلب کیا۔ اسلامی جمعیت طلباء نے اپنے صدر مسٹر ظفر جمال بلوچ اور دوسرے عہدہ داروں کی قیادت میں تحریک کو رواں دواں کرنے کا فیصلہ کیا اور والہانہ طور پر متحرک ہوگئے۔

۱۴ر جون : آج تمام ملک میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے مطالبے کی حمایت میں ہڑتال ہوئی۔ اتنی بڑی ہڑتال اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ اس ہڑتال کو ریفرنڈم سے تشبیہ دی گئی۔ مسجد وزیر خاں لاہور میں ایک زبردست جلسہ ہوا جس میں مولانا عبدالستار خاں نیازی، نوابزادہ نصراللہ خاں، شورش کاشمیری، سید مظفر علی شمسی، مولانا عبیداللہ انور، علامہ احسان الٰہی ظہیر اور سید محمود احمد رضوی نے معرکۃ الآرا تقریریں کیں۔ اپوزیشن کے ارکان نے بھی عام ہڑتال کے سلسلے میں اسمبلی کے امروزہ سیشن کا بائیکاٹ کیا۔ ایئر مارشل اصغر خاں نے کہا کہ ہم برسر اقتدار آگئے تو قادیانیوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے۔ دوسرے تمام صوبوں میں قادیانیوں کے مکمل بائیکاٹ کی تحریک پھیل چکی ہے۔ سرحد اور بلوچستان کے مرزائی بھاگ کر ربوہ میں پناہ لے رہے ہیں۔ راولپنڈی، اسلام آباد اور گجرات میں تین ممتاز علماء گرفتار کر لیے گئے۔ پولیس ان کے مکانوں میں دیوار پھاند کر داخل ہوئی۔ ان علماء میں حضرت مولانا غلام اللہ خاں اور سید محمود گجراتی شامل ہیں۔ مولانا غلام اللہ خاں کی گرفتاری کے خلاف راولپنڈی میں زبردست احتجاج کیا گیا۔ اپوزیشن قومی اسمبلی سے واک آؤٹ کر گئی۔

۲۰ر جون : سرحد اسمبلی نے اتفاق رائے سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی سفارشی قرارداد منظور کی ہے۔ تمام ملک میں قادیانیوں کے بائیکاٹ کی تحریک زور پکڑ چکی ہے۔ ارباب عالم صدر سٹوڈنٹس یونین نشتر میڈیکل کالج ملتان نے جسٹس صمدانی کی عدالت میں بیان دیتے ہوئے انکشاف کیا کہ قادیانیوں نے ملک میں مارشل لاء لگوانے کے لیے ربوہ ریلوے سٹیشن پر ہنگامہ کیا تھا۔ لائل پور، لاہور اور گوجرانوالہ کے ضلعی افسروں سے معلوم ہوا کہ لاہور سے ایک قادیانی العقیدہ بریگیڈیئر ان کے پاس جا کر کہا کہ وہ اپنے شہر کو اس کی تحویل میں دے دیں لیکن انہوں نے صوبائی حکومت کے احکام کی عدم موجودگی میں ایسا کرنے سے انکار کیا۔ راولپنڈی کے جن علماء کو گرفتار کیا گیا تھا انہیں رہا کر دیا گیا ہے۔

۲۲ر جون : قادیانی مسئلے سے متعلق لوگوں کے جذبات بے پناہ ہوگئے ہیں۔ حکومت نے مرکزی

اعلیٰ سطح کی کانفرنس کے بعد کئی ایک اہم فیصلے کیے جن میں ربوہ کو کھلا شہر قرار دینے کا فیصلہ بھی شامل ہے اور ان قادیانیوں کی فہرستیں تیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو کلیدی آسامیوں پر فائز ہیں۔ لائل پور میں ایک قادیانی نے اندھا دھند فائرنگ کرکے دو مسلمانوں کو زخمی کیا جس سے صورت حال میں تموج پیدا ہو گیا۔

۲۴ر جون :- وزیراعظم بھٹو نے آرمی ایجوکیشن کور کے سالانہ ڈنر سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ حکومت قادیانیوں کے مسئلے کو مستقل طور پر حل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ ایک سرکاری ترجمان نے مرزا ناصر احمد اور ظفر اللہ خان کے الزامات کو بے بنیاد قرار دیا اور بتایا کہ غیر ملکی اخبارات میں حقائق کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ لائل پور میں مسلمانوں پر مرزائیوں نے فائرنگ کی۔ ۴۴ افراد گرفتار کر لیے گئے۔ جن میں ۱۰ مرزائی اور ۳۴ مسلمان ہیں۔ ڈی ٹائپ کالونی میں مکمل ہڑتال رہی۔ تمام صوبے میں مجلس عمل کے زیر اہتمام عظیم الشان جلسے ہو رہے ہیں۔ مسٹر جاوید ہاشمی نے بہاولپور میں اعلان کیا کہ ہم وزیراعظم بھٹو کو تحریک ختم نبوت کا مخالف ہرگز نہیں سمجھتے۔ مرزا ناصر احمد امریکی اخباروں کو پاکستان کے خلاف مسلسل بیان دے رہے ہیں۔ جسٹس صمدانی کی عدالت میں مسٹر صالح نور کے بیان سے قادیانی پریشان ہو گئے ہیں۔

۲۸ر جون :- قادیانی اپنے بائیکاٹ کی تحریک سے بوکھلا چکے ہیں۔ جامعۃ الازہر مصر نے قادیانیوں کے خارج از اسلام ہونے کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ علامہ رشید اور ان کے بعض ساتھیوں نے پنجاب اسمبلی میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تجویز پیش کی۔ اس قرارداد پر پیپلز پارٹی اور اپوزیشن کے متعدد ارکان نے مشترکہ طور پر دستخط کیے لیکن صوبائی سپیکر نے اجازت دینے سے انکار کیا۔ راولپنڈی میں مجلس عمل کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔

۳۰ر جون :- مرزائی اپنے مقاطعہ کی تحریک سے سخت پریشان ہیں اور انہیں اپنی تقدیر سامنے نظر آ رہی ہے۔ جسٹس صمدانی کی عدالت میں تحقیقات جاری ہے۔ مجلس عمل نے ۲۰ر جون کو اپنے اجلاس میں قادیانی مسئلے کے حل میں تاخیر پر تشویش کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں کل ہی قومی اسمبلی میں ایک بل پیش کرنے کا اعلان کیا۔ چونکہ وزیراعظم بھٹو دورہ پر ہیں۔ اس لیے اس بل کے مسئلے میں ایک آدھ دن کا التواء ہو سکتا ہے۔ سندھ میں آباد قادیانی اپنی جماعت کی وسیع اراضی میں پناہ لے رہے ہیں اور ان تمام شہروں کو چھوڑ چکے ہیں جہاں مسلمانوں کی دینی جمعیت کے چراغ روشن ہیں۔

یکم جولائی :- اسلام آباد میں قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں قادیانیوں کو خارج از اسلام

اقلیت قرار دینے کے لیے حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف نے متفقہ طور پر ایک خصوصی کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ تمام ارکان قومی اسمبلی کے ممبر ہوں گے۔ ان کی تعداد ۱۳۰ ہو گی، اور ان میں ۲۰ رکن اپوزیشن کے ہوں گے۔ وزیر اعظم بھٹو اجلاس میں شریک ہوئے۔ بعض تفصیلات طے کرنے کے لیے اجلاس دو گھنٹہ ملتوی کیا گیا۔ اس کے بعد اپوزیشن کی قرارداد اور سرکاری تحریک دونوں متفقہ طور پر منظور کر لی گئیں۔ خصوصی کمیٹی کے اجلاس خفیہ ہوں گے۔ اجلاس آج ہی شروع ہو گئے۔ طریقِ کار وضع کر لیا گیا۔ مجلسِ عمل نے تحریک میں توانائی پیدا کر دی ہے۔ کوئی سرکاری یا غیر سرکاری شخص مرزائیت کی بلاواسطہ یا بالواسطہ حمایت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کراچی سے پشاور تک جلسہ ہائے عام منعقد کیے جا رہے ہیں۔

۷ر جولائی: شورش کاشمیری کو حکومت پنجاب نے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر لیا۔ چونکہ شورش کاشمیری سخت بیمار تھا اس لئے گرفتار کنندہ مجسٹریٹ اور پولیس افسر انہیں میو ہسپتال کے البرٹ وکٹر بلاک میں لے گئے اور وہاں پولیس کے زبردست پہرہ میں رکھ دیا۔ چٹان کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا گیا۔ چٹان پرنٹنگ پریس کے علاوہ شورش کاشمیری کے بچوں کا پریس مسعود پرنٹرز بھی ضبط کر لیا گیا۔ تازہ شمارہ کی تمام کاپیاں بھی قادیانیت کی چہرہ کشائی کے جرم میں ضبط کر لی گئیں۔ نوائے وقت واحد روزنامہ ہے جو ختمِ نبوت کی تحریک میں مسلمانوں سے ہم آواز ہے اور اُن کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ نوائے وقت نے سنسر شپ پر نکتہ چینی کی اور لکھا ہے کہ اس سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ باقی تمام اخبارات نیشنل پریس ٹرسٹ کے آغوش میں ہونے کے باعث تماشا زیر لب ہیں۔ اکثر ایڈیٹر ہمارے ساتھ ہیں لیکن ملازمت کے ہاتھوں مجبور و معذور ہیں۔

انگریزوں کے زمانہ سے کر آزادی کے اس دور تک صرف چٹان ہی کو یہ شرف حاصل ہوا اور اس کے ایڈیٹر کے لیے باعثِ فخر و ناز ہے کہ مسئلہ ختمِ نبوت میں دو دفعہ اُس کے پریس ضبط کیے گئے۔ چٹان کا ڈیکلریشن منسوخ ہوا اور شورش کاشمیری قید کیا گیا۔ یہ پہلی اور آخری مثال ہے۔ پنجاب اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے ڈپٹی لیڈر میاں خورشید انور، میاں منظور احمد اور مولانا عبدالستار خان نیازی نے حکومت کے اقدام کی مذمت کی ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے فرزند سید عطاء المحسن بھی اس سلسلہ میں گرفتار کر لیے گئے۔ نوائے وقت نے اداریہ لکھا اور مرکزی مجلسِ عمل نے زبردست احتجاج کیا ہے۔ لاہور کی جامع مسجد نیلا گنبد میں زبردست احتجاجی جلسہ ہوا جس میں نوابزادہ نصراللہ خان، مولانا محمد یوسف بنوری، علامہ سید محمود احمد رضوی، پروفیسر غفور احمد، سید مظفر علی شمسی، مولانا تاج محمود، حافظ عبدالقادر روپڑی، علامہ احسان الٰہی ظہیر اور مولانا محمد اجمل خان

نے شورش کاشمیری کی گرفتاری اور چٹان پریس کی ضبطی پر تقاریر کیں۔ میرزائیوں کا معاشرتی مقاطعہ شباب پر ہے۔

* * *

۱۷ر جولائی :- ملک میں تحریک ختم نبوت اپنے عروج پر ہے۔ حکومت کے بعض گوشے میرزائیوں کے معاشرتی مقاطعہ سے سخت پریشان ہیں اور مختلف لہجہ میں مختلف اپیلیں کرتے ہیں۔ کبھی دھمکاتے ہیں اور کبھی وعظ کرتے ہیں کہ اسلام میں معاشرتی بائیکاٹ نہیں ہے۔ گویا اسلام کی تعلیمات حکام دعوندار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ صمدانی کمیشن میں میرزا ناصر احمد کی شہادت ہونے والی ہے۔ فاضل جج نے حکومت کی استدعا پر تحقیقات کا طریق کار بدل دیا اور گواہوں سے وکلاء کی بجائے خود سوال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بعض دفتری و سرکاری گوشے میرزائیوں کا مقاطعہ ختم کرانے کے لیے کئی ایک حلقوں میں لیپا پوتی کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق گوجرانوالہ کے مشہور صاحبزادہ فیض الحسن اور کراچی کے نصیر اجتہادی وغیرہم کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں۔ ان دونوں نے بعد ازاں معاشرتی بائیکاٹ کے سلسلہ میں بالواسطہ میرزائیت کی امداد کی لیکن تحریک اب ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہو چکی ہے۔

۱۹ر جولائی :- آج جسٹس صمدانی کی عدالت میں میرزا ناصر احمد کا بیان قلمبند کیا گیا۔ تمام بیان عدالتی احکام کے تحت صیغہ راز میں سات گھنٹے جاری رہا۔ شورش کاشمیری کی نظربندی اور چٹان پریس کی ضبطی کے خلاف خواجہ عبدالرحیم نے ہائیکورٹ لاہور سے رٹ داخل کی اور سماعت کی تاریخ ۲۴ جولائی مقرر ہوئی۔ خواجہ صاحب کے علاوہ شیخ مقبول احمد ایڈووکیٹ، چوہدری رفیق احمد باجوہ ایڈووکیٹ اور مسٹر آفتاب فرخ پیش ہوئے۔

دانش ربوہ کا مسعود پرنٹنگ پریس آنریبل چیف جسٹس سردار محمد اقبال کے حکم سے رٹ داخل ہوتے ہی واگزار ہو گیا ۔۔۔ آنریبل چیف جسٹس نے ایڈووکیٹ جنرل کو بلا کر کہا کہ کل صبح گیارہ بجے تک پریس واپس کر دو ورنہ فیصلہ دے کر احکام صادر کر دوں گا۔ حکومت کا کوئی کیس نہیں۔ مسعود پرنٹرز کو ناجائز طور پر سربمہر کیا گیا ہے۔

۲۰ر جولائی :- حکومت کے میرزائی نواز عناصر نے اپنی ایک سیاسی ایجنسی کو ہزاروں روپیہ دے کر مولانا محمد یوسف بنوری صدر مجلس عمل کے خلاف تمام اخبارات میں ایک اشتہار چھپوانا شروع کیا۔ اشتہار ایک فرضی انجمن کی طرف سے بے معنی اور بیہودہ تھا۔ نوائے وقت نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس اشتہار کو دیکھ کر عوام بھڑک اُٹھے۔ چوہدری رفیق احمد باجوہ کی درخواست پر مسٹر مجید نظامی ایڈیٹر نوائے وقت

اور مسٹر مسکین احسن بگیرا ایڈیٹر مشرق کو جسٹس صمدانی نے شہادت کے لیے طلب کیا۔ مسٹر مجید نظامی نے مشتہرین کی قلعی کھول دی۔ اس کے بعد یہ اشتہار بند ہوگیا جسٹس صمدانی نے ربوہ کا معائنہ کرکے اس کی حیثیت عرفی معلوم کی۔ مرزا ناصر احمد نے ملاقات کی خواہش کی اور قصر خلافت میں کھانے پر مدعو کرنا چاہا لیکن آپ نے دونوں درخواستیں شکرادیں کہا جاتا ہے۔ جسٹس صمدانی کو اس معائنہ میں عجیب وغریب معلومات حاصل ہوئی۔

۲۴ رجولائی :۔ مرزا ناصر احمد نے قومی اسمبلی میں اپنا بیان مکمل کرلیا۔ اس بیان سے پیپلز پارٹی کے غیر جانبدار ارکان اس درجہ برافروختہ ہیں کہ انہوں نے مرزا ناصر احمد پر کئی بار درشت لہجہ میں جرح کی اور اس کے بعض گستاخانہ کلمات پر ارکان حاضرنے سخت الفاظ میں ٹوکا۔ تمام ارکان قادیانیت کے خارج از اسلام ہونے پر متفق ہیں۔ مرزائیت کے خلاف حکومت کے مختلف حلقوں میں بھی شدید قسم کے جذبات پیدا ہوچکے ہیں۔

۲۶ رجولائی :۔ شورش کاشمیری نے ۲۵ رجولائی کو جسٹس صمدانی کی عدالت میں قادیانی اُمت کے باب میں شہادت دی۔ شورش کاشمیری پولیس کی حراست میں بیماری کے باوجود پیش ہوا اور ان تمام سازباز سے پردہ کا انکشاف کیا جن کے مطابق قادیانی اپنے سیاسی اقتدار کے لیے عالمی اور قومی سطح پر عمل کررہی ہیں۔ یہ شہادت پانچ گھنٹہ جاری رہی عجیب وغریب انکشاف ہوئے۔ افسوس کہ حکومت نے سنسر عائد کررکھا ہے اور اشاعت روک دی ہے۔

۲۷ رجولائی :۔ ایڈیٹر چٹان کو رہا کردیا گیا۔ حکومت نے چٹان اور پریس کی ضبطی کے احکام بھی واپس لے لیے۔ صمدانی ٹریبونل میں مزید پانچ گواہوں کے بیانات قلمبند کیے گئے۔

شورش کاشمیری بدستور بیمار ہے۔ ذیابیطس نے کئی عوارض پیدا کردیے ہیں۔ اٹھنے، بیٹھنے، پھرنے کی طاقت مفقود ہوچکی ہے۔ اقربا، ڈاکٹروں کے مشورے سے گھر لے جارہے ہیں۔ وزن اتنا ٹوٹ چکا ہے کہ جسم نصف معلوم معلوم ہوتا ہے۔

۲۹ رجولائی :۔ مسٹر حنیف رامے وزیر اعلیٰ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ قادیانیوں کا مسئلہ مسلمانوں کی خواہش کے مطابق ہمیشہ کے لیے حل کردیا جائے گا۔ قادیانی مقاطعہ اپنے عروج پر ہے۔ ربوہ کی ناکہ بندی ہوچکی ہے مسلمان کسی قادیانی کے ہاتھ کوئی چیز فروخت نہیں کرتے اور نہ ان سے کوئی چیز لیتے ہیں۔

۳۱ رجولائی :۔ وزیر اعظم بھٹو نے مستونگ (بلوچستان) میں اعلان کیا کہ قادیانی مسئلہ کے فیصلہ کی تاریخ کا اعلان کل کردیا جائے گا۔ اور قومی اسمبلی کا فیصلہ قطعی ہوگا۔ وزیر اعظم نے بلوچستان کے دورہ میں محسوس کیا کہ عوام قادیانیت کے متعلق کس قدر نازک جذبات رکھتے اور اس مسئلہ کا فوری حل چاہتے ہیں۔ ۳ جولائی

کو صمدانی ٹریبونل نے اپنی تحقیقات مکمل کر لی۔ فاضل جج نے ایک ماہ اور ۲۵ دن کام کیا اور سانحہ ربوہ اور اس کے متعلقات کے بارے میں تمام معلومات حاصل کیں۔ اب رپورٹ کا انتظار ہے۔ تحریک پنجاب میں شدت سے جاری ہے۔ حکومت اکثر جگہ غلامانِ ختم نبوت کو گرفتار کر رہی ہے۔

یکم اگست — جسٹس صمدانی کی عدالت میں شورش کاشمیری نے ۲۵ جولائی کو بیان دیا تھا۔ فاضل ٹریبونل نے ۳۱ جولائی کو اُس کے بعض اجزاء پریس کے حوالے کر دیے۔ شورش کاشمیری نے عدالت کو مرزائی وکلاء کے مہیا کردہ سوالات کے جوابات میں کہا جماعت احمدیہ کے سربراہ میرزا ناصر احمد کی صدارت میں بعض سرکردہ قادیانیوں نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے قتل کا فیصلہ کیا تھا۔ مسٹر ایم۔ ایم۔ احمد کے ایک رشتہ دار کے گھر سے وائرلیس ٹرانسمیٹر برآمد ہوا تھا۔ شورش کاشمیری نے کہا کہ مسٹر بھٹو کے قتل کی سازش خود حکومت کے علم میں ہے۔ ایئر مارشل ظفر چوہدری نے اپنی سبکدوشی کے بعد مسٹر بھٹو کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کا فیصلہ کیا۔ ربوہ کا واقعہ آزمائشی طور پر کیا گیا۔ قادیانی جاننا چاہتے تھے کہ حکومت کا رد عمل اور عوام کا رد عمل کیا ہوتا ہے۔ فاضل جج نے شورش کاشمیری سے سوال کیا کہ روسی سفارت خانے کے کسی افسر کے ساتھ اُن کی ملاقات ہوئی تھی؟ شورش کاشمیری نے کہا — بالکل نہیں۔ شورش کاشمیری کو بعض وکلاء نے بتایا کہ میرزا ناصر احمد نے روسی سفارت خانے کے ایک افسر سے شورش کاشمیری کی ملاقات کا افسانہ وضع کر کے عدالت کو تاثر دینا چاہا کہ اُن کے خلاف صوبہ بھر میں جو تحریک چل رہی ہے وہ صوبے کے نظم و نسق کو درہم برہم کرنے کی ایک سازش ہے۔ اس کی غایت مسٹر بھٹو کی حکومت کو ختم کرنا ہے۔ شورش کاشمیری نے اس کی پُرزور تردید کی اور فاضل جج سے کہا کہ وہ حکومت سے انٹیلی جنس بیورو سے اس بارے میں حتمی معلومات حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ اس قسم کے واقعات اس کی احتسابی نگاہ میں ہوتے ہیں۔ شورش کاشمیری نے نہایت وثوق سے کہا کہ قادیانی مسٹر بھٹو کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کر چکے تھے۔ اوکاڑہ میں مجلس ختم نبوت کے ایک سو ارکان گرفتار کیے گئے۔ پولیس کے تشدد کے خلاف اوکاڑہ کے شہریوں نے مسلسل چار روزہ ہڑتال کی۔ تمام ساہیوال میں احتجاجی جلسے ہو رہے ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے ایک بیان میں کہا کہ قادیانی مسئلہ حل کرنے میں تاخیر ہوئی تو اپوزیشن قومی اسمبلی کا بائیکاٹ کر دے گی۔ مسٹر بھٹو نے خاران میں بیان دیا ہے کہ وہ جمعہ کے روز کوئٹہ میں پریس کانفرنس کے دوران قادیانی مسئلے کے سلسلے میں روشنی ڈالیں گے۔ مسٹر حنیف رامے کوئٹہ پہنچے تو پریس کے نمائندوں نے اُن سے مختلف سوال کیے۔ انہوں نے کہا کہ ختم نبوت کا مسئلہ عالم اسلام کا مسئلہ ہے۔ بلوچستان میں قادیانی مسئلے کو جو وجد کی خصوصیت حاصل ہو

تی ہے۔ اس مسئلے کے حل کی تاریخ متعین کرنے کے لیے اعلیٰ سطح کی کانفرنس منعقدہ کوئٹہ میں غور و خوض کیا گیا۔ ایک
مصدقہ اطلاع کے مطابق تمام صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور گورنر مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے پر رضامند ہے
رہے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ہر صوبے کے حالات اس مسئلہ میں یکساں ہیں۔ اوکاڑہ میں سیکیورٹی فورسز کی فائرنگ سے
چار آدمی زخمی ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ میں نمازیوں پر تشدد کیا گیا۔ اس سلسلے میں ہائی کورٹ میں رٹ داخل کی گئی —
حکومت نے ۲۳ جولائی کو سنسر شپ کی میعاد مزید ایک ماہ کے لیے بڑھا دی، جس کی وجہ سے اخبارات میں
تحریک کی خبریں نہیں آ رہی ہیں، لیکن تحریک سارے ملک میں پھیل چکی ہے۔

۵ اگست: لاہور میں دفعہ ۱۴۴ کے باعث باغات میں جلسے نہیں ہو سکتے، البتہ مختلف
مساجد میں دھرنا اور جلسے ہو رہے ہیں۔ ہر روز تین چار جلسے منعقد کیے جاتے۔ مسٹر بھٹو نے کوئٹہ میں اعلان
کیا ہے کہ قادیانی مسئلہ ۷ ستمبر تک حل کر دیا جائے گا۔

۶ اگست: قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی نے مرزا ناصر احمد سے مزید معلومات حاصل کیں۔ اجلاس
تین گھنٹے جاری رہا۔ راولپنڈی میں مختلف مساجد تحریک کا مرکز ہیں۔ اسلام آباد کی جامع مسجد میں ہر روز قادیانی
مسئلے پر تقاریر ہوتی ہیں۔

۷ اگست: اوکاڑہ کے حالات مزید خراب ہو گئے ہیں۔ پولیس نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے
سلسلے میں بہت سے لوگوں کو گرفتار کیا۔ اکثر مقامات پر علماء اور طلباء کو دھرنا دھر پکڑا جا رہا ہے۔ مولانا غلام علی
اوکاڑوی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ جماعت اسلامی کی مجلس عاملہ نے سنسر ختم کرنے، گرفتار شدگان کو رہا کرنے
اور قادیانی مسئلہ مستقل طور پر حل کرنے کی قرارداد پاس کی ہے۔ قومی اسمبلی کے دو اجلاسوں میں مرزا ناصر احمد
پر سات گھنٹے جرح کی گئی۔

۱۲ اگست: ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور نے دو ماہ کے لیے جلسے، جلوس اور ایسی تقریریں ممنوع کر
دی ہیں، جو قادیانی مسئلے سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن مجلس عمل کے ارکان اپنی تحریک کے سلسلے میں بدستور
متحرک ہیں اور شہر کی دیواروں پر قادیانیت کے خلاف مختلف نعرے کندہ ہیں۔

۱۵ اگست: مفتی محمود نے ایک بیان میں کہا کہ پولیس کا تشدد جاری رہا تو اپوزیشن خصوصی کمیٹی کا
بائیکاٹ کر دے گی۔ مجلس عمل نے اسیر علماء، اسیر طلباء اور اسیر کارکنوں کی رہائی کا پُرزور الفاظ میں مطالبہ کیا ہے۔
پنڈی میں میانوالی سے رہا ہو کر آنے والے طلباء کے استقبالیوں پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ بے تحاشا گرفتاریں

پھوٹی۔ کئی افراد زخمی ہو گئے۔ ہجوم نے پولیس پر پتھراؤ کیا۔ پنجاب یونیورسٹی میں سٹوڈنٹس یونین کے صدر فرید احمد پراچہ نے طلباء سے پرجوش خطاب کیا اور اعلان کیا کہ طلباء تحریک کو کامیاب کر کے دم لیں گے۔

۱۷/ اگست: صمدانی ٹریبونل نے اپنی رپورٹ وزیر اعلیٰ کو پیش کر دی۔ صوبائی حکومت اپنی سفارشات کے ساتھ وفاقی حکومت کو بھیج دے گی۔ رپورٹ ٹائپ شدہ ایک سو بارہ صفحات اور چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔

۲۵/ اگست: میرزا ناصر احمد پر قومی اسمبلی میں گیارہ روزہ جرح مکمل ہو گئی۔ ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ عوام کو مرزا صاحب کا بیان معلوم ہو جائے، تو مرزا صاحب پاکستان میں نہیں رہ سکتے۔ بہرحال میرزائیوں کا خارج از اسلام ہونا یقینی ہو چکا ہے۔ مفتی محمود نے گجرات میں مجلس ختم نبوت کے زیر اہتمام ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم قادیانی مسئلہ کے بارے میں قومی اسمبلی کی کارروائی سے مطمئن ہیں۔ قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی نے انجمن احمدیہ اشاعت اسلام کے سربراہ پر سات گھنٹے تک جرح کی۔

۳۱/ اگست: مولانا محمد یوسف بنوری صدر مجلس عمل نے ملتان سے ایک بیان میں کہا ہے کہ ختم نبوت کے مسئلے سے کسی سیاسی جماعت کو فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ ایک دینی مسئلہ ہے اور پوری ملت اسلامیہ اس میں شریک ہے۔

۲/ ستمبر: مولانا ابوالاعلیٰ امریکہ سے واپس آ گئے اور تحریک کے پہلے جلسے کو خطاب کیا۔ یہ جلسہ شاہی مسجد لاہور میں منعقد ہوا۔ حاضرین ڈیڑھ دو لاکھ کے لگ بھگ تھے۔ حضرت مفتی محمود اور مولانا مودودی کی تقاریر پر ان کے ہزار ہا عقیدت مندوں نے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک، مولانا عبدالستار نیازی، سید مصطفیٰ الازہری، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا محمود احمد رضوی، علامہ احسان الٰہی ظہیر، سید مظفر علی شمسی، اور سید ابوذر بخاری نے فقید المثال اجتماع سے خطاب کیا۔ تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں گرفتار شدگان کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ صمدانی ٹریبونل کی رپورٹ شائع کرنے پر زور دیا گیا۔ تمام مقرروں نے اعلان کیا اور عوام نے نعرۂ تکبیر سے تائید کی کہ ۷/ ستمبر کا فیصلہ عوامی خواہشات کے مطابق نہ ہوا، تو تحریک چلائی جائے گی۔ مسلمان ناموس رسالت کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہیں۔ ختم نبوت کی حفاظت ان کا جزو ایمان ہے۔ ۷/ ستمبر کا دن حکومت کے علاوہ عوام کے منتخب نمائندوں کی آزمائش کا دن ہے۔ اس جلسے سے حکومت پر ثابت ہو گیا کہ وہ مسئلہ ختم نبوت کے بارے میں نہ تو گومگو کی پالیسی اختیار کر سکتی ہے اور نہ مسلمان کسی مداہنت یا مصلحت کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ واضح رہے کہ تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں وسط جولائی کو کھاریاں

کے ایک گاؤں میں دو نوجوان غلام نبی اور محمد یوسف پولیس کی فائرنگ سے شہید ہو گئے تھے۔ اس کا الزام محمد شریف چیمہ سپرنٹنڈنٹ پولیس پر عائد کیا گیا۔ اس کو بدل کر ساہیوال میں سپرنٹنڈنٹ لگا دیا گیا۔ آجکل ایک تحقیقاتی ٹریبونل اس کی تحقیقات پر مامور ہے لیکن عوام اس کو محض اشک شوئی سمجھتے ہیں۔ اس واقعہ سے سخت نفرت پھیل رہی ہے۔ نہ جانے اس ناگوار فعل سے چشم پوشی کا سبب کیا ہے؟

۷ر ستمبر :- ختم نبوت کے مسئلے پر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے صوبہ بھر میں طلباء نے ۷ر ستمبر کو علامتی ہڑتال کی۔ ۷ر ستمبر کا مبارک دن آ گیا۔ قادیانیوں کو قومی پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔ اس بے نظیر فتح پر تمام ملک میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے ہر شہر میں مٹھائی بانٹی، ہر کہیں مسلمانوں نے اپنے مکانوں پر چراغاں کیا۔

اس نزاعی مسئلے کو حل کرنے کے لیے قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی نے دو ماہ میں ۲۸ اجلاس کیے اور ۹۶ گھنٹے کی نشستیں جاری رہیں۔ مولانا مفتی محمود، مولانا شاہ احمد نورانی، پروفیسر غفور احمد، چودھری ظہور الٰہی، مسٹر مولا بخش سومرو اور ان کے رفقاء نے صبح و شام کی مساعی سے وہ تمام لٹریچر جمع کیا جو خصوصی کمیٹی کے لیے ضروری تھا۔ ان رہنماؤں کے سرکاری کمرے مجلس عمل کا سب آفس بنے رہے۔ مولانا محمد شریف جالندھری کی زیر نگرانی اسلام آباد میں ماہرین قادیانیت کا عملہ شب و روز کام کرتا رہا۔ وہ تمام لٹریچر جو اس عرصہ میں مرزائیت کے متعلق شائع ہوا، قومی اسمبلی کے ارکان میں تقسیم کیا گیا۔ مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے سے متعلق یادداشت تیار کی گئی، جس میں مرزائیت کی پوری تاریخ کے علاوہ، اس کے عقائد و اعمال کا پورا پورا نقشہ تھا۔ تمام ارکان اسمبلی کو راقم کے دونوں کتابچے "عجمی اسرائیل" اور "غدار اسلام" پہنچا دیے گئے! حتیٰ کہ ملک کے ہر سفارت خانے کو ان کے انگریزی اور عربی ایڈیشن مہیا کیے گئے۔ راقم نے اس دوران میں اپنی شدید علالت کے باوجود ایک ایسا خط تیار کیا جو قادیانیت کے متعلق ایک تاریخی دستاویز تھا۔ دنیا کی ہر حکومت کے سربراہ، وزیر خارجہ، پاکستان میں ان کے سفارت خانوں اور تمام ممالک کے نامور جرائد کو وہ خط بھیجا گیا۔ اس خط میں قادیانیت کی تاریخ کے علاوہ اس امر کی وضاحت کی گئی کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مسئلہ ہماری دینی وحدت، سیاسی استحکام اور ہماری قومی سالمیت کی بقا کا مسئلہ ہے۔ ہم ان کو اس لیے بھی علیحدہ اقلیت کے طور پر مشخص کرنا چاہتے ہیں کہ ان سے ہماری قوم اور ہمارے ملک کو شدید خطرات ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ استعمار و اسرائیل کے نفس ناطقہ ہیں۔ مسٹر ظفر اللہ خان کے ان بیانات پر جو انہوں نے لندن میں انگریزی پریس کو دیے اور جن کے

کاپیاں دفتر چٹان کو دوستوں نے بھیجیں۔ راقم نے لندن ٹائمز اور گارڈین کے ایڈیٹروں کو خط لکھے۔ ان سے کہا کہ مسٹر ظفر اللہ خاں نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ قادیانی محاسبہ کمیٹی کے خرچ پر اپنے نمائندے پاکستان بھیجیں جو خود صورت حال کا مشاہدہ و مطالعہ کریں۔ ان ایڈیٹروں نے لکھا کہ یہ مسئلہ پاکستان کا داخلی مسئلہ ہے۔ ہم اس میں جانبدار نہیں اور نہ ہمیں ظفر اللہ خاں کے اسلوبِ فکر سے کوئی دلچسپی ہے۔

قومی اسمبلی نے مرزا ناصر احمد پر ۱۱ دن تک ۴۲ گھنٹے اور مرزا غلام احمد کی لاہوری شاخ کے امیر پر سات گھنٹے جرح کی۔ اس دوران میں وزیراعظم اور وزیر قانون سے اپوزیشن کے متذکرہ راہنماؤں نے کئی ملاقاتوں میں مذاکرات کئے اور چار پانچ دفعہ نازک موڑ بھی آئے۔ آخری رات تصادم کا اندیشہ لاحق ہو گیا اور مجلس عمل کے راہنما سر بکف ہو کر قید و بند کے لیے تیار ہو گئے، لیکن فضلِ ایزدی سے اتفاق رائے ہو گیا اور وزیراعظم نے الفاظ کا حک و فک چھوڑ کر مجلس عمل کے پارلیمانی نمائندوں کی تجویز پر صاد کیا۔ چنانچہ ۷ ستمبر کو ۴ بجکر ۳۵ منٹ پر قادیانیوں کی دونوں شاخوں کو اقلیت قرار دے کر دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا گیا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے قائد ایوان کی حیثیت سے ۱۴ منٹ تک وضاحتی تقریر کی۔ مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ وزیر قانون نے اس سلسلہ میں آئینی ترمیم کا تاریخی بل پیش کیا اور جب بل متفقہ رائے سے پاس ہو گیا، تو حزب اقتدار و حزب اختلاف کے ارکان آپس میں فرطِ مسرت سے بغلگیر ہوئے۔ ان کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔ اٹھ اٹھ کر وزیراعظم بھٹو اور ولی خاں گرمجوشی سے ملے۔ اس کے بعد سینٹ نے بھی پونے آٹھ بجے اجلاس شروع کر کے آٹھ بجکر ۴ منٹ پر صاد کیا۔ تمام ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ فرطِ مسرت سے دیوانہ ہو گئے۔ شیرینی تقسیم کی گئی اور جگہ جگہ آتشبازی چھوڑی گئی۔

وزیراعظم بھٹو نے اپنی تقریر میں کہا کہ منکرین ختم نبوت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ پوری قوم کی خواہشات کا آئینہ دار ہے۔ اس مسئلہ کو دبانے کے لیے ۱۹۵۳ء میں غلط طور پر طاقت استعمال کی گئی تھی۔

اس سلسلہ میں مجلس عمل کے پارلیمانی راہنماؤں نے ذیل کا خط اپنے دستخطوں سے سپیکر کو لکھا:

جناب سپیکر صاحب، قومی اسمبلی پاکستان۔

جناب محترم،

ہم درج ذیل تحریک پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں:

ہرگاہ کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔

اور یہ کہ جھوٹ پر مبنی اُس کا دعویٰ نبوت قرآن کریم کی بیشمار آیات کو (نعوذ باللہ) جھوٹا ثابت کرنے کی کوششیں اور ترکِ جہاد کی تلقین، اسلام کے اہم اور بنیادی ارکان سے اُس کی مکمل غداری کے مترادف ہیں۔

اور یہ کہ وہ مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کرنے اور اسلام کو ایک جھوٹا مذہب ثابت کرنے کی غرض سے وہ سراسر استعمار کی تخلیق تھا۔

اور یہ کہ تمام امتِ مسلمہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار خواہ اس کی نبوت پر ایمان رکھتے ہوں یا اسے کسی بھی شکل میں ایک مصلح یا مذہبی رہنما مانتے ہوں دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

اور یہ کہ اُس کے پیروکار، خواہ کسی بھی نام سے موسوم ہوں اپنے آپ کو مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ظاہر کرتے ہوئے اُن میں رہ کر، اندرونی اور بیرونی طور پر تخریبی سرگرمیوں میں مصروفِ عمل ہیں۔

اور یہ کہ مکہ مکرمہ کے مقدس شہر میں ۶ سے ۱۰ اپریل تک رابطہ عالم اسلامی کے تحت منعقدہ دنیائے اسلام کی مختلف تنظیموں کے اجلاس نے (جس میں دنیا کے ہر حصہ سے ۱۴۰ مسلمان تنظیموں اور اداروں نے شرکت کی) متفقہ طور پر تسلیم کیا کہ قادیانیت، اسلام اور دنیائے اسلام کے خلاف ایک تخریبی تحریک ہے، جو کذب بیانی اور فریب دہی سے اپنے آپ کو اسلام ہی کا ایک فرقہ ظاہر کرتی ہے۔

لہٰذا یہ اسمبلی اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار خواہ وہ کوئی سا نام بھی رکھتے ہوں مسلمان نہیں اور یہ کہ نیشنل اسمبلی میں سرکاری طور پر ایک بل پیش کیا جائے جس سے آئین میں مناسب ترمیم ہو۔ انہیں اس ترمیم کی رو سے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بطور غیر مسلم اقلیت اپنے حقوق و مفادات کا تحفظ حاصل ہو۔

دستخط کنندگان

(۱) مولانا مفتی محمود — (۲) مولانا عبدالمصطفیٰ الازہری

(۳) مولانا شاہ احمد نورانی — (۴) پروفیسر غفور احمد

(۵) مولانا سید محمد علی رضوی — (۶) مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک

(۷) چودھری ظہور الٰہی — (۸) سردار شیر باز خان مزاری

(۹) مولانا ظفر احمد انصاری — (۱۰) مسٹر عبدالحمید جتوئی

(۱۱) صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری — (۱۲) مسٹر محمود اعظم فاروقی

(۱۳) مولانا صدر الشہید — (۱۴) مولانا نعمت اللہ

(۱۵) مسٹر عمرا خان — (۱۶) مخدوم نور محمد

(۱۷) مسٹر غلام فاروق — (۱۸) مسٹر مولا بخش سومرو

(۱۹) سردار شوکت حیات خان — (۲۰) مسٹر علی احمد تالپور

(۲۱) راؤ خورشید علی خان — (۲۲) رئیس عطا محمد مری

مندرجہ بالا تحریک کی بنیادوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اختتام پر تقسیم کی مختلف مراحل طے کرنے کے بعد عبدالحفیظ پیرزادہ وزیر قانون نے اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کے کل ایوان پر مشتمل خصوصی کمیٹی متفقہ طور پر طے کرتی ہے کہ حسب ذیل سفارشات قومی اسمبلی کو غور اور منظوری کے لیے بھیجی جائیں[1]۔

کل ایوان پر مشتمل خصوصی کمیٹی اپنی رہنما کمیٹی اور ذیلی کمیٹی کی طرف سے اس کے سامنے پیش یا قومی اسمبلی کی طرف سے اس کو بھیجی گئی قراردادوں پر غور کرنے اور دستاویزات کا مطالعہ کرنے اور گواہوں بشمول سربراہان انجمن احمدیہ ربوہ اور انجمن احمدیہ اشاعت اسلام لاہور کی شہادتوں اور جرح پر غور کرنے کے بعد متفقہ طور پر قومی اسمبلی کو حسب ذیل سفارشات پیش کرتی ہے۔

(الف) کہ پاکستان کے آئین میں حسب ذیل ترمیم کی جائے۔

(اول) دفعہ ۱۰۶ (۳) میں قادیانی جماعت اور لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں) کا ذکر کیا جائے۔

(دوم) دفعہ ۲۶۰ میں ایک نئی شق کے ذریعے غیر مسلم کی تعریف کی جائے — مذکورہ بالا سفارشات کے نفاذ کے لیے خصوصی کمیٹی کی طرف سے متفقہ طور پر منظور شدہ مسودہ قانون منسلک ہے۔

(ب) کہ مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۵ الف میں حسب ذیل تشریح درج کی جائے۔

تشریح:۔ کوئی مسلمان جو آئین کی دفعہ ۲۶۰ کی شق (۳) کی تصریحات کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے تصور کے خلاف عقیدہ رکھے یا عمل یا تبلیغ کرے وہ دفعہ ہذا کے تحت مستوجب سزا ہوگا۔

(ج) کہ متعلقہ قوانین مثلاً قومی رجسٹریشن ایکٹ ۱۹۷۳ء اور انتخابی فہرستوں کے قواعد ۱۹۷۴ء میں منتخبہ قانونی اور ضابطہ کی ترمیمات کی جائیں۔

---

[1] یہ سرکاری متن کا سرکاری ترجمہ ہے۔

(د) کہ پاکستان کے تمام شہریوں خواہ وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں، کے جان و مال، آزادی، عزت اور بنیادی حقوق کا پوری طرح تحفظ اور دفاع کیا جائے گا ——————

اور ان سفارشات کی اساس پر ذیل کا بل پیش ہوا

ہرگاہ یہ قرین مصلحت ہے کہ بعد ازیں درج اغراض کے لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں مزید ترمیم کی جائے۔

لہٰذا بذریعہ ہٰذا حسب ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے۔

۱۔ مختصر عنوان اور آغاز نفاذ۔ (۱) یہ ایکٹ آئین (ترمیم دوم) ایکٹ ۱۹۷۴ء کہلائے گا۔

(۲) یہ فی الفور نافذ العمل ہوگا۔

۲۔ آئین کی دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں جسے بعد ازیں آئین کہا جائے گا۔ دفعہ ۱۰۶ کی شق (۳) میں لفظ فرقوں کے بعد الفاظ اور قوسین "اور قادیانی جماعت یا لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں)" درج کیے جائیں گے۔

۳۔ آئین کی دفعہ ۲۶۰ میں ترمیم۔ آئین کی دفعہ ۲۶۰ میں شق (۲) کے بعد حسب ذیل نئی شق درج کی جائے گی یعنی:

"(۳) جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جو آخری نبی ہیں، کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی بھی مفہوم میں یا کسی بھی قسم کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے، وہ آئین یا قانون کی اغراض کے لیے مسلمان نہیں ہے۔"

بیان اغراض و وجوہ

جیسا کہ تمام ایوان کی خصوصی کمیٹی کی سفارش کے مطابق قومی اسمبلی میں طے پایا ہے اس بل کا مقصد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں اس طرح ترمیم کرنا ہے تاکہ ہر وہ شخص جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے اسے غیر مسلم قرار دیا جائے۔

عبدالحفیظ پیرزادہ
وزیر انچارج

اس بل کی متفقہ منظوری کے بعد نوّے سال کا ایک قضیہ ختم ہو گیا۔ مسلمانوں کی طویل جدوجہد بفضل تعالیٰ کامیاب ہوئی۔ مرزا غلام احمد کی پیروی اُمت ایک نامسلمان اقلیت کے طور پر مشخص ہو گئی اور عرب و عجم میں رسالت ؐ کا تقدس اس مسلک سے محفوظ ہو گیا جو اس کے سیاسی بدن کا استعماری ناسور تھا۔

مجلس عمل میں ہر دینی اور سیاسی جماعت کے نمائندے شامل تھے۔ مولانا محمد یوسف بنوری صدر منتخب کیے گئے اور آخر تک اپنے عالمانہ تدبر سے تحریک کی رہنمائی کی۔ آپ کے علاوہ مجلس تحفظ ختم نبوت کی طرف سے مولانا عثمان محمود، مولانا محمد شریف جالندھری، مولانا تاج محمود اور سردار میر عالم لغاری مجلس عمل میں شامل تھے ــــــ جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے مولانا مفتی محمود ایم۔ این۔ اے، مولانا عبدالحق ایم۔ این۔ اے، مولانا محمد زمان اچکزئی، سینیٹر بلوچستان، مولانا عبیداللہ انور، مولانا محمد اجمل خاں اور مولانا محمد ابراہیم شریک ہوتے۔ جمعیۃ العلمائے پاکستان کی نمائندگی مولانا شاہ احمد نورانی ایم۔ این۔ اے، مولانا محمد علی رضوی، ایم۔ این۔ اے، مولانا عبدالمصطفیٰ الازہری ایم۔ این۔ اے، مولانا عبدالستار نیازی ایم۔ اے۔ مولانا صاحبزادہ فضل رسول (رائل پور)، مولانا غلام علی اوکاڑوی اور علامہ محمود احمد رضوی (لاہور) نے کی۔ علامہ محمود احمد رضوی مجلس عمل کے جنرل سیکرٹری رہے۔ اپنے فرائض حسن و خوبی سے سرانجام دیے۔ آپ نے سوا تین ماہ تک پنجاب میں صبح و شام مختلف جلسوں کو خطاب کیا اور تحریک کی حرارت کو قائم رکھا۔ جماعت اسلامی کی طرف سے پروفیسر غفور احمد ایم۔ این۔ اے، میاں طفیل محمد اور چودھری غلام جیلانی نے حصہ لیا۔ مجلس عمل کی اکثر قرار دادیں باہمی افہام و تفہیم کے بعد پروفیسر غفور احمد کے قلم سے مرتب ہوتی تھیں۔ علمائے کرام میں شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خاں، مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری اور مفتی زین العابدین پیش پیش رہے۔ مولانا غلام اللہ راولپنڈی ڈویژن میں تحریک کی روح رواں تھے۔ انہیں اس جرم میں کئی دفعہ گرفتار کیا گیا۔ مولانا سید عنایت شاہ بخاری گجرات میں معرکہ آرا رہے۔ ان کے علاوہ جمعیۃ العلمائے پاکستان کے رہنما سید محمود شاہ گجراتی کو اعلائے کلمۃ الحق کی پاداش میں نظر بند کیا گیا۔ مفتی زین العابدین نے لائلپور میں تحریک کا شباب قائم رکھا۔ جماعت اہل حدیث کی طرف سے میاں فضل حق، مولانا عبداللہ روپڑی، علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا محمد صدیق، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا محمد اسحاق چیمہ، شیخ اشرف نے نمائندگی کی۔ اتحاد اسلامی کی طرف سے مولانا محمد احمد مظاہری اور مفتی سیاح الدین کاکاخیل شریک ہوئے۔ شیعوں کی نمائندگی کا فریضہ سید مظفر علی شمسی نے ادا کیا۔ جمہوری پارٹی کی طرف سے نوابزادہ نصراللہ خاں، رانا ظفر اللہ خاں اور میاں غلام دستگیر بار ایٹ لا نے شرکت کی۔ چوہدری ظہور الٰہی ایم۔ این۔ اے، میجر اعجاز احمد (لاہور) اور سید اصغر علی شاہ (راولپنڈی) نے

مسلم لیگ کی نمائندگی کی۔ مجلس احرار کی ترجمانی سید ابوذر بخاری، سید عطاء المحسن اور چودھری ثناء اللہ بھٹہ نے کی۔ شورش کاشمیری قادیانی محاسبہ کمیٹی کی طرف سے شامل رہے۔ ان سب بزرگوں اور عزیزوں نے کراچی سے پشاور تک بالعموم اور پنجاب کے طول و عرض میں بالخصوص تحریک کو آتش فشاں اور غیر متزلزل کر دیا۔ ان کے علاوہ ہر مسجد کے پیش امام نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ مسلمان طلبہ کی مختلف تنظیموں نے اس سلسلہ میں رعونت و عزیمت کا ریکارڈ قائم کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین نے تمام پہلے عہدیداروں کی سیاست میں صوبہ کے نوجوانوں کو گرمائے رکھا۔ مولانا یوسف بنوری اور مولانا شریف جالندھری نے مجلس تحفظ ختم نبوت کے محفوظ فنڈ میں سے تحریک پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ کیا۔ نوابزادہ نصر اللہ خان، مولانا غلام اللہ خان، علامہ محمود رضوی، سید مظفر علی شمسی، مولانا تاج محمود، علامہ احسان الٰہی ظہیر، شورش کاشمیری، علامہ عزیز انصاری، چودھری ثناء اللہ بھٹہ اور سید ابوذر بخاری نے ایک ایک دن اور ایک ایک شب میں کئی کئی جلسوں کو خطاب کیا۔ شورش کاشمیری قید ہو گئے اور وہاں کے بعد طویل علالت کا باعث بنے۔ اسی سلسلہ میں علامہ احسان الٰہی ظہیر، سید مظفر علی شمسی، علامہ محمود رضوی، مولانا محمد اجمل نے اپنے اوپر خواب و خور حرام کیے رکھا اور تحریک کا پہیہ ایک دم بھی رکنے نہ دیا۔ اُدھر ملک کے روزناموں میں نوائے وقت واحد اخبار تھا جس نے قادیانی مسئلہ میں مسلمانوں کا ہم آواز ہو کر سرمایہ کائنات کی خوشنودی کو مقدم رکھا اور قرنِ اول کی اس جرأت مندی کا ثبوت بہم پہنچایا، جو غلامانِ رسالت کا طغرائے امتیاز تھی۔ اس کے ایڈیٹر مجید نظامی اس تحریک میں قلم کی شمشیر تھے۔ یا پھر کراچی کا روزنامہ جسارت اس تحریک پر قربان ہو گیا اور اس کے ایڈیٹر سید صلاح الدین کو قید و بند میں ڈال دیا گیا۔

غرض ۹۰ برس کی تحریک میں یہ پہلا موقع تھا کہ پورا ملک اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ تمام شہروں اور قصبوں کے علاوہ تحریک ہر گاؤں کی چوپال تک پہنچ گئی۔ کوئی گوشہ ایسا نہ رہا، جہاں قادیانیت کے خلاف نعرۂ تکبیر نہ گونجا ہو۔ عوام کے میدانوں اور حکومت کے ایوانوں میں تحریک کے شعلے بھڑکتے رہے، حتیٰ کہ فوج بھی اس سے سرشار ہو گئی۔ ان سب جد و جہد اور مظاہروں ہی کا نتیجہ تھا کہ مسیلمہ کذاب کی اسلامیت ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو پاکستان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی اور اس کا استعماری وجود اپنے انجام و مقام کو پہنچ گیا۔